سیرت
خواجہ معین الدین چشتی
رحمۃ اللہ علیہ
وحید احمد مسعود
ضیاء القرآن
لاہور- کراچی ○ پاکستان

مؤلف

وحید احمد مسعود

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	سیرت حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ
مصنف	وحید احمد مسعود
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	نومبر 2013ء
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	SH24
قیمت	-/225 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

انتساب

بتوسط حضرت گنج شکر مسعود رحمۃ اللہ علیہ

بہ حضور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ

پیر جو باباکے ہیں اور جانشین خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں

اس گزارش کے ساتھ کہ

خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

منجانب

وحید احمد مسعود

گزارش

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مجھے جرأت و ہمت نہ تھی مگر یہ تذکرہ مرتب ہو ہی گیا۔ اس میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ حالات و واقعات، تاریخ اور تصوف کی روشنی میں ظاہر کیے جائیں اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی مقدس زندگی کا نقشہ اس طرح پیش کیا جائے کہ اصل کے مطابق ہو اور باعث ہدایت ہو۔

حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ العزیز کے حالات سب سے پہلے امیر خورد نے ''سیر الاولیا'' میں اور پھر مولانا جمالی دہلوی نے اپنی کتاب ''سر العارفین'' میں جمع کیے ہیں جو ہمایوں بادشاہ کے عہد میں لکھی گئی۔ اس کے بعد کے تذکرے ذرا سے فرق کے ساتھ اسی کی نقل ہیں اور ان میں سے کسی میں تحقیق و تکمیل کا کوئی شائبہ نہیں۔

ان جملہ تذکروں کا ماخذ خواجگان چشت کے ملفوظات ہیں جو خود معتبر نہیں ہیں اور ان کی عظمت محض نسبت کی وجہ سے ہے۔ ان میں حالات و واقعات کا کہیں بے ربط سا ذکر ہے اور یہ مواد اس قابل نہیں جس سے سوانح عمری ترتیب دی جاسکے۔ ان میں جو حکایات و ہدایات ہیں ان سے تعلیم چشتیہ کی کوئی خصوصیت بھی واضح نہیں ہوتی اور نہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عہد میں مخلوق کی کس طرح اصلاح فرمائی یہ جملہ تذکرے عمومی قسم کے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان سب کو یک قلم مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا یہ ملفوظات اگرچہ خواجگان چشت کے نام سے لکھے گئے ہیں۔ لیکن لکھنے والوں نے اپنے مبلغ علم کے مطابق جو کچھ بھی مرتب کیا ہے ان سے کچھ واقفیت بہم پہنچائی جاسکتی ہے اور استخوان چھوڑ کر ان میں سے مغز نکالا جاسکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مقربین، معتقدین اور معاصرین حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم اور عظیم انقلاب پیدا کرنے والی شاندار اور یگانہ روزگار ہستی کی نہ خاطر خواہ سوانح عمری لکھ سکے اور نہ ان کی تعلیم کی وضاحت کرسکے۔ اس کی

تعلیم کو واضح کرنے کے متعلق آج تک کسی تذکرہ نگار کو خیال نہیں آیا۔

حق یہ ہے کہ ایسی لطیف شخصیتیں ظاہری قیود سے بالا ہوا کرتی ہیں۔ اسم درسم کھود دینے والوں کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ابتدائی حالات برطرف۔ حضرت والا کی حیات طیبہ کے کسی حصہ کے بھی حالات مکمل طور پر جمع نہ کئے جاسکے۔ حالانکہ انہوں نے نہایت شان کے ساتھ ہندوستان میں کم از کم چالیس پچاس سال سب کی آنکھوں کے سامنے گزارے اور مذہب و ملت اور حکومت کے آئین کی رہبری خالص طور پر فرمائی۔ ہمیں جو معلومات میسر ہیں وہ نہ معلوم ہونے کے برابر ہیں۔ اور وہ بھی اختلاف واضداد سے بھری ہوئی ہیں۔ اب اگر ان مختلف ومنتشر سوانح کو کوئی مرتب ومربوط کرنا بھی چاہے تو یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حضرت والا کی جامعیت کا کسی طرح بھی اُور چھور نہیں مل سکتا۔

یہ تذکرے جو لکھے گئے ہیں۔ گنتی کے چند حالات چند کرامات اور چند ارشادات پر مشتمل ہیں۔ حالات کی بے ربطی شخصیت پر سے نقاب نہیں الٹ سکتی۔ کرامات توہمات کی حدود میں پہنچ جاتے ہیں۔ تاثیر وتعلیم سے مستغنی نظر آتے ہیں اور صاحب کرامت کی علویت کو ثابت نہیں کرتے۔ البتہ ارشادات میں وزن ہے۔ لیکن ان سے بھی صاف طور پر اصول تعلیم چشتیہ کی خصوصیت کا کوئی نقشہ مرتب نہیں ہوتا اور سب سے زیادہ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ تذکرے کسی واقعہ کی تاریخ وسال بھی بتانے سے معذور ہیں۔ یہ تذکرے گویا از قسم داستان ہیں۔ جس کا نہ کوئی تعین ہے اور نہ جس سے کوئی مفید نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا نواب خادم حسین صاحب زبیری نے اجمیر سے دو تذکرے شائع کئے ہیں۔ ''معین الارواح نظر ثانی شدہ'' اور اس کا خلاصہ ''معین العارفین'' ان کا بیان یہ ہے کہ یہ دونوں محققانہ ترتیب کے ساتھ مفصل ومستند ہیں اور ان دونوں کو درگاہ شریف کے ایڈمنسٹریٹر کی سرپرستی حاصل ہے۔ یہ جدت بھری خوشنما کوشش بیشک جدید ہونے کی وجہ سے لذیذ ہے مگر اس میں وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

مجھے اپنی اس کوشش میں پرانی بنیادوں پر نئی عمارت بنانے میں قیاسات سے کام لینا

پڑا ہے۔ لیکن وہ قیاسات حدود کے اندر ہیں۔ بالفرض ان قیاسات کو اعتبار کا درجہ بھی حاصل ہو تو بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت تک رسائی ہو گئی۔ میں نے اپنے علم کے مطابق کچھ تاریخی مواد بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی حیثیت تنقید سے زیادہ نہیں۔ سفر کے حالات کی طوالت کو میں نے نظر انداز کر کے خلاصہ و مفہوم پیش کیا ہے۔ ابتدائی حالات۔ ''تشریف آوری سے قیام اجمیر تک'' مشہور و معروف ہیں۔ میں نے بجائے سلسلہ وار تفصیل لکھنے کے ان روایات کی تنقید کے ذریعہ وضاحت کی ہے ممکن ہے کہ سلسلہ وار تشریح نہ کرنے کو سقم سمجھا جائے لیکن طوالت کو مناسب نہیں سمجھا۔

اس کے علاوہ حضرت والا کی ہندوستان میں سیاحت و تصنیف خصوصاً دہلی کے سفروں اور ''رسالہ گنج اسرار'' کے متعلق جو اظہار خیال میں نے کیا ہے۔ وہ حرف آخر نہیں ہے بلکہ میری ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ میری اس جرأت پر عقیدت منداصحاب اگر چیں بہ جبیں ہوں تو مجھے اصرار نہیں اور ان کی معقول تردید کو میں تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔

آخر میں حاجی حافظ مولوی عبدالواحد صاحب قادری اور ڈاکٹر سید معین الحق صاحب جنرل سیکرٹری پاکستان ہسٹاریکل کا میں ممنون ہوں کہ جنہوں نے از راہ نوازش پیش لفظ اور دیباچہ لکھ کر میری عزت افزائی فرمائی اور عزیزی محمد ایوب قادری سلمہم اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ جن کی توجہ اور ذاتی دلچسپی سے یہ کتاب طباعت و اشاعت کی منزلوں سے باحسن وجوہ گزر گئی۔ ممکن ہے کہ میری اس کوشش کی اشاعت کے بعد مردے از غیب بروں آید و کارے بکند اور اپنی وسیع معلومات سے حضرت غریب نواز قدس سرہ کا ایسا تذکرہ لکھ سکے جس پر بجا طور پر تذکرہ یا سوانح عمری کا اطلاق ہو اور جس کے مطالعہ سے حضرت والا کے جمال دلفروز و جہاں سوز کی جھلک نظر آ جائے اگر میری یہ امید پوری ہوئی تو میں فخر کے ساتھ کہہ سکوں گا کہ۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

عاصی و خاطی

وحید احمد مسعود

پیش لفظ

ڈاکٹر معین الحق ایم۔اے۔پی۔ایچ ڈائریکٹر آف ریسرچ و جنرل سیکرٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت برصغیر کی تمدنی و ثقافتی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔اہل طریقت کے نزدیک آپ روحانی تربیت اور معرفت کے امام تو ہیں ہی لیکن تہذیب و تمدن کے مؤرخ کی نظر میں بھی آپ اسلامی معاشرہ کے معماران عظیم کی صف میں نظر آتے ہیں۔

ہندو پاکستان میں اسلامی سلطنت مضبوط کرنے والے فاتحین اور حکمران اس طبقہ سے تعلق رکھتے جس کے افراد میں تبلیغ اسلام کی خواہش یا تو قطعاً مفقود تھی یا ملکی فتوحات اور تعمیر سلطنت کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی وہ غیر مسلموں کے خلاف جہاد کرنا ضروری سمجھتے تھے۔لیکن جہاد کی ذمہ داریوں اور اس کی شرائط پر عمل نہ کرتے تھے۔اس میں شک نہیں کہ نظم حکومت کی بنیاد شریعت پر تھی۔لیکن رفتہ رفتہ مطلق العنانی کا عنصر غالب آتا گیا اور حکومت کی پالیسی اور نظم سلطنت کچھ اس نہج پر رہا کہ اسلامی معاشرہ کے سربرآوردہ حضرات بھی رفتہ رفتہ اشاعت و تبلیغ سے دست کش ہوتے چلے گئے۔

بہ الفاظ دیگر یہاں کے حکمرانوں نے مذہبی رواداری کے معنی یہی سمجھے کہ دینی معاملات کو نظم حکومت میں جگہ نہ دی جائے سیاسی رہنماؤں کے اس رویہ نے تبلیغ کی تمام ذمہ داری مذہبی رہنماؤں پر ڈال دی۔اولالذکر طبقہ کی ساری کوششیں فتوحات اور نظم و نسق کو مضبوط بنانے تک محدود ہوگئیں۔مذہبی رہنماؤں کے دو طبقے تھے۔علماء جو شریعت اور ظاہری تعلیم پر زور دیتے تھے۔اور مشائخ و صوفیہ جنہوں نے روحانی تربیت اور ترویج طریقت کی طرف زیادہ توجہ دی۔بعض مصنفین نے ان دونوں طبقوں کو صرف ایک دوسرے سے علیحدہ ہی نہیں

سمجھا ہے بلکہ اکثر مواقع پر ان کو مخالف اصولوں کا علمبردار ظاہر کیا ہے۔ اس غلط نظریہ سے بہت زیادہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور تاریخ کے اکثر طلبہ کو اسلامی معاشرہ کی صحیح تصویر پیش کرنے میں بڑی دشواریاں پیدا ہو گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں شریعت اور طریقت دو متضاد راستے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی راستہ کے دو پہلو ہیں۔ اور صحیح وصالح زندگی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے دونوں ہی ضروری ہیں۔ ان مقاصد میں تبلیغ دین بھی شامل ہے (اس طرح یہ ہر دو طبقوں کے افراد بلکہ ان تمام مسلمانوں کی جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اہم ذمہ داریوں میں تھی)۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں بہت کم مذہبی رہنما ایسے تھے جو شریعت وطریقت دونوں کو یکساں اہمیت نہ دیتے ہوں۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ معاشرے کے اس پہلو کی اہمیت کم ہوتی گئی اور علماء ومشائخ میں باہم اختلافات کی خلیج وسیع ہو گئی اور تقسیم کار اس طرح ہو گیا کہ علماء نے ترویج شریعت وظاہری علوم کی خدمت اپنے ذمہ لی اور مشائخ نے طریقت کی تعلیم اور اشاعت دین پر زیادہ زور دیا۔

بعض مصنفین نے تاریخ کا بغور مطالعہ نہیں کیا اور ان کو یہ مغالطہ ہو گیا کہ صوفیہ نے رہبانیت اور تجرید کو اپنا مسلک بنایا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی زندگی میں جمود کی کیفیت پیدا ہو گئی جو بالآخر اسلام کے زوال کا باعث ہوئی یہاں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ لیکن اتنا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مسلمان صوفیہ کے نزدیک ترک دنیا کی بنیاد دوسرے مذاہب کے درویشوں کی طرح رہبانیت پر نہ تھی بلکہ ترک دنیا سے ان کا مطلب یہ تھا کہ جاہ ودولت کے حصول کو مقصد حیات نہ بنایا جائے اور مسلمانوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ دنیا کے معاملات میں ایسے گرفتار ہو جائیں کہ خدا سے بھی غافل ہو جائیں وہ خانقاہ نشین ضرور ہوتے تھے لیکن دنیا ومافیہا سے بالکل بے رخی نہیں برتتے تھے دنیا کی جانب رخ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دو خدمتیں انجام دے سکیں۔ یعنی مسلمانوں کو روحانی اور اخلاقی تربیت دے کر ان کو بلند کردار بنائیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ کی بنیادیں

اخلاقی طور پر مضبوط ہوگئیں دوسرا مقصد یہ تھا کہ اپنے اخلاق اور تعلیم کے ذریعہ غیر مسلموں کو اسلام کی طرف راغب کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں ہی مقصد نہایت اہم تھے اور تاریخ کے صفحات پر دونوں کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ لیکن تاریخ کے عمومی پس منظر میں تبلیغ دین کی کوشش ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ حکمرانوں اور سیاستدانوں نے رواداری کا غلط تخیل قائم کرکے جو رویہ اختیار کیا۔ اس سے اسلام کے قیام اور ترقی میں کوئی خاص مدد نہ ملی اور اگر صوفیہ اور مشائخ تبلیغ کو اپنا خاص مشن نہ بنا لیتے تو مسلمان آبادی کا تناسب اس سے بہت کم ہوتا جو آج موجود ہے۔ صوفیہ نے تبلیغی اور اصلاحی فرائض کی انجام دہی کے لئے باقاعدہ کوششیں کیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے سلسلے برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچ کر اپنا کام کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ان کارناموں کی زیادہ تشہیر نہ کی جائے۔ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے کہ جس چیز یا تحریک کی تشہیر کی جاتی ہے۔ اس کی مخالفت بھی شروع ہو جاتی ہے۔ انہی اصولوں کی بنا پر صوفیہ نے مناسب سمجھا کہ خاموشی کے ساتھ یہ خدمت انجام دی جائے اور اس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے عیسائی مبلغین کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ تقریباً ساڑھے چار سو برس سے یہ لوگ عیسائیت کی ترویج کی بڑے پیمانہ پر کوشش کر رہے ہیں اور اس کے لئے ہر قسم کے ذرائع سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان میں حکومت کا اثر، وسیع پیمانہ پر روپیہ خرچ کرنا، تعلیم کی اشاعت اور طاقت کا استعمال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں ان کو عشر عشیر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کا حسن اخلاق، ایثار، نفس کشی اور خاموشی کے ساتھ کام کرنا دوسرے مبلغین مذہب کی کوششوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مفید اور مؤثر ثابت ہوا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں بھی یہ اشارے ملتے ہیں اور اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں اسلام کی گرانقدر خدمات انجام

دی ہیں۔

خواجہ صاحب کے حالات میں اکثر تذکرہ نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ آپ کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں ہدایت فرمائی تھی کہ ہندو پاکستان میں جا کر قیام کریں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم صرف ایک ہی مقصد رکھتا تھا کہ تبلیغ اسلام وہاں کی جائے ورنہ عبادت اور مسلمانوں کی روحانی تربیت کے لئے کوئی مقام بھی اور خود خواجہ صاحب کا وطن بھی مناسب ہو سکتا تھا۔ ہمارے اس بیان کی تائید سیر الاولیاء کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

"وکرامت دیگران کہ مملکت ہندوستان تا جد بر آمدن آفتاب بہ ہمہ دیار کفر و کافری و بت پرستی و متمردان ہند ہر یکے دعویٰ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (نازعات) می کردند خدائے را جل و علیٰ شریک می گفتند و سنگ و کلوخ و دار و درخت دستور و گاد و سرگیں ایشان را سجدہ می کردند بہ ظلمت کفر قفل دل ایشان مظلم و محکم بود...... بوصول قدم مبارک آن آفتاب اہل یقین کہ بحقیقت معین الدین بود ظلمت ایں دیار بنور اسلام روشن و منور گشت (1)۔

آپ کا یہ کارنامہ اس قدر روشن اور معروف تھا کہ ابوالفضل کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے "از دم کبرائے او گروہا مردم بہرہ برگرفتند" لیکن سب سے زیادہ صاف الفاظ میں خواجہ صاحب کے تبلیغی کارناموں کا ذکر ہم کو تاریخ فرشتہ میں ملتا ہے شاہ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:

"بسیارے از کفار اجمیر بہ برکت انفاس آں پیر طریقت بشرف ایمان مشرف گشتند و آناں کہ ایمان نیاوردند محبت خواجہ در دل جائے دادہ پیوستہ فتوح بے حد و عد بحضرت روی فرستادند" (2)۔

اس میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کا اس علاقے میں قیام کرنا جہاں صرف

1۔ سیر الاولیاء مصنفہ سید امیر خورد کرمانی مطبوعہ دہلی ص ۴۷۔

2۔ تاریخ فرشتہ (بمبئی ایڈیشن) جلد دوم ۱۹۰ [illegible]

یہی نہیں کہ اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔ بلکہ وہاں کا حکمران اوراس کی رعایا مسلمانوں سے برسر پیکار بھی تھی۔صرف ایسی ہی ذات کے لئے ممکن تھا جو اسلام کی راہ میں ہر قربانی کے لئے تیار ہو۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو راجہ آپ کی تبلیغی کوششوں کو ناپسند کرتا تھا اور اس سلسلہ میں آپ کو عظیم مشکلات پیش آئیں آپ نے راجہ کی تمام مشکلات کا جس ثبات و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا وہ آپ کی اس فتح مبین سے ظاہر ہے جو آپ کو انکے مقابلہ میں حاصل ہوئی (1)۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندو پاکستان کی تہذیبی و تمدنی تاریخ پر جو اثرات خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ نے چھوڑے وہ مستقل اور اہم نتائج کے حامل تھے۔

ملکی فتوحات اور حکمرانی کے نقوش دیر پا ہو سکتے ہیں۔مگر امتداد زمانہ سے وہ دھندلے پڑجاتے ہیں۔لیکن تمدنی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے اس کے رخ کو بدل دینا ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کے اثرات ونقوش صفہ ہستی پر ہمیشہ نمایاں اور روشن رہیں گے۔اگر خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ اوران کے بعد دیگر مشائخ و دینی رہنما تبلیغ اسلام کے فرائض انجام نہ دیتے تو یہاں کی تاریخ کا رنگ کچھ اور ہوتا۔اسلامی حکومت کا قیام اتنا دیر پا نہ ہوتا اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اس قدر کم رہتا کہ حکومت کے ختم ہوتے ہی وہ بمنزلہ نہ ہونے کے ہو جاتے۔

اس لحاظ سے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان بوریہ نشین، خانقاہوں میں فقیرانہ زندگی بسر کرنے والے درویشوں نے اسلام کے قیام اور مسلمانوں کی حیثیت و معاشرہ کو مضبوط بنانے میں بادشاہوں، سیاسی مصلحوں اور دیگر رہنماؤں سے کہیں زیادہ اہم خدمات انجام دیں۔

وحید احمد مسعود صاحب نے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات

1۔اس سلسلہ میں مولانا آزاد بلگرامی کی ماثر الکرام میں تفصیلی واقعات موجود ہیں۔یہ ضرور ہے کہ یہ تذکرہ بہت بعد کا ہے لیکن آزاد بلگرامی ہمارے عہد کے مولانا آزاد کی طرح غلط واقعات لکھنے کے عادی نہ تھے۔اگر چہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا کوئی بیان ہی قابل استدلال نہیں ممکن ہے کہ سب تفصیلات صحیح نہ ہوں۔لیکن مجموعی طور پر ان کو تاریخی شہادت کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔دیکھو ماثر الکرام ص ۸۔

میں ایک مستند کتاب لکھ کر تاریخ کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہمارے تاریخی لٹریچر میں یہ کتاب ایک عمدہ مقام حاصل کرے گی۔ مصنف مذکور کی کوشش یقیناً قابل تحسین ہے۔

سید معین الحق

۱۸ مارچ ۱۹۶۱ء

مطابق ۳۰ رمضان المبارک ۱۳۸۰ھ

دیباچہ

از

حاجی حافظ مولوی عبدالواحد صاحب قادری ایم اے علیگ شاہ جہان پوری

میرے کرم فرما جناب شیخ وحید احمد مسعود صاحب جو اس کتاب کے مصنف ہیں۔ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ روایات اور درایات ان کے خاندان میں پشتینی چلی آتی ہیں۔ تصوف پر انہوں نے کئی رسالے لکھے ہیں جو مقبول ہو چکے ہیں ادب اور فن صحافت میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ رسالہ نقیب (بدایوں) کے مدیر رہ چکے ہیں۔ فن تاریخ میں بھی ان کو اونچا درجہ حاصل ہے۔ جو کتابیں حضرت خواجگان کے حالات میں اب تک غیر محقق اور روایتی ملتی ہیں۔ ان کے پیش نظر ضروری تھا کہ حضرت خواجہ خواجگان کی زندگی کے حالات صحت اور درستگی کے ساتھ اہل ذوق کی خدمت پیش کئے جائیں۔ اس لئے ضروری ہوا کہ پچھلی کتابوں میں جو خوبیاں ہیں وہ اچھے انداز میں دنیا کے سامنے لائی جائیں اور جہاں جہاں سقم ہوں ان پر جرح اور قدح کی جائے۔

وحید احمد صاحب نے نہایت جرأت کے ساتھ مذکورہ بالا باتوں پر عمل کیا ہے اور کھرے کو زیادہ کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا دکھلا دیا ہے۔ اس تذکرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ہوشیار معمار پرانے مکان کو گرا کر ان کی جگہ ایک بڑا عالیشان مکان جو نہایت مضبوط ہو بنا کر کھڑا کر دے۔

یہ تذکرہ ہندوستان کیا بلکہ دنیائے اسلام کے زبردست بزرگ کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ بزرگ چونکہ اعلیٰ درجہ کے صوفی تھے اس واسطے تصوف پر بھی اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے قصبہ چشت جو اس خاندان صوفیہ کا منبع ہے۔ اس کے حالات بھی شامل کئے گئے ہیں۔ پھر حضرت خواجہ خواجگان کی ابتدائی زندگی کا بیان جن جن بزرگوں

سے آنجناب نے اکتساب کیا ہے اور جہاں جہاں اس دولت سے مالا مال ہوئے ہیں۔ ان سب کا مفصل بیان ہے پھر حرمین شریفین کی کیفیت اور دربار مدینہ مکرمہ سے ہندو پاکستان آنے کا براہ راست فرمان حاصل کرنے کا حال تحریر ہے۔ حرمین شریفین جانے سے پہلے مدینہ سے اکتساب فیض اور وہاں سے واپسی کے بعد پھر قدم بوسی نہایت عمدہ طریقے سے دکھلائی ہے۔

اب ہندو پاکستان کی سرزمین میں داخلہ ہوتا ہے۔ اور جائے قیام اجمیر شریف قرار پاتا ہے۔ ہندو پاکستان بھر میں کوئی جگہ سوائے اجمیر شریف ایسی نہ تھی اور نہ اب ہے جو مکہ مکرمہ کی جغرافیائی تصویر کے قریب قریب ہوتی ہو جس شخص نے بھی کعبہ مبارکہ کے وسط میں کھڑے ہوکر ہر چہار طرف کی پہاڑیوں پر نظر ڈالی ہے۔ ان پہاڑیوں میں سے کسی ایک پہاڑی پر کھڑے ہوکر مکہ معظمہ کی زیارت کی ہے۔ وہ اجمیر شریف کو دیکھ کر اس کے آس پاس کی پہاڑیوں پر نظر دوڑا کر خود پکار اٹھے کہ اگر مکہ مکرمہ سے ملتی جلتی کوئی جگہ ہے تو یہ وہی اجمیر شریف ہے۔ ایسی سکونت کے واسطے اجمیر شریف کا انتخاب ہی خود بتلاتا ہے کہ حضرت خواجہ خواجگان کس پائے کے بزرگ تھے۔ صرف جغرافیائی حیثیت سے اس جگہ کا انتخاب اتنا عمدہ نہیں رہا جتنا کہ سیاسی حیثیت سے۔

یہ خیال کرنے کی بات ہے کہ برصغیر کی اس وقت کی سیاسی طاقت کا مرکز تھا تو یہی اجمیر شریف تھا۔ بالکل اعدا کے منہ میں اپنے آپ کو داخل کر کے اور پھر سکون سے زندگی بسر کرنا یہ بلا تائید ایزدی کے ممکن نہ تھا۔ یہاں پر آ کر اس بات کا بین ثبوت ملتا ہے کہ جیسے تائید غیبی ایران سے برصغیر کی سرزمین میں روانہ کرنے میں ہمدرد و مددگار رہوئی۔ اسی طرح برصغیر کی اس سرزمین میں بھی تائید ایزدی شامل حال رہی ہے یہ سوانح حیات تفصیل کے ساتھ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ کس طرح اسی اجمیر شریف سے اسلام کا روشن آفتاب اپنی پوری آب و تاب سے چمکنے دمکنے لگا۔ اور آپ کے شیخ حضرت عثمان ہارونی کی دعائیں آپ کے بارے میں کس قدر بار آور ہوئیں۔

اس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس تذکرہ کی تاریخی حیثیت پر نظر ڈالیں۔
فاضل مصنف نے حضرت خواجہ خواجگان کے حالات سپرد قلم کرنے میں مستند کتب سیر سے مدد لی ہے اور جہاں رائج الوقت تذکروں پر جرح و قدح کی ہے وہاں مستند کتابوں کے مؤلفین و مصنفین میں ملا عبدالقادر بدایونی، شہزادہ دارا شکوہ قادری، جہاں آرا بیگم، شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی جیسے جید علماء و مشائخ و مؤرخ شامل ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر خود حضرت خواجہ خواجگان رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ہیں جن پر اس تذکرہ کی بنا ہے بادی النظر میں یہ کتاب تذکرہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔ سیر الاولیاء جو خاندان چشت کے بزرگوں کے حالات میں نہایت مستند کتاب ہے وہ بھی وحید احمد صاحب کے پیش نظر رہی اور ان کی تصنیف کی مضبوطی کی ضامن ہے۔

تربیت اور صحیح تربیت، تصوف کی اور صوفی کی جان ہے۔ اس سوانح میں خاندان چشتیہ کے طریقے پر تربیت کے اصول بیان کیے گئے۔ اس تربیت میں سماع کو کہاں تک دخل ہے۔ اس پر غور اور فکر کے ساتھ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایسی سرزمین جہاں ایک بے پڑھی عورت اور ایک ناسمجھ بچہ بھی بے تال بے سر کے زمین پر قدم رکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ایسی سرزمین میں اگر سماع اور راگ کو تصوف کی تکمیل میں استعمال کرنا ضروری سمجھا گیا تو خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ انصاف کے قریب ہے یا بے انصافی ہے۔ فاضل مصنف نے سماع کی حمایت کی ہے اور ان ہی کو حمایت بھی کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کو اس خاندان سے وابستگی ہے۔

اب رہا خوارق عادات کے متعلق تو جناب باری کی مہربانی سے ہر چھوٹے بڑے بزرگ کو ایسا منصب عطا کیا جاتا ہے کہ وہ کرامات کا اظہار فرمائے۔ حضرت خواجہ خواجگان کی زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ نے بہت سے ایسے مواقع عنایت فرمائے اور کرامتیں ظہور میں آئیں کہ لوگوں کی عقلیں ان کی وجہ سے خیرہ ہوئیں۔ اور ان ہی میں سے اکثر کو دیکھ کر لوگ مشرف بہ اسلام بھی ہوئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہے کہ فاضل مصنف اگرچہ انگلستان میں کچھ عرصہ رہ آئے ہیں۔ پھر بھی خوارق عادات اور کرامات کے قائل ہیں اور کسی بھی

مادیت سے مرعوب نہیں ہوئے ہیں۔ حضرت خواجہ خواجگان رحمۃ اللہ علیہ کی خانگی زندگی پر لائق مصنف نے جس طرح سے روشنی ڈالی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

انسان انسان رہے اور انسان کی حدود میں رہ کر ملائکہ کی سی باتیں کرے وہ انسان واقعی قابل تعریف اور قابل تعظیم ہے۔ مگر جب ہم انسان کو اس کی انسانی حدود سے آگے بڑھا دیں اور ملائکہ کی صف میں داخل کر دیں تب کیا وہ انسان کہلانے کا مستحق ہے؟

اس سوانح کو پڑھ کر اس بات کی خاص خوشی ہوئی ہے کہ لائق مصنف نے حضرت خواجہ خواجگان رحمۃ اللہ علیہ کو انسانی حدود میں رکھا ہے اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایک مافوق البشر انسان تھے اور یہ بھی اصل پوچھیے تو اس سوانح عری کا کمال ہے۔ میرے دل میں اسی وجہ سے اس تذکرے کی اور بھی وقعت ہے۔

اس کے بعد ہم تبلیغ پر آتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد حضرت خواجہ خواجگان رحمۃ اللہ علیہ نے کس ضبط اور خاموشی کے ساتھ درندوں کے منہ میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کیا۔ ہم کو دیکھنا ضروری ہے کہ اس خاموش زندگی کا اثر آپ کے ماحول پر کیا پڑا۔ اور جو مقصد تبلیغ کا آپ لے کر آئے تھے وہ کس درجہ تک کامیاب رہا۔ ہم کو اس سوانح سے یہاں بھی کافی مواد بہم پہنچ جاتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ عوام ہی نے نہیں بلکہ خواص اور صاحبان ملک نے بھی اجمیر شریف کو اپنا مطمع نظر گردانا ہے۔ شاہان اسلام کا ہندوستان کی طرف رخ کرنا اور آپ سے استدعا نصرت کرتے رہنا یہ سب آنجناب کی بلند حوصلگی کی طرف دلالت کرتا ہے۔ یہ تو ان کی زندگی کے زمانے کی باتیں تھیں آپ اگر اجمیر شریف گئے ہوں تو معلوم ہوگا کہ ایسے جلیل القدر فرمانروا جیسے اکبر اعظم، شاہ جہاں اور دیگر سلاطین مغلیہ نے اجمیر شریف سے صدیوں بعد بھی کس قدر عقیدت مندی کا اظہار فرمایا ہے۔

ان کی عقیدت مندیوں کی نشانیاں آج تک اجمیر شریف میں موجود ہیں۔ وہ زمانہ تو خیر مسلمانوں کے عروج کا تھا۔ آج بھی جب کہ مسلمانوں کی وہ حیثیت نہیں رہی ہے۔ ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ کونے کونے سے خراج عقیدت مندی اب بھی خواجہ خواجگان

رحمۃ اللہ علیہ کو دیا جا رہا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (جمعہ: ۴) کہ حضرت خواجہ خواجگان رحمۃ اللہ علیہ نے رہنے کے بعد اسی سرزمین برصغیر میں کیسے کیسے جلیل القدر خلفاء چھوڑے۔ حضرت کی حکومت جیسے کہ پہلے تھی ویسے ہی اب جاری ہے۔ اسی طرح ان کے بعد کے آنے والے حضرات کی حکومتیں ان کے زمانے میں بھی اور آج تک بھی اسی طرح جاری اور ساری ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ ایک زمانہ ایسا تھا اور وہ زمانہ اب بھی ہے کہ ان کی ہی حکومت چلتی رہی ہے اور آج بھی چل رہی ہے۔ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور بعد کے بزرگ پہلے بھی لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

یہ ایک مختصر سالب لباب ہے۔ حضرت خواجہ خواجگان رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کا جو میرے قابل دوست شیخ وحید احمد مسعود صاحب نے تحریر کی ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ کتاب کسی دنیوی منافع کو مدنظر رکھ کر نہیں لکھی گئی۔ اس کے مطالب آسان اردو میں پیش کئے گئے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے ایک شاہکار ہے ارباب ذوق سلیم کے واسطے مشعل راہ ہے۔ اور ایک ایسا منارہ ہے جو عرصہ دراز تک بھولے بھٹکے ہوئے لوگوں کو روشنی دکھاتا رہے گا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس پرخلوص کوشش کو قبول فرمائے۔ یہ کتاب فاضل مصنف کو دنیا میں بلند مرتبے پر پہنچائے اور عقبیٰ میں اللہ تعالیٰ ان کو اونچے درجے عنایت فرمائے۔ آمین۔

حررہ عاصی عبدالواحد قادری

شاہجہانپوری

علیہ السلام سے پانچ سو سال بعد یعنی تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح وید وجود میں آئے تھے گویا جو تعلیم ابراہیم علیہ السلام سے حاصل کی تھی وہ ہندوستان پہنچ کر پانچ سو برس بعد بصورت وید منضبط کی گئی اور اس مدت میں کچھ فروگذاشت ممکن ہوسکتی ہے اور اسی کی وجہ سے فرق بھی نمایاں ہوا۔ برہما، براہیم اور ابراہیم ایک ہی شخصیت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ جب یہ تعلیم ہندوستان میں مسخ ہوگئی اور شخصیتیں پتھر کی شکل اختیار کر گئیں تو بدھ مذہب جاری ہوا۔ اسی طرح جب چین میں ابراہیمی تعلیم میں ردوبدل ہوگئے تو وہاں بھی بدھ مذہب نے اپنا سکہ جمایا۔ بہرحال مختلف ملکوں میں مختلف اصلاحیں خود اصلاح کی محتاج ہوگئیں۔

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کی تعلیم میں نبی کی ذات نمایاں نظر آتی ہے اسی وجہ سے تشبیہ اور تنزیہ کا قصہ پیدا ہوا۔ لیکن حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو رسول کا خطاب ملا۔ لہٰذا ان کی تعلیم میں ذات نبوت کو علیحدہ کر کے شخصیت میں الجھنے سے محفوظ کر دیا اور احادیث تک کا سیدھا راستہ دکھا دیا گیا۔

جب اس طرح مادیت و روحانیت میں توازن قائم ہوگیا اور تشبیہ و تنزیہ کے قصوں سے پاک کر کے راہ اوسط دکھائی گئی تو دین مکمل ہوگیا۔ اور جملہ گذشتہ مذہبی اصلاحیں منسوخ ہو کر رہ گئیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں موجودہ تصوف کی بنیادوں کو اسلام کی تعلیم سے پہلے کی شے سمجھنا یا بعد کی شے خیال کرنا دونوں غلط ہیں۔ روحانیت کا صحیح نقشہ دین کامل کی تعلیم میں مل سکتا ہے۔

اسلام اور تصوف

اسلامی تعلیم کا واحد ذریعہ قرآن ہے اور اسوۂ حسنہ اس کی تفسیر ہے۔ حضرات صحابہ نے بغیر این دآن کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کر کے قرآن نے ظاہری و باطنی معنی سمجھے اور نہایت خلوص سے ان پر عمل کیا۔ یہی خصوصیت ان کی افضلیت کا باعث ٹھہری۔ تابعین نے عقیدت کے ساتھ علم سے بھی کام لیا۔ اور تبع تابعین نے اپنی فضیلت علمیت سے کام لے کر جو سمجھا اس پر عمل کیا۔ لہٰذا اسی کے مطابق ان کے اخلاص میں کمی بھی واقع ہوگئی۔ اس کے

بعد وہ زمانہ آیا جب کہ علمیت عقیدت پر غالب آ گئی اور علم کی وجہ سے رخنے پڑنے لگے۔ تو فتنوں کے روکنے کے لئے حدیث کی تنقیح ضروری سمجھی گئی اور فقہ کے اصول بھی منضبط کئے گئے۔ لہٰذا وہ صحابہ والی عقیدت جاتی رہی اور خصوصیت مفقود ہو گئی۔

اس عالم و کیفیت میں صحابہ والی خصوصیت کو زندہ کرنے کے لئے اخلاص عمل کی پیروی اور تقلید کرنے کا نام تصوف ہوا (1)۔

وجہ تسمیہ جو کچھ بھی ہو۔ مگر تصوف ایک ایسا اخلاق ہے جو ظاہر و باطن پر تصرف رکھتا ہے۔ اس اخلاق و ادب کا نام رفع شبہات اور صفائی قلب ہے۔ نیت کی پاکی اس کا مقصد ہے۔ چنانچہ حدیث بتاتی ہے کہ نیة المومن خیر من عمله (2)۔

نیت اور ارادہ کی جب تک شہادت نہ گزرے فقہ ظاہر میں اس پر کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ شریعت کی تکمیل کے لئے اخلاق ظاہری کے ساتھ اخلاق باطنی کی درستی کی بھی ضرورت ہے۔ اسلام یعنی دین محمدی کے ابتدائی دور میں شریعت کی یہی حقیقت تھی اور اخلاق ظاہری و باطنی میں توازن و عدل کی وجہ سے امتیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد میں دوئی واقع ہو گئی۔ اس دوئی اور تفریق کو سمجھنے کے لئے اسلامی تاریخ کی سیر کرنا ضروری ہے اس شرط کے ساتھ کہ ہر دور کا ماحول پیش نظر رکھا جائے۔ اسلامی مورخین کا وجود تفوق و امتیاز رکھنے کے باعث شیخین کے بعد اسلام کے ابتدائی حالات بیان کرنے میں کچھ شرمائے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک کے حالات وقعت و تاثیر اپنے اندر

1۔ تصوف عمل کرنے کی چیز ہے نہ کہ کہنے کی۔ ابو حفص حداد اقدس سرہ نے فرمایا ہے کہ تصوف پختہ ساختن وہم ریش نسبت، واقعی جب یہ اوہام پختہ ہو جاتے ہیں تو مغز جان میں سرایت کر جاتے ہیں اور عوام و خواص کو عجیب و غریب آثار اطوار نظر آتے ہیں۔ صاحب مقام کو لذت حاصل ہوتی ہے اور دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔ مگر بعض نادان چند اذکار و مراقبات کے بعد اپنے آپ کو صوفی کہنے لگتے ہیں اور فریب کا جال بچھاتے ہیں۔ بنائے فاسد بر فاسد۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے مراتب سے بچائے (منقول از کشکول کلیمی)۔

2۔ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے نہیں ہے بلکہ ایک تابعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ مگر یہ قول خلاصہ ہے مختلف مفہوموں کا جو حدیث شریف میں موجود ہیں۔

رکھتے ہیں اور ان کے بعد کے واقعات کی تاریخ کچھ ہلکی اور خالی معلوم ہوتی ہے۔ سب سے پہلے اسلامی تاریخ عہد امیہ میں لکھی گئی جس میں سیاست کو بدرجہ اولےٰ دخل تھا۔ عہد عباسی میں جو تاریخ لکھی گئی اس ماحول کا ایرانی رنگ صاف نظر آ رہا ہے۔ پھر بعد والی تاریخ یونانی طرز پر لکھی گئی ہے۔ جس میں مؤرخ کو حق حاصل ہوگا کہ واقعات کو برطرف کر کے اپنی رائے کی اہمیت ظاہر کرے اور اپنی رائے کی خاطر واقعات کا منہ جس طرف چاہے موڑ دے۔ عہد عباسی میں واقعات کے علاوہ شخصیات پر بھی عباسی معیار سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس تصویر کو بغیر تنقید کے مطابق اصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کردار ہی بدل دیئے گئے ہیں۔

کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ عہد نبوت میں وحی الٰہی کی وضاحت صاحب وحی ﷺ کے قول و عمل سے ہوتی تھی اور اسوۂ حسنہ فقہ کی روح رواں تھے۔ اس عہد میں اختلافات رحمت تھے۔ شاہ و گدا اور عالم و ناخواندہ میں بہ لحاظ عمل کوئی امتیاز نہ تھا اور معیار شرف محض تقویٰ تھا۔ اہل صفہ نے حدیث اور اسوۂ حسنہ کی حفاظت و تبلیغ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ خلافت راشدہ میں تقلید رسول اور اتباع رسول کے ذریعہ جو کامیابیاں حاصل کیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خود فقیہ اعظم تھے۔ وہ صحابہ سے اسوۂ حسنہ اور حدیث کی تحقیق کے بعد حکم صادر فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد میں صحابہ کو انہوں نے مدینہ منورہ سے باہر نہیں جانے دیا اور اس طرح ان کے مشوروں سے وہ کامیابی حاصل کی جس سے تاریخ اسلام بھری ہوئی ہے۔ خلیفہ دوم کی شہادت کے بعد کچھ صحابہ مدینہ چھوڑ کر چلے گئے اور کچھ گوشہ نشین ہو گئے۔ لہٰذا سوسائٹی کی حالت میں فرق آ گیا۔ اور دشواریاں رونما ہو گئیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تمام اعتراضات کی تردید کر دی۔ سب نے ان کے بیان کو تسلیم بھی کر لیا۔ مگر پھر بھی اختلاف اپنی جگہ باقی رہے۔ جب وہ قمیص خلافت کو نہ اتارنے کی وجہ سے شہید کر دیئے گئے تو عین روشنی میں تاریکیوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ اور تلوار جو نیام سے باہر ہوئی تو پھر نیام میں واپس نہ جا سکی۔ اجتماعی نظام پر لامرکزیت غالب آ گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ باب علم تھے۔ محکمہ

قضاء ان کے چشم وابرو پہ قربان تھا۔ فراست ان کا کلمہ پڑھتی تھی۔ لیکن پھر بھی کسی امر کا فیصلہ نہ ہوسکا۔ ان کا عہد خلافت فتنوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی نہ دوستوں نے اطاعت (1) کی اور نہ مخالفین نے مانی۔ نئے حالات نے نئی فضا پیدا کر دی ہر صحابی کا نظریہ کتاب وسنت پہ تھا تو اجتماعی زندگی کے متعلق تھا اور اس اختلاف میں عشرہ مبشرہ تک شریک تھے۔ بہر حال جب ان مختلف نظریات و تجربات میں مفاہمت نہ ہو سکی اور کوئی حکم مقرر نہ کیا جا سکا تو یہ اختلافات رحمت کی شکل اختیار کر گئے۔

علم وحکمت کی ذہنیت رکھنے والی امت کی خرابی تو شکوک وشبہات ہی کے ذریعہ ہونا چاہئے تھی۔ لہٰذا محاذ بن گئے اور فرقہ بندیوں نے برے دن لا کر سامنے لا کھڑے کئے۔ اس قسم کے اختلافات کو خطاء اجتہادی سے موسوم کیا گیا ہے۔ خطاء اجتہادی پر مواخذہ نہ ہو تو نہ ہو۔ مگر کاردین میں ابتری پڑ گئی۔ یہ تاویل کہ عصبیت نے تعلیم رسول پر پردہ ڈال دیا تھا قطعی فضول ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ مصری ابن سبا اور اس کی جماعت صحابیوں اور تابعیوں کو بہائے لئے جا رہی تھی استغفر اللہ۔ لیکن اگر ان باہمی اختلافات سے جماعت ابن سبا نے فائدہ اٹھایا تو یہ اس کا حق تھا۔ ان اختلافات کے متعلق ہماری تاریخ جس رنگین بیانی سے کام لیتی ہے وہ نہ ان حضرات کی شایان شان ہے اور نہ ان کے حالات پر کوئی صحیح روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ روایت سے بے نیاز ہو کر تاریخ کا بیان یک طرفہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کی لغویات کو سمجھا اور نہ صرف خلافت سے دستبردار ہو گئے بلکہ وصیت فرما گئے کہ کوفہ والوں پر اعتبار نہ کیا جائے۔ پھر غلبہ وقبضہ کی وجہ سے تخت خلافت پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ متمکن ہوئے تو اپنی سیاست سے انہوں نے فتنوں پر قابو پا لیا۔ اموی وہاشمی رقابت کی داستان ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ جمہوریت کے بجائے شخصی حکومت کی انہوں نے طرح ڈالی اور شخصی حکومت ہمیشہ اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیا کرتی ہے۔ حکمرانی و جہانبانی کے علاوہ خلافت بنی امیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ مذہبی وقار کو قائم

1۔ حضرت طلحہ، حضرت زبیر و دیگر اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ اگر چہ فتنہ وضع حدیث اسی دور کی پیداوار ہیں۔

عہد تابعین میں بعض کبار صحابہ کے اقوال نا قابل استناد قرار دیے گئے تو علماء تابعین میں سے ہر ایک عالم کا مستقل جداگانہ مذہب قرار پایا اور ہر ایک علاقہ وشہر میں طبقہ تابعین کا کوئی عالم مقتدیٰ مقرر رہوا۔ مدینہ میں سعید بن المسیب اور سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور ان کے انتقال کے بعد زہری اور قاضی یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن، مکہ معظمہ میں عطاء بن ابی رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی، بصرہ میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، یمن میں طارس بن کیتان اور ملک شام میں مکحول اپنے عہد کے ائمہ تھے۔ تشنگان علوم نے ان سے استفادہ کر کے اپنی پیاس بجھائی اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ اور مذاہب صحابہ اور ان کی اپنی تحقیقات کا علم حاصل کیا۔ عراق میں جس کے امام حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۰ھ، ۷۲۸ء) تھے۔ ان کے دو شاگردوں واصل بن عطاء اور عمر بن عبید نے از دیوں سے فلسفہ حاصل کیا اور اپنے استاد سے منحرف ہو گئے۔ اعتزال کرنے کے بعد انہوں نے بغداد و بصریٰ میں معتزلہ وقدریہ جماعت کی طرح رکھی۔ عقلیت کی ان تحریکوں کا حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اور خلیفہ ہشام نے تدارک کیا۔ لیکن یہ جماعتیں عہد عباسیہ میں پھر ابھریں اور خوب چمکیں۔

رسول کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کے عہد میں حدیث کی روایت ہوا کرتی تھی اور ابتدا میں کتابت اس لئے نہیں کی جاتی تھی کہ قرآن سے ملتبس نہ ہو جائے (1)۔

ملکی نظام اور اشاعت دین کیلئے مفتوحہ ممالک میں فقیہ صحابہ مقرر کئے جاتے تھے۔ چنانچہ کئی شہر فقہ کے مرکز بھی بن گئے تھے۔ شام، مصر اور عراق میں حدیث کے مدرسے بھی جاری ہو گئے تھے۔

تابعین کے بعد حاملان دین کی ایک جماعت وجود میں آئی۔ جیسا کہ حدیث میں ہے

1۔ بعد میں صحابہ نجی طور پر حدیثیں لکھنے لگے تھے مگر یہ شیرازہ منتشر تھا۔

کہ اس علم کو ہر ایک آنے والے زمانہ میں معتبر و قابل استناد علماء محفوظ رکھیں گے۔ ان سب علماء کا طریق کار تقریباً ایک ہی سا تھا۔ اس میں کا ہر مجتہد اختلافی صورتوں میں اپنے شیوخ کے مذہب کو راجح سمجھتا تھا۔ تدوین کتب کا الہام اسی طبقہ کے علماء کو ہوا۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور محمد بن عبدالرحمن بن ذہب نے اخبار و آثار کو منظم صورت میں جمع کیا۔ مکہ مکرمہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ نے یہ کام انجام دیا۔ کوفہ میں سفیان ثوری اور بصرہ میں ربیع بن الصبیح نے حدیث کی یہ خدمت کی۔ موطا امام مالک کو جب خلیفہ نے خانہ کعبہ میں لٹکانے اور مختلف صوبوں میں اشاعت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو امام مالک نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ کرو۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے فروعی مسائل میں اختلاف کیا ہے اور یہ اختلافات دنیا میں مشہور ہو چکے ہیں اور ہر ایک کے پاس اسکے متعلق سنت رسول ﷺ کا ذخیرہ موجود ہے۔ لہٰذا ان کو چھوڑ دو کہ وہ اپنی اپنی پسند کے مطابق عمل کریں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کو عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں فروغ حاصل ہوا۔ اس کے بعد امام شافعی نے ارشاد کیا کہ رائے اور قیاس میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک شرعی حکم سے دوسرے حکم کا اخراج کرنے کو قیاس کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن جب حکم شرعی کے پیرایہ میں ذاتی رائے کو بیان کیا جائے تو اس رائے کو استحسان کہتے ہیں۔ محدثین میں حضرت امام احمد بن حنبل کی بھی شخصیت بلند اور مابہ الامتیاز ہے۔

عہد بنو امیہ میں نظام سلطنت کا تعلق خلیفہ و امیر سے تھا اور نظام شریعت کا تعلق علماء سے تھا جن کی حکومت مدرسہ میں تھی مجتہدین کو عہدۂ قضا پر فائز کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس عہد میں سیاسی امور کو مذہبی سانچوں میں ڈھالنے کا جب دستور ہو گیا تو دربار خلافت میں اپنے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر دوسری صدیِ ہجری میں شیعوں، خارجیوں اور علماء دربار نے حدیثیں گھڑنا شروع کر دیں۔ باوجود اس بدعت نامعقول اور شخصی طرز کی حکومت کے بنی امیہ میں اسلام کا دریا ایک ہی دھار میں بہتا رہا اور یہی اس عہد کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اموی خلافت ۱۳۲ھ، ۷۵۰ء میں ختم ہوئی۔ تیسری صدی ہجری میں عباسیوں کے

عہد کا کارنامہ یہ ہے کہ فتنۂ وضع حدیث کو دور کرنے کے لئے احادیث کی تنقید ہوئی اور حدیث کو دور کرنے کے لئے احادیث کی تنقید ہوئی اور مستند احادیث کا مجموعہ ''صحاح ستہ'' کے نام سے وجود میں آیا اور شائع ہوا۔

جب معتزلیوں اور شیعوں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت بنوامیہ سے نکل کر حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو عباسیوں نے عجمیت کو قبول کیا۔ اہل بیت پر ظلم کئے۔ مذہبی وقار پر فاتحہ پڑھی اور یونانی فلسفہ پر قربان ہوگئے۔ یونانی فلسفہ خلیفہ منصور کے عہد میں رائج ہوا۔ خلیفہ ہادی کے زمانہ میں متکلمین نمودار ہوئے جو عقائد دین پر عقلی معیار سے بحث کرتے تھے۔ ہارون نے یونانی علوم کے ترجے کروا کر عقیلت کو فروغ دیا۔ مامون نے عملی مسائل و نتائج کو عقائد دین سے زیادہ اہمیت دی۔ وہ خود مسئلہ خلق قرآن کا سب سے بڑا حامی تھا(1)۔ مامون کی سرپرستی کی وجہ سے مسئلہ خلق قرآن کی معتزلیوں نے برملا اشاعت کی اور علماء حدیث بے طرح مغلوب وزیر کردیئے گئے۔ اس زمانہ میں فلسفہ و مذہب کے امتزاج سے ''علم کلام'' وجود میں آیا۔ گویا شرعی حقیقت سمجھنے کے لئے قرآن وحدیث سے زیادہ معتبر فلسفہ کی سند کو تسلیم کیا گیا اور اس طرح اتباع رسول کا راستہ مسدود کردیا گیا۔ اس ماحول میں تین گروہ بن گئے۔ خلفاء فقہاء اور صوفیہ۔ علم کلام کی وجہ سے مباحثوں اور مناظروں کی گرم بازاری ہوئی۔ علماء، فقہاء اور محدثین پر حکومت کی طرف سے وہ وہ ستم ڈھائے گئے کہ توبہ ہی بھلی۔ خارجیوں، زیدیوں، معتزلیوں اور شیعوں نے مذہب کو بازیچہ بنا کر اور سیاسی میدان میں ایرانی امیروں، طاہریوں، صفاریوں، اور سامانیوں نے خلافت

1۔ معتزلہ کے نزدیک ہر شخص اپنے افعال کا خالق ہے اور اہل سنت خالق افعال اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ افعال کا صدور بندوں کے توسط سے ہوتا ہے۔ معتزلہ صفات الٰہی کو بذات خود قائم نہیں سمجھتے اور اہل سنت صفات کو عین ذات نہیں بلکہ قائم بالذات مانتے ہیں۔ صفات کی بحث کے سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ قرآن حادث ہے یا قدیم؟ علماء اسلام قرآن کو قدیم و غیر مخلوق اور معتزلہ حادث اور مخلوق کہتے ہیں۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ حروف و اصوات کو ایک جسم حادث میں پیدا کردیتا ہے۔ جس کو نبی کہتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک وحی کی یہی حقیقت ہے۔

عباسی کی قبر کھودنا شروع کر دی۔ ان سیاسی رعنائیوں اور مذہب سے بے اعتنائیوں کی وجہ سے حکومت مذہب اور امن عامہ کو جب برباد کیا جانے لگا تو بعض علماء نے بجائے مدرسہ کے خانقاہوں میں پناہ لی۔ ضلالت، سیئات و بدعات سے کنارہ کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس گوشہ نشینی کو رہبانیت سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ اس گوشہ نشینی کی دو خصوصیات ہیں اور دونوں کا منشاء رشد و ہدایت ہے۔ یعنی قیام دین کے لئے یکسو ہو کر ذکر و فکر کرنا اور تبلیغ دین کے لئے سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ (انعام:۱۱) پر عمل کرنا۔ رہبانیت اس سے قطعی جدا ہے۔ کیونکہ رہبانیت میں عمل و حرکت کے بجائے جمود ہے اور طلسمات و عجائبات اس کی آخری حدود ہیں۔ بہر حال اس طرح خلیفہ ماموں کے زمانہ میں اسلامی دریا دو دھاروں میں بہنے لگا۔ فقہاء ظاہر نے حکومت سے ٹکر لی اور فقہاء باطن نے حکومت و سیاست دونوں کو ٹھکرا دیا۔ مقصد چونکہ دونوں کا ایک تھا حکومت کے مظالم سے نہ یہ بچے اور نہ وہ بچے۔ علماء ظاہر گومگو میں مبتلاء ہو گئے اور تحفظ دین اور اس کی اشاعت کا سہرا صوفیوں ہی کے سر رہا۔ پھر ان کا طریقہ طرز تصوف کے نام سے موسوم ہوا۔

صوفی اول

ابوالہاشم ایک صاحب کوفہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی ملک شام میں گزاری تھی اور وہ اہل سنت والجماعت سے تھے جامی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا ہمعصر کہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ان کی پیدائش کا سال (۸۴ھ، ۷۰۰ء) اور رحلت کا سال (۱۳۲ھ، ۷۴۹ء) درج ہے۔ صاحب کشف الظنون نے ان کا وصال (۱۵۰ھ، ۷۵۶ء) میں بتایا ہے۔ امام قشیری کے بیان کے مطابق خلیفہ مامون (۲۱۹۔ ۱۸۹ھ، ۸۳۳۔ ۸۱۳ء) کے عہد میں سب سے پہلے (۲۰۱ھ، ۸۱۶ء) میں ابوالہاشم نے صوفی کا لقب اختیار کیا تھا۔

صوفی اول ابوالہاشم کے علاوہ تاریخ تین نام اور بتاتی ہے جو صوفی کہلاتے تھے۔ یہ تینوں صاحبان شیعہ تھے۔ ابو اسرائیل مولائی، یحییٰ بن معاذ ساکن رے (متوفی ۲۰۶ھ،

۸۲۱ء)اور جابر ساکن کوفہ (متوفی ۲۱۰ھ،۸۲۵ء)۔ مقاصد مختلف سہی مگر اس زمانہ میں صوفی دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک شیعان کوفہ جنہوں نے اپنے علاقہ سے مقتدیٰ ابراہیم نخعی اور شعبی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے خلاف اپنا راستہ اختیار کیا اور دوسرے اہل سنت جنہوں نے اپنے محدث وفقیہ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کیا۔ بہر حال اس تقسیم سے ظاہر ہے کہ "صوفی" کی اصطلاح دوسری صدی ہجری کے آخر یا تیسری صدی ہجری کے اوائل میں تراشی گئی تھی اور یہ اصطلاح خالص کوفہ سے تعلق رکھتی ہے۔

شیعوں کا فرقہ زیدی معتزلہ کا ہمنوا ودم ساز تھا۔ کوفہ والے شیعہ صوفیوں کا بصرہ میں بھی رسوخ تھا۔ تیسری صدی ہجری میں ابن الراوندی معتزلہ سے اعتزال کر کے جب شیعوں میں شامل ہو گیا تو شیعوں کی تقدیر چمک اٹھی۔ پھر ان ہی کی ایک جماعت اسماعیلیہ کہلائی۔ جو مصر میں فاطمی خلافت کی بانی ہوئی۔ تیسری صدی ہجری کے آخر میں قرامطہ نمودار ہوئے جنہوں نے بغداد میں تہلکہ مچا ڈالا۔ ان کی ایک شاخ ملاحدہ حشیشی یا باطنی کے نام سے مشہور ہوئی جس کا سرغنہ حسن بن صباح تھا۔ چوتھی صدی ہجری میں عالم اسلام پر شیعہ چھائے ہوئے تھے۔ اور ان ہی کے زور پر ہلاکو خان نے عباسی خلافت کا قلع قمع کیا تھا۔

اہل خانقاہ

اہل سنت میں تین گروہ نظر آتے ہیں۔ علماء ربانیین، علماء متکلمین اور اہل خانقاہ۔ علماء ربانیین وہ ہیں جنہوں نے حدیث وفقہ کی حفاظت واشاعت کی ذمہ داری اعلانیہ اپنے سر لی۔ علماء متکلمین فلسفہ زدہ علماء ہیں جن میں معتزلین واشراقیین وغیرہ شامل ہیں۔ ابوالحسن اشعری (۹۲۵۔۵۵۸ء) نے معتزلہ سے اعتزال کر کے اشراقیین کی حمایت کی اور معتزلہ کے وقار کو ختم کیا۔ اہالیان خانقاہ گوشہ نشین کہلائے۔ ان کی گوشہ نشینی کا جواز مسلمانوں کی ابتدائی مکی زندگی سے مل سکتا ہے۔ خلوت وہجرت مکی زندگی کی خصوصیت ہے۔ اہل صفہ کی گوشہ نشینی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اکثر صحابہ نے گوشہ نشینی اختیار فرمائی تھی۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی حیات بھی اس کی

تصدیق کرتی ہے۔اس کے علاوہ گوشہ نشینی کی شہادت میں قرآن پاک سے قصہ اصحاب کہف پیش کیا جاسکتا ہے۔فتنہ وفساد سے بچنے اور ایمان کی سلامتی کی خاطر چند اصحاب نے غار کہف میں پناہ لی تھی اور ان کو اللہ رب العزت نے کرم خاص سے نوازا تھا۔اہالیان خانقاہ اگر چہ سیاست وحکومت سے بے تعلق تھے۔مگر حکومت نے انہیں بھی نشانہ بنالیا حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۳۶ھ، ۸۵۹ء) حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۔۹۵ھ، ۷۵۶۔۷۱۴ء) کے شاگرد تھے اور حکمت وفلسفہ کے ماہر تھے۔تعلیم صوفیہ کے یہی پہلے مبلغ مانے جاتے ہیں۔خلیفہ متوکل (۲۴۷۔۲۳۲ھ) نے بڑی ارادت کے ساتھ اپنے یہاں رکھا۔متوکل چونکہ اہل بیت سے بغض رکھتا تھا اس لئے جہاں اس نے شیعوں کو تہ تیغ کیا اور حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو سزادی وہاں احترام اہل بیت کے قصور پر حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ پر بھی (۲۴۰ھ، ۸۵۴ء) میں مقدمہ چلایا اور (۲۴۶ھ، ۸۶۰ء) میں سزا قتل دی۔

اس قسم کی زیادتیوں کو جائز قرار دینے کی وجہ سے علماء دربار اہل خانقاہ سے دست و گریباں ہو گئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ بعہد خلیفہ مستعین (۲۵۲۔۲۴۸ھ، ۸۶۶۔۸۶۲ء) (۲۵۰ھ، ۸۶۴ء) میں بغداد تصوف کا مرکز بن گیا۔پہلی مرتبہ اسی سال مسجد بغداد میں تصوف پر تقریر کی گئی اور بصورت حلقہ تعلیم باطن کی اعلانیہ اشاعت ہوئی۔ابھی تک ائمہ اربعہ میں سے کسی خاص مذہب کی پابندی ضروری نہ تھی۔اب حکومت نے مجبور کیا کہ ہر مسلمان کسی خاص امام کی پابندی کا اہتمام کرے۔تاکہ اسی مذہب کے مطابق اس کے معاملات طے کئے جایا کریں۔حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۹۷ھ، ۹۱۰ء) نے اس حکم پر احتجاج کیا کہ کتاب وسنت کے ماننے والے اس حکم کی تعمیل نہیں کرسکتے۔اس حکم سے فقہ کا دروازہ بند ہو جانے کا اندیشہ ہے اور یہ کہ اس طرح تقلید جامد ہو جائے گی۔اس پر انہیں سزادی گئی اور صوفیوں پر عتاب نازل ہوا۔خلیفہ معتمد نے حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ پر (۲۶۲ھ، ۸۷۵ء) میں اور حضرت الوحمزہ بغدادی پر (۲۶۹ھ، ۸۸۲ء) میں

مقدمات چلائے اور قاضیان بغداد نے دونوں کو بدترین سزائیں دیں۔ علماء نے دربار کی خوشنودی کے لئے فتوے دے کر صوفیوں کی مخالفت کی اور خلیفہ مقتدر نے منصور حلاج کو (۳۰۹ھ، ۹۲۲ء) میں دار پر چڑھایا۔ اپنی اپنی زبانوں میں خلیفہ متوکل سلطان سنجر سلجوقی امام غزالی اور امام رازی نے فلسفہ کے اثرات کو روکنے کی کوشش کی آخرکار خلیفہ مقتدیٰ کے عہد میں ایرانی النسل حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۴۴ھ، ۹۴۶ء) نے اس تعلیم کی بذریعہ تقریر اشاعت کی۔ ابو طالب مکی (متوفی ۳۸۶ھ، ۹۹۶ء) نے اپنی کتاب میں اس تعلیم کی جامعیت کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ خلیفہ مقتدیٰ کے عہد میں (۴۸۵۔ ۴۶۷ھ، ۱۰۹۵۔ ۱۰۷۴ء) امام الحرمین اور امام غزالی نے تصوف کی واضح طریقہ سے اشاعت فرمائی۔ حضرت امام غزالی نے اول اول جملہ جماعتوں کی تعلیمات کا مطالعہ کیا اور ان پر عبور حاصل کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان جماعتوں میں سے کوئی تو تقلید کی قائل ہے۔ کوئی اجتماع پر مبنی ہے اور کوئی قرآن وحدیث پر قائم ہے۔ لیکن اہل فلسفہ ان میں سے کسی کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد انہوں نے فلسفہ کی حقیقت پر بحث کی ہے کہ اس کے دو جزء ہیں۔ پہلا ریاضیات ہے اور دوسرا الٰہیات ہے۔ ریاضیات فطری اور یقینی ہے۔ جس سے کسی جماعت کو انکار نہیں مگر الٰہیت والا جزء چونکہ قیاسی ہے اور اس میں یقین کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ اس لئے ناقابل توجہ ہے اور یہ سب کچھ لکھنے کے بعد نتیجہ یہ نکالا ہے کہ فلسفہ کے مقابلہ میں حضرت جنید، شبلی اور بسطامی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے مشاہدات صحیح اور عملی ہونے کی وجہ سے یقین کی منزل میں پہنچاتے ہیں۔ لہٰذا تعلیم صوفیہ فلسفیات سے افضل و بالا ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد امام غزالی نے صوفیوں کی تعلیم کی سند قرآن وحدیث سے پیش کی ہے جس کی تردید مشکل ہے۔ خلیفہ مسترشد (۴۷ھ۔ ۵۲۵ھ) عابد و زاہد اور صوفی مشرب تھا۔ خلیفہ مستنجد (۵۶۶۔ ۵۲۵ھ) کے عہد میں حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ اور ابو النجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا۔ خلیفہ ناصر (۶۲۲۔ ۵۷۵ھ، ۱۲۲۵۔ ۱۱۷۹ء) کے عہد کی رونق

حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔ امام رازی، طبری اور ابن اثیر بھی اسی زمانہ میں تھے۔ خلیفہ مستنصر (۶۴۰ - ۶۲۲ھ) کے زمانہ میں شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیم کی اشاعت کی۔ عباسی معتصم (۶۵۶ - ۶۴۰ھ) کے وقت میں حضرت ابو الحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغ فرمائی۔ ان جملہ حضرات صوفیہ کے متعلق شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ کسی طرح بھی قرآن و حدیث سے ہٹے ہوئے تھے۔

وحدت الوجود

رسول مقبول ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سادہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ صفائی قلب کا خاص طور پر اہتمام فرماتے تھے۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے مدارج سے ثابت ہے کہ قرابت رسول شرف کا معیار تھی۔ جب فقہ میں دوئی واقع ہوئی تو سب سے پہلے ابو الہاشم نے صوفی کا لقب اختیار کیا اور تصوف کی تعلیم سب سے پہلے حضرت ذوالنون مصری نے تبلیغ فرمائی۔ اس وقت جب کہ باقاعدہ خانقاہیں وجود میں نہیں آئی تھیں، حضرت خواجہ حسن بصری مدرسہ میں ہی تصوف کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔ سب سے پہلے خارجیوں نے ان پر اعتراض کیا۔ معتزلہ علم باطن کے منکر تھے اور تشبیہ کے شبہہ پر عشق الٰہی کو غلط سمجھتے تھے۔ پھر خانقاہیں وجود میں آگئیں تو شیعوں نے خانقاہی زندگی کی اس لئے مخالفت کی کہ وہ ان کی مجرد رہبانیت سے مختلف تھی۔ اہل سنت اور شیعہ دونوں اہل بیت کی محبت کے مدعی ہیں۔ لیکن اہل بیت کی محبت کا مقصود دونوں کے یہاں مختلف ہے اور اسی لحاظ سے دونوں جماعتوں میں دیگر مسائل پر بھی اختلاف ہے تیسری صدی ہجری میں جب ارسطو کی تعلیم یہاں رائج ہوئی تو قرامطہ نے فلسفہ یونان سے اخذ کر کے فلسفہ وحدت الوجود کی اشاعت کی۔ یہ فلسفہ وحدت الوجود صوفیوں کی تعلیم وحدت الوجود سے جدا ہے اور دونوں کو ایک سمجھنا کھلی ہوئی غلطی ہے۔ اس کے متعلق علماء متکلمین کے مباحث بصیرت افروز ہیں اور صاف بتا رہے ہیں کہ مشاہدات صوفیہ قرامطیوں کی تعلیم کی طرح فلسفہ سے ماخوذ

نہیں ہیں۔ابن سینا (متوفی ۱۰۳۷ء) اور امام رازی (متوفی ۱۲۰۸ء) نے قرامطی یا یونانی وحدت الوجود کی تنقید کر کے اصلاح کی ہے۔اس سلسلہ میں تین جماعتیں وجود میں آئیں۔ اتحادیہ، اشراقیہ اور وصولیہ۔ابن سینا اور ابن عربی میں فلسفہ وحدت الوجود کے متعلق اختلاف ہے۔ ابن سبعین انائیہ کو تسلیم کرتا ہے اور تصور کا قائل تھا۔ ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) گاورزانی اور نابلسی اسامی وحدت الوجود کے مبلغین میں سے ہیں۔ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد فرغانی اور جیلی نے ''ہمہ اوست'' کی تفسیر بیان کی ہے۔یہ اصحاب ابن عربی سے متفق نہیں۔مگر امام غزالی کے مؤید ہیں۔امام غزالی (متوفی ۱۱۱۱ء، ۵۵۰ھ) نے اتحادیوں سے اختلاف کیا اور قرآن و حدیث سے استدلال کر کے اہل فلسفہ کے اصلاح شدہ وحدت الوجود کو تسلیم کیا۔ یہ فلسفہ وحدت الوجود علمی طور پر تیسری صدی ہجری کے آخر میں مقبول ہو چکا تھا۔اس کے متعلق اہل فلسفہ اور متکلمین میں اگرچہ علمی اختلاف پایا جاتا ہے۔لیکن خانقاہ کے عابدوں کے ذاتی مشاہدات کی ان سے اکثر خود بخود تائید ہو جاتی ہے۔اب مماثلت کی وجہ سے یہ مسئلہ کہ صوفیوں نے وحدت الوجود کو اہل فلسفہ سے مستعار لیا ہے، نزاعی بن گیا ہے اور مغالطہ پر مبنی ہے۔

مسلمان صوفیوں پر اغیار ہی اعتراض نہیں کرتے بلکہ خارجیوں، شیعوں اور معتزلیوں سے زیادہ اپنے بھی افکار مغرب کی تقلید سمجھتے ہیں کہ صوفیوں نے یونانیوں زرتشتیوں اور ویدانت سے اخذ کر کے بھان متی کا رشتہ جوڑا ہے۔لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ آخر ان مسلمان صوفیوں کے پاس گرہ بھی کچھ تھی یا نہیں۔انہوں نے قرآن سے کچھ اخذ کیا تھا یا نہیں اور تعلیم رسول سے مستفیض ہوئے تھے یا نہیں۔کیسی عبرت کی بات ہے بغیر اپنی اسلامی تعلیم کا علم رکھتے ہوئے مغربی معترضین کی تائید میں ہمارے نئے تعلیم یافتہ اپنے بزرگوں کو متجل اور سارق خیال کرتے ہیں۔

لفظ ُوجود ُ وجد اور موجود دونوں معنوں میں آتا ہے۔اگر وجد کے معنی لئے جائیں تو وجود وشہود ہم معنی ہو جاتے ہیں۔لیکن اگر وجود سے موجود کا مفہوم لیا جائے تو اہل شہود اور اہل

ظاہر ناک بھویں چڑھا لیتے ہیں۔ اہل ظاہر عقل سے وجدانی کیفیات کو نہیں پا سکتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے وجود و شہود کے فرق کو دور کرنے کی بہترین سعی کی ہے اور عقل و قلب میں سمجھوتہ کروانا چاہا ہے کہ "کفر شریعت دو دو معبود پنداشتن" اور "کفر حقیقت دو موجود دانستن" ہے۔ اور استدلال کیا ہے کہ "صور علمیہ ما متحقق اند و آن ہمہ علم ماست کہ بچندین رنگ آمدہ شبہہ نیست کہ ایں صور را عین علم نتوان گفت۔ زیرا کہ این تلونات را قیوم و منشأ بود"۔ (انفاس العارفین صفحہ ۸۲)۔

بہر حال کوئی وحدت الوجود کی تشریح اس طرح کر کے قطرہ دریا میں مل جاتا ہے کوئی کہے کہ لوہا آگ میں آگ کی خاصیت حاصل کر لیتا ہے۔ کوئی خیال کرے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے کوئی سمجھے کہ آفتاب کی روشنی میں چراغ جلتا ہے۔ یا کوئی ان سب کے درمیان فیصلہ کر کے راہ اوسط نکالے۔ لیکن یہ سب منطقی، علمی اور کنارے پر کی باتیں ہیں۔ کیونکہ وجدانی کیفیتیں حدود عقل سے ماوراء ہوتی ہیں اور حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا۔ تا نہ چشی، وجدان یا مذاق سلیم کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ اس کی تفسیر، تحریر و تقریر سے ناممکن ہے۔ اس کی حقیقت وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کیفیت میں مبتلا ہو۔ مگر ہر شخص کا مشاہدہ عرفان جدا ہوتا ہے۔ اور اس کا اظہار تشبیہ و استعارے سے بھی واضح نہیں ہوتا۔ وجود و شہود کی بحث محض کشود کے ذریعہ سمجھی جا سکتی ہے۔ یعنی کوئی کمر کمر دریا میں کھڑے ہو کر مہ لطف دریا کا مدعی ہے اور کوئی غوطہ لگانے سے پہلے حقیقت دریا سے سیراب نہیں ہوتا۔ اس طرح بقدر ہمت و ذوق دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ بعض مذہبی جماعتیں ایسی بھی ہیں جو توحید کو منجمد بناتی ہیں اور آثار توحید کو سمجھنے سے انکار کرتی ہیں۔ اب اگر حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اپنے کشف سے عالم کو غیر حق سمجھنے کے لئے حق کی ذات و صفات میں کلی و ظلی کی شرط لگاتے ہیں اور اہل وجود ایرانی ثنویت سے بے تعلق ہو کر عالم کو عین حق سمجھتے ہیں تو کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے۔

اسلامی وحدت الوجود

خواجہ حسن بصری (۱۱۰ھ/ ۷۲۷ء) کا اسم گرامی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے نام کے بعد آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ(1) سے بھی مستفیض تھے۔

خواجہ صاحب مفتی بصرہ تھے اور جید عالم اپنے عہد کے مستند محدث وفقیہ بھی تھے۔ ان کی تعلیم اسلامی اصول پر خالص قرآنی تھی۔ ان کے زمانہ میں ظاہری و باطنی ادب واخلاق میں اتحاد تھا اور صوفیوں کی خانقاہیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ ان کے مشاہدات وخیالات سے طمانیت وتسلیم ظاہر ہوتی ہے اور یہی تعلیم بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے دوسری صدی ہجری کے آخر تک کارفرما رہی ہے۔ چنانچہ رابعہ بصری (۱۳۵ھ/ ۷۵۳ء)، سفیان ثوری(2) (۱۶۱ء۔ ۹۷ھ/ ۷۷۸ء۔ ۷۱۶ء)، ابراہیم ادہم بلخی (۱۶۰ھ/ ۷۷۷ء)، ابو الہاشم (۱۶۰ھ/ ۷۷۷ء)، داؤد طائی (۱۶۴ھ/ ۷۸۱ء)، مالک بن دینار، فضل رخاشی، ریاہ بن عمر قیسی، صالح مری، عبدالواحد بن زید (۱۷۷ھ/ ۷۹۳ء)، فضیل بن عیاض (۱۸۹ھ/ ۸۰۳ء)، معروف کرخی (۱۹۹ھ/ ۸۱۳ء)، بشر بن حارث (۲۲۷ھ/ ۸۴۱ء)، ذوالنون مصری (۲۴۵ھ/ ۸۵۹ء)، اور سری سقطی (۲۵۳ھ/ ۸۱۳ء) رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ایک ہی تعلیم کے حامل ہیں۔ اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ابوالہاشم سے پہلے نہ یہ صاحبان صوفی کہلائے اور نہ ان کی تعلیم تصوف سے موسوم ہوئی۔ جب تیسری صدی ہجری میں یونانیوں کا فلسفہ وحدت الوجود رائج ہوا تو حضرت جنید وغیرہ پر اس فلسفہ سے متاثر ہونے کا شبہہ کیا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے مشاہدات وحدت الوجود یونان سے ماخوذ ہیں یا کتاب سنت پر عمل کرنے کا نتیجہ ہیں اور آیا صحابہ وتابعین وحدت الوجود کے قائل

1۔ حضرت امام جعفر صادق کا مزار ختن میں بتایا جاتا ہے۔ بحوالہ

The Ancient cenlral Asian Traets by Aurel stien Pagets.

2۔ تابعین کے بعد حاملان دین کی جماعت میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے ساتھ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی شامل ہے۔ انہوں نے کوفہ میں حدیث کی خدمت کی تھی اور مجتہد تسلیم کیے جاتے تھے۔

تھے یا نہیں؟ قرآن پاک کی جن آیات سے وحدت الوجود کا ثبوت بہم پہنچایا جاتا ہے۔ ان کا علم صحابہ کو زیادہ اور کامل ہونا چاہیے۔ اور ضرور ہے کہ ان کی تعمیل سے ان پر کیفیت بھی طاری ہوئی۔ حضرت علی، حضرت ابوموسیٰ اشعری، مغیرہ بن شعبہ، ابوذر غفاری اور حذیفہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے حالات سے کیفیت کی شہادت مل جاتی ہے۔ جملہ صحابہ و تابعین کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ دن کے غازی تھے اور رات کے نمازی۔ عبادت شب کے آثار اس کیفیت کی تائید کرتے ہیں۔ جب تک ان حضرات کے مشاہدات شریعت سے ہمعنان رہے اختلاف رونما نہیں ہوا۔ لیکن جب فلسفہ سے مقابلہ ہونے پر ظاہری دوئی کا تصور پیدا ہوا تو قصہ دار و رسن وجود میں آ گیا۔ اس سلسلہ میں اس مسئلہ کے متعلق متقدمین کے حالات پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جو میں جانتا ہوں اگر تم بھی جانتے ہوتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ''۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ ''بعض علم پوشیدہ ہیں جن کو عارفان الٰہی ہی جانتے ہیں''۔ تیسری حدیث یوں بھی ہے کہ ''ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو فضیلت ہے کہ زیادہ نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس راز کی وجہ سے ہے جو اس کے سینہ میں امانت ہے''۔

اس حدیث کی تفسیر واضح کر رہی ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ عبادت شب کے وقت اپنی کیفیت و محویت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے ہر طرح بتایا کہ میں صدیق کی بیٹی ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی ہوں۔ اس کے علاوہ حدیث حذیفہ رضی اللہ عنہ اس کیفیت کا برملا ثبوت ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں ہم ہوتے ہیں تو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور جب ان سے جدا ہو جاتے ہیں تو وہ نورانی کیفیت جاتی رہتی ہے۔ جب اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا تو جواب ملا کہ ''اگر یہ کیفیت مستقل ہو جائے تو تم انسانوں سے گزر کر فرشتوں میں شامل ہونے لگو۔ لہٰذا جتنی کیفیت طاری ہو جاتی ہے وہی

تمہارے لئے کافی ہے''۔

اب جب علمی و تاریخی حیثیت سے اس مسئلہ پر تنقید کی جاتی ہے تو وحدت الوجود بھی علوم حدیث، اصول فقہ، ضوابط عقائد اور قواعد کلام کی طرح بعد کی تفصیلوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس تحقیق کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں مگر ان سب کی اصل کو خالص اسلامی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیفیت وحدت الوجود کو اہمیت اس وقت دی گئی جب فلسفہ سے مقابلہ ہوا اور بحثیں چھڑیں۔ مسئلہ وحدت الوجود پر سب سے پہلے نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ اور فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے روشنی ڈالی۔ اس کے بعد حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جامع و مانع تشریح کی۔ مگر پھر بھی مسئلہ وحدت الوجود کے اختراع کا سہرا ابن عربی ہی کے سر باندھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد کلمہ پر ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (صٰفت: ۳۵) کے معنی کھلے ہوئے یہی ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں ہے۔ لیکن تفکر و تدبر کے ذریعہ یہ معنی نکلتے ہیں کہ سوائے اللہ کے نہ کوئی معبود ہے نہ کوئی مقصود ہے اور نہ کوئی موجود ہے۔ یہ وضاحت حقیقت مکمل تشریح ہونے کے باوجود مغالطے کا باعث بن گئی۔ صوفیوں کی کثیر تعداد خدا کی انفرادیت کیساتھ عالم کے وجود کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ یعنی عالم کو مظہر حق سمجھنے کے ساتھ عین حق بھی سمجھتی ہے۔ اور اس کے متعلق قرآن پاک خود شاہد ہے۔ موجودات خارجی ہوں یا باطنی، زبانی ہوں یا مکانی، سب کی حقیقت اللہ جل شانہ ہے، هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ (حدید: ۳) اور فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ: ۱۱۵) کی آیتوں سے وجود کے جملہ مراتب کی شہادت مل جاتی ہے اور كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (قصص: ۸۸) اور ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ (حج: ۶۲) سے تصدیق ہوتی ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اس کے علاوہ سب وہم و باطل ہے۔ پھر واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق حق سے ہے اور یہ کہ خدا کا مشاہدہ خارجی عالم اور انسانی ذات دونوں میں ہو سکتا ہے۔ انفس و آفاق خالق تعالیٰ جل مجدہ کی آیات، نشانیاں اور پتے

ہیں۔ اسی لئے وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ (بروج)، بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (حم سجدہ) اور ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ (حدید: ۴) ہے۔ لہٰذا لقائے رب یا حقیقت کا وجدان و عرفان ہی صوفیوں کا آخری مقصد ہے۔ جب یہی حقیقت ہے تو بندے کی صفت اس کے ہم فعل اور ہر اثر میں (بغیر تجزیہ و اقسام جیسے گلاب میں بو) ذات حق موجود ہے۔ گویا ان سب کا وجود عین حق تعالیٰ کا وجود ہو گیا۔ مٹھائیوں کے نام گنتے چلے جائیں ان کے انواع و اقسام ہزاروں تک پہنچیں گے۔ لیکن شرینی سب میں ملے گی۔ بس یہی وحدت الوجود ہے۔ وحدت الوجود کے یہ معنی سمجھنا کہ ہر شے بذات خدا ہے، کج فہمی کی دلیل ہے۔ بندہ بہر حال بندہ ہے اور درجہ کمال میں بندہ ہے۔ نوعیت اصل ہے اور تنوع اس کا مظاہرہ ہے۔ اب اصل اور مظاہرے کی وحدت ایک ہی ہوگی اور فرق کا باعث ہوگا جو خلاف فطرت ہے۔ اسی نظریہ کو توحید وجودی اور ''ہمہ اوست'' سے تعبیر و موسوم کیا گیا ہے۔ ''ہمہ اوست'' توحید صفاتی ہے اور ''ہمہ اوست'' کو توحید فعلی کہتے ہیں۔ حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ہمہ اوست'' یا وحدت الشہود کی تبلیغ فرمائی ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کشفی طور پر دعویٰ کیا کہ عالم غیر حق ہے اور اعلان کیا ہے کہ ابن عربی وغیرہ یعنی وجودی اپنے بیان میں سچے ہیں۔ مگر ان کا کشف صحیح نہیں ہے گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ نظریہ وحدت الوجود ایک کشفی غلطی ہے۔ لیکن ثبوت پیش کرتے ہوئے تشریح یوں فرمائی کہ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ وجود اللہ کی ذات کا عین نہیں ہے تو ان کی مراد وجود ظلی سے ہے نہ کہ وجود کلی سے گویا حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس طرح اللہ کی ذات اور وجود میں ایک ظل اور ایک اصل کے مدعی ہیں اور اسی طرح اللہ کی صفات میں بھی اصالت و ظلیت کے قائل ہیں۔ برخلاف ان کے وجودی جس وجود کو عین ذات مانتے ہیں۔ اس میں اصل و ظل کی شرط نہیں لگاتے اور یہ صفات کو غیر ذات سمجھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ وجودی ایرانی ثنویت سے صاف بچ گئے اور ان کی توحید بے غل و غش خالص ہے۔

کشفی ہونے کے علاوہ وحدت الوجود فلسفہ و کلام کا بھی ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ اور

اس کو دیگر مذاہب اور ارباب فکر میں بھی خاص اہمیت حاصل ہے(1)۔ اس وجودی نظریہ کی طرح کہ اللہ کے سوائے کچھ موجود نہیں ہے۔ ویدانت بھی مدعی ہے کہ برہمہ کے سوا باقی ہر شے مایا ہے۔ اس کے ویدانتی اصول اور وجودی نظریہ میں یکسانیت کا شبہہ ہوتا ہے۔ لیکن کائنات وموجودات کے متعلق دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ وجودی موجودات وعالم کو عین حق تسلیم کرتے ہیں اور اپنیشدون نے عالم کو ناپاک قرار دیا ہے۔ شری شنکراچاریہ نے بھی عالم کو شر اور مایا بتایا ہے۔ اور اس کو برہمہ سے علیحدہ ظاہر کیا ہے۔ بدھ مذہب بھی عالم کو نیست مطلق مانتا ہے۔ بہرحال ان سب کا تصور یہی ہے کہ عالم موجودات ناپاک، معدوم، فریب اور دھوکہ ہیں اور دکھ سے بھرے ہوئے ہیں اور حقیقت اعلیٰ غیر متغیر وساکن ہے۔ ان کے اس اصول کے مطابق حقیقت اعلیٰ کو حاصل کرنے کے لئے ترک حرکت، ترک حواس، ترک خواہشات ضروری ہے اور نجات کا ان کے یہاں یہی طریقہ ہے۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے یونانی فلسفی نو افلاطونی کہلائے۔ یہ بھی ایرانی اور اہل ہند کی طرح مادے کو روح کا غیر اور متضاد کہتے ہیں اور شر کا منبع سمجھتے ہیں۔ نجات کا طریقہ ان کے یہاں بھی ترک قیود ہے اور فنائے کامل ان کی بھی آخری منزل ہے۔ یہ یونانی فلسفی اگرچہ صفات کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن تنزلات اور عیان ثانیہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ عقیدہ تنزلات کی وجہ سے شبہہ کیا جاتا ہے کہ مسلمان صوفیوں نے یہ اصول ان سے ہی ماخوذ کیا ہے۔ لیکن اگر چشم حقیقت سے مطالعہ کیا جائے تو اعیان ثانیہ کی تفصیل دونوں کے یہاں مختلف ہے۔ بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہے۔ دونوں میں سوائے اصطلاح کے اور کوئی شے مشترک نہیں ہے۔

صوفیہ کے متعلق سلاسل

غرض وحدت الوجود کے مختلف قائلین کے مختلف معیاروں کو سمجھ لینے کے بعد اور یہ

1۔ اپنی تصنیف نقد اقبال میں حضرت میکش اکبر آبادی نے تحقیق وتدوین کے ساتھ عام فہم انداز میں واقفیت عامہ بہم پہنچائی ہے اور قابل دید ہے۔

ذہن نشین کر لینے کے بعد کہ مسلمان صوفی عالم کو عین حق سمجھتے ہیں اور باقی دوسری جماعتیں عالم موجودات میں کیڑے ڈالتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مسلمان صوفیوں نے دیکھا دیکھی اس اصول کو مختلف نظریوں سے مستعار لیا ہے محض دھاندلی کی بات ہے اور ناواقفیت کی علامت ہے۔ مقابلہ و تنقید کے بعد بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان صوفیوں کے مشاہدات تعلیم قرآن پر مبنی ہیں اور باہر سے ہرگز نہیں لئے گئے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے نصف میں اسلامی وحدت الوجود کی تعلیم مقبول ہو چکی تھی اور یونانی فلسفہ کے مباحث کے نتیجوں نے تعلیم صوفیہ کو عقلی و عملی طور پر بھی سمجھنے کا مواد فراہم کر دیا تھا۔ اس کے بعد صوفیوں میں مختلف سلسلے طریقے اور خانوادے اپنی اپنی کیفیات و مشاہدات کی بناء پر وجود میں آئے۔ ان مختلف سلسلوں کی تعلیم ان کے مختلف مشاہدات پر مبنی ہے نہ کہ منطق و فلسفہ کے اختلافوں پر۔ صوفیوں کے ان سلاسل کا اختلاف بنائے مخالفت آج تک نہیں بلکہ اشاعت اسلام کے حق میں رحمت ثابت ہوا۔ شیخ ابوالفضل نے چودہ خانوادے گنوائے ہیں۔ مگر ان سب میں حسب ذیل زیادہ اہمیت و شہرت رکھتے ہیں:

۱۔ چشتیہ:۔ ۳۲۹ھ/۹۳۲ء نظامیہ و صابریہ اس کی دو شاخیں ہیں۔

۲۔ قادریہ:۔ ۵۵۸ھ/۱۱۶۱ء شطاریہ اور نوشاہیہ پر مشتمل تھے۔

۳۔ رفاعیہ:۔ ۵۷۰ھ/۱۱۷۵ء

۴۔ سہروردیہ:۔ ۶۳۳ھ/۱۲۳۴ء فردوسیہ بھی اس کی شاخ ہے۔

۵۔ شاذلیہ:۔ ۶۵۳ھ/۱۲۵۶ء

۶۔ نقشبندیہ:۔ ۷۸۵ھ/۱۳۸۹ء اس کی بھی دو شاخیں ہیں۔ ایک مجددیہ ہے۔

صوفیہ اور سلاطین کے تعلقات

سلسلہ چشتیہ کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیازی شان یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلامی تعلیم کی تنظیم و تبلیغ کی بنیاد ہندوستان میں اسی کے ذریعہ ہوئی کہ اس زمانہ میں قرآنی علوم کی پوری قوت کے ساتھ چھان بین کی جا چکی تھی۔ حدیثوں کی تنقیح ہو چکی تھی۔ فقہ کے

اصول ضبط کر لئے گئے تھے۔ اور دماغی ورزشوں کے لئے عقلی وادبی علوم کے دروازے کھل چکے تھے لہٰذا ہندوستان میں چشتیوں نے سارا زور عمل واخلاص پر صرف کیا۔ یہی ان کی تعلیم کا لب لباب ہے اور یہی ان کی بالغ نظری کا ثبوت ہے۔ جس کی وجہ سے ولایت ہند کی روحانی تربیت ان کے سپرد ہوئی۔

تاریخی پس منظر کے لحاظ سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ہندوستان میں خرابی مسلمانوں کے نظام سلطنت میں ظہور پذیر ہوئی یا نظام چشتیہ میں؟ یہ سوال پہلی نظر میں فضول سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر امتثال امر کے طور پر پھر بھی غور طلب ہے۔ یہاں ہندوستان میں اگرچہ ان دونوں نظاموں کی ابتدا تقریباً ایک ہی ساتھ ہوئی ہے لیکن یہ دونوں لازم وملزوم نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے سے جدا اور متفرق ہیں اور یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ایک کی خرابی دوسرے کی خرابی پر اثر انداز ہوئی یا اس کا باعث بنی۔ پھر یہ امر بھی چیستاں ہے کہ خرابی کی ذمہ داری سلاطین پر عائد ہوتی ہے یا مشائخ پر یا دونوں پر۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے دونوں کے تعلقات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تعلقات کے متعلق بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ مشائخ چشتیہ سلاطین سے ہر حال میں بے تعلق رہے۔ اور ان کی خانقاہیں حکومت کی مرہون منت نہیں تھیں۔ البتہ سلاطین نے اپنے ماحول کے مطابق کبھی مشائخ کے قدم لئے اور کبھی ان پر ستم ڈھائے۔ ان میں بھی مشائخ کی بے نیازی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا سلطنت اور سوسائٹی کی تباہیوں کا سہرا سلاطین ہی کے سر پر راس آتا ہے۔ کیونکہ سلطنت اور سوسائٹی کی فلاح میں ان ہی کی بہتری تھی۔ مشائخ کے فرائض میں خدمت خلق ہے۔ لیکن اپنی کوشش کے نتائج سے مشائخ بے نیاز رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ راضی برضا ہونے کے مدعی ہیں اور سیاسی قلابازیوں سے بے تعلق رہے ہیں۔ اب اگر ان دونوں نظاموں کو اپنی اپنی خرابی کا ذمہ دار بنایا جائے اور ایک کی خطاؤں کا بار دوسرے پر نہ ڈالا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اگر سلطنت صوفیوں کی معتقد ہو کر اپنے کام کو چھوڑ بیٹھے تو یہ قصور سلطنت کا ہے نہ کہ خانقاہ کا۔ اگر صوفی کسی سلطان کے فریب میں پھنس کر اپنے مرکز سے ہٹ گئے تو یہ خطا ان صوفیوں

کی ہے۔

سلاطین و مشائخ کے مرکزوں کی تبدیلیاں بھی اس سوال کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتیں۔ مشائخ نے اپنے مرکز کی تبدیلیاں یا تو خود اپنے مقصد کے لئے اپنی خوشی سے کی ہیں۔ یا سلاطین کے جبر و ظلم سے مجبور ہو کر انہیں اپنی جگہ بدلنی پڑی ہے۔ تاکہ اشاعت دین میں فرق نہ آنے پائے۔ ان دونوں صورتوں سے مشائخ کی زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لئے تبدیلی مقام کو ان کی خرابیوں یا موت سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ برخلاف اس کے سلاطین کے مرکز کی تبدیلیوں سے دو حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے سلطنت میں فتور واقع ہوا اور دوسرے یہ کہ نئے مرکز اپنی غرض و مصلحت سے بنائے۔ مگر ان نئے مرکزوں کا مطالعہ اکثر یہی ظاہر کرے گا کہ وہیں بنائے گئے جہاں مشائخ نے میدان تیار کر دیا تھا۔ محمد بن تغلق نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ خود اپنا مرکز دہلی سے دکن میں منتقل کرنا چاہا مگر وہ ناکام ہوا۔ اس نے اس وقت علماء و مشائخ پر جو ستم کیے ان کو تاریخ بھلا نہیں سکتی۔ بہر حال بعد میں جب دکن کو مشائخ نے اپنا مرکز بنایا تو وہاں بہار آگئی۔ تاریخ اس حقیقت پر بھی پردہ نہیں ڈال سکتی۔ ان دلائل کے بعد یہ دلیل کہ بعض مشائخ کی اولاد جبر یا طمع کی وجہ سے حکومت کا آلہ کار بن گئی تھی، تعلیم چشتیہ کی خرابی کا باعث قرار نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے کہ مشائخ کے یہاں سلاطین کی طرح وراثت نہیں چلا کرتی۔ اپنی گمراہیوں اور نافرمانیوں کی وجہ پسر نوح خاندان نبوت کو چھوڑ بیٹھا لیکن تعلیم نوح علیہ السلام میں کوئی ضعف نہیں آیا۔ بلکہ اور زیادہ پروان چڑھی۔ علاوہ بریں اگر محمد بن تغلق کی لغویات میں بابا فرید گنج شکر کی اولاد کا مبتلا ہو جانا ثابت کیا جاتا ہے تو بہتان عظیم ہے۔ ظاہر ہے کہ محمد بن تغلق حضرت علاء الدین موج دریا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے سر تسلیم خم کیا کرتا تھا۔ اور نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی داد و ہش سے حضرت علاء الدین موج دریا بے نیاز رہے۔ بلکہ قبول نہ کر کے اس پر احسان ہی کیا۔ ان کی اولاد میں سے کوئی صاحبزادے محمد بن تغلق کی فوج میں شریک ہو کر جنگ میں شہید ہوئے تو اس کو طمع سیم و زر کہنا مشکل ہے۔ شوق جہاد ان

کی شرکت کا باعث کیوں نہیں خیال کیا جاتا۔

قصہ مختصر اس کے بجائے اگر "ہر کمالے را زوالے" کے اصول پر دونوں نظاموں کی خرابیوں پر علیحدہ علیحدہ بحث کی جائے تو زیادہ مناسب و نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان سلاطین ہند نے اسلام کے نام سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ورنہ وہ اپنے اعمال و حرکات کے لحاظ سے اسلام کے نام سے بہت دور تھے۔ ان کی قربانیاں ان کے حالات و واقعات میں نمایاں ہیں۔ پابند مذہب نہ ہونے اور تعیش و نفسانیت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے انہیں سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑے اور عمر طبعی سے پہلے سیل فنا انہیں بہا لے گیا۔ اب اگر سلسلہ چشتیہ پر غور کیا جائے تو یہ سلسلہ اپنی تاریخ اور فطرت کے لحاظ سے یقیناً اسلام کی فطرت اور تاریخ کا آئینہ ہے۔ تاریخ اسلام بتاتی ہے کہ مصلح اسی وقت نمودار ہوا جب کہ رخنوں اور فتنوں نے سر اٹھایا۔ اپنے عہد میں جملہ قسم کے فتنوں کا انسداد کر کے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طرف فطرت انسانی کی کمزوریوں کو ظاہر کر دیا اور دوسری طرف بہ حسن و بخوبی ان نقائص کا علاج سکھا دیا۔ جس کی منطق و فلسفہ کو ہوا بھی نہیں لگی۔ راز فطرت میں چوں و چرا کو دخل نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خود غلہ میں کٹورا رکھوا کر اپنے بھائی کو ملزم گردانا اور بجائے حوالات پہنچانے کے اپنا مہمان بنایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے پر آمادہ کیا مگر ان کے بجائے ذبح کی گئی گوسفند بہشتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چوں و چرا کی وجہ سے حضرت خضر علیہ السلام سے جدائی اختیار کرنا پڑی۔ ان حقیقتوں کی تاویل جس طرح بھی کی جائے مگر حقیقت ممنون تاویل نہیں۔ ہندوستان میں نظام چشتیہ کے معمار اول حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے اصولوں کو اگر سلاطین ہند سمجھنے کی کوشش کرتے تو جہاں داری کے انداز انہیں خود بخود حاصل ہو جاتے۔ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے نئی فضا اور نئے ماحول میں اپنے اخلاق و سلوک سے قلوب کو صرف مسخر ہی نہیں کیا بلکہ پہلے سے آئے ہوئے مسلمانوں کو بھی، جو اپنی خودی و حقیقت کے متعلق یہاں کی عجیب و غریب دنیا میں پس و پیش کر رہے تھے، راہ دکھائی اور

اپنے عمل سے بصیرت عطا کی۔ نظام اسلام کے تنزل کے جو اسباب نظام چشتیہ کے انحطاط کے بھی ہوئے ہیں جن کو حکومت کی موافقت یا مخالفت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اپنے نبی کی ذہنیت کے مطابق امت مسلمہ کی ذہنیت بھی علم و حکمت کی علمبر دار ہے۔ جب اہل اسلام اپنے علم و حکمت سے ہٹ کر اوہام و شکوک میں مبتلا ہو گئے تو روح اسلام جاتی رہی اور یقین کا راستہ چھوٹ گیا۔ اسی طرح سلطنتوں کی تباہیوں کے بعد شکستہ دلوں کی ڈھارس بندھاتے جب مشائخ نے تباہ شدہ سلاطین کی وجاہت و نمائش کی نقالی کر کے بادشاہی اختیار کر لی تو روح غائب ہو گئی اور ظاہری نمائش ہی داخل سلوک ہو گئی۔ اہل چشت کی خانقاہیں جب تک غربت و امارت کا سنگم بنی رہیں جب ان میں امارت کی شان جھلک مارنے لگی تو مسمار ہو گئیں۔ چنانچہ نظام چشتیہ کا بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہی حشر کیا جا سکتا ہے جو نظام سلطنت کا ہوا تھا۔ عجیب تماشا ہے کہ طریق معرفت میں جب اول اول ظاہری علم و مصلحت نے دراندازی کی تو اہل معرفت نے خانقاہ نشینی اختیار کی۔ اب جب خانقاہ نشین اپنی حقیقت سے گزر کر نمائشی اخلاق برتنے لگے تو حقیقت شناسوں نے خانقاہوں کو بھی سلام کر لیا اور صحرائے گمنامی میں روپوش ہو گئے۔ بہر حال خرابیوں کے اسباب تشخیص کر لینے کے بعد یہ سوال کہ کونسا نظام پہلے تباہ ہوا مہمل ٹھہرتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو فخر قوم تذکرہ نویسوں کے بیانات ہمارے سامنے ہیں۔ جن کو پیش کرنا ضروری ہے۔

جناب محمد اکرام صاحب آئی۔ سی۔ ایس نے اپنی تالیف ''آب کوثر'' میں نہایت وثوق سے لکھا ہے کہ ''اس میں شک نہیں کہ بعض شاہان اسلام نے اسلامی اصول کی قدر کی۔ لیکن مذہب اسلام اور اسلامی علوم سلاطین کی وجہ سے قائم نہ تھے۔ بلکہ ان لوگوں کے دم سے قائم تھے جو روحانی تسکین اور خالق باری تعالٰی کی رضا جوئی کو اپنی کوششوں کا صلہ سمجھتے تھے۔''

اس کے برعکس ''تاریخ مشائخ چشت'' کے مؤلف جناب خلیق احمد نظامی صاحب نے جو خیال ظاہر کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ''نظام حکومت میں خرابی آنے سے نظام چشتیہ میں خرابی واقع ہوئی۔ کیونکہ صوفی سوسائٹی کے اخلاق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اور سوسائٹی

کے انتشار سے حکومت میں تزلزل پیدا ہوا کرتا ہے"۔ یہ عجیب وغریب دلیل ایک طرفہ ہوگئی۔ حقیقت واقعی یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ پہلی نظر میں بتاتا ہے کہ جب سلاطین کی ناکردنیوں کی وجہ سے سوسائٹی میں انتشار پیدا ہوا اور مردنی چھائی تو مشائخ نے ہی مایوس قلوب کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ڈھارس بندھائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسد میں مبتلا ہو کر سلاطین آستینیں چڑھانے کے بعد مشائخ سے دست وگریبان ہوگئے۔ ان ملاحظات کے بعد کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔

البتہ تاریخ ایک اور صرف ایک سبق سکھاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے اجمیر کو مرکز بنانے کے بعد سب سے پہلے خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی میں اور سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کو ناگور میں تبلیغ کے لئے متعین کیا۔ دہلی اور ناگور کے دونوں مرکزوں نے اجمیر کا نام روشن کیا اور اجمیری تعلیم سے ہر کہ ومہ کو مزین کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ بے غرض رہ کر حکومتوں کے لئے بھی آسانیاں بہم پہنچائیں۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ خیال کہ حکومت کے اثرات سے بچنے کے لئے انہوں نے دہلی چھوڑ دی اور پاک پتن جا کر اپنا مرکز بنایا، ایک طفلانہ تخیل ہے۔ شمال میں تبلیغ کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پاک پتن کو مرکز بنایا اور ان کی تبلیغ واشاعت سے شمالی ہندوستان کی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ بایں ہمہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ حکومت والوں نے پاک پتن میں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور دہلی سے وہاں پہنچ کر بقدر ذوق اکتساب فیض کیا۔ مگر وہ خاندانی دستور کے مطابق حکومت والوں سے بے نیاز ہی رہے۔ اب غور کیا کہ تبدیلی مرکز کیوں وجود میں آئی۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ جب دہلی میں سلاطین کی وجہ سے خرابی واقع ہوئی اور اصلاح کی ضرورت سمجھی گئی تو ایسے نازک موقع پر بغیر کسی خوف کے انہوں نے اپنے محبوب خلیفہ سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کو اس وصیت کے ساتھ کہ "بروو ہند بگیر" دہلی بھیج دیا۔ اور اس

لئے بھیجا کہ برائیوں اور زیادتیوں کا انسداد کر کے حکومت کی اصلاح کریں۔ چنانچہ واقعات سے حضرت محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کامیابی ثابت ہوتی ہے۔ حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ساتھ خاندانی تبرکات کو دفن کرنے کی وصیت فرمائی۔ اس کا کبھی بھی یہ مفہوم نہیں لیا جا سکتا کہ ان کے خلفاء میں کوئی اہل نہیں تھا۔ اور نظام چشتیہ میں خلل پڑ گیا تھا۔ اگر اس قسم کا کوئی شبہ کرے کہ سلاطین حضرات چشت سے نبرد آزما ہو گئے تھے تو حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ سید محمد حسینی گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے کارنامے تردید کرنے کو آج بھی تیار ہیں۔ اسی طرح سلطنت مغلیہ کے خاتمہ پر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں تعلیم تصوف کے ضعیف ہو جانے کا تصور جمانا تاریخی حقیقتوں کی تردید ہے۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پاک پتن سے جو شمالی ہند کی اصلاح کی وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ پھر محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب دہلی تشریف لائے تو خلجی سلطنت اپنے عروج پر اپنے آپے سے باہر تھی اور یہاں نیچے سے لے کر اوپر تک بے شمار جھوٹے الٰہ پراجمائے بیٹھے تھے۔ قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے قدم اول پر مخالفت کی۔ ''ہنوز دہلی دور است'' کی ضرب المثل جس کی حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے عہد کی پوری تاریخ یاد دلانے کو کافی ہے۔ خلجیوں کے بعد خاندان تغلق برسر اقتدار آیا۔ سلطان اول غیاث الدین تغلق نے حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت پر کمر باندھی۔ لیکن وہ شیخ کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت ہند گیری پر عمل کرنے میں برابر منہمک رہے۔ آخر کار دہلی کی جامع مسجد میں ان کے خلاف زبردستی مسئلہ سماع کے متعلق محضر طلب کیا گیا۔ اس مباحثہ میں جو برتاؤ کیا گیا اور جس تہذیب وعلمیت کا اظہار کیا گیا وہ خود حضرت محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا درد دل اسی وقت حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ، محی الدین کاشانی رحمۃ اللہ علیہ اور ضیاء الدین برنی سے بیان کیا تھا اور برنی نے اسے لفظ بہ لفظ محفوظ کر لیا تھا۔ ان سلطنتوں کی تباہیوں کی توجیہ اہل تاریخ جس طرح چاہیں کریں۔ مگر سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان اپنی جگہ مستقل ہے

فرماتے ہیں:

’’ایں چہ روزگار است...... دران شہرے کہ ایں چنین مکابرہ کنند چہ گونہ آبادان باشند۔ عجب است کہ خشت خشت نہ شود...... چہ گونہ اعتقاد بر احادیث رسول اللہ ﷺ راسخ ماند...... ازان وقت باز ایشان روایت کردن حدیث منع کردند۔ من ترسانم کہ شومت میں چنین بد اعتقادی بر علماء شہر معائنہ شد۔ از آسمان بلا وجلا وقحط ووبا بر شہر خواہد بارید۔

چنانچہ ایسا ہی ہو کر رہا۔ حضرت محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال غیاث الدین تغلق کے انتقال کے کچھ دن بعد ہوا۔ اسکے بعد محمد بن تغلق وارث تخت ہوا۔ باوجود عالم و فاضل، مدبر و منتظم اور ذہین وطباع ہونے کے وہ اپنے طریق کار کی وجہ سے ناکام رہا۔ اس نے حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سختیاں اور بے ادبیاں کیں۔ اور اہل تاریخ نے آنکھیں کھول کر ملاحظہ فرمالیں کہ اس کی اصلاحی جدتوں کی وجہ سے وہ تمام آفتیں آئیں جن کے متعلق محبوب الٰہی صاحب نے ارشاد کیا تھا۔ بلا وجلا اور قحط ووبا کی وجہ سے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ مگر سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کی ہندگیری کی کوشش کی وجہ علانیہ کامیاب ہوئی۔ جسکی تفصیل ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھی ہے۔ ’’در دہلی شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، امیر خسرو، شیخ علاء الحق، در بنگال شیخ وجیہ الدین یوسف، در چندیری شیخ یعقوب و شیخ کمال، در مالوہ غیاث الدین، در دربار مولانا مغیث، در اجین شیخ حسام، در گجرات شیخ برہان اللہ غریب و شیخ منتخب و خواجہ حسن در دکن، محبوب الٰہی کے نیر تاباں کی روح پرور جان آفرین شعاع تھے۔ جنہوں نے ہندوستان بھر میں روشنی پھیلادی‘‘۔ فیروز شاہ تغلق اپنے عہد کی حالت لکھتے ہوئے خود لکھتا ہے کہ تمام ملک میں خلاف شرع رسوم رائج ہوگئی تھیں۔ رکن الدین نے مہدیت کا دعویٰ کیا۔ اور احمد بہاری خدائی کا مدعی بنا۔ ایسے ماحول میں جب کہ ظلم وستم اور بے اصولی کی انتہا تھی۔ حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندانی تبرکات کو اپنے ساتھ دفن کروالینا برہنائے ادب واحتیاط اور بس۔

ان واقعات کی حقیقت پر روشنی پڑ جانے کے بعد نظام چشتیہ میں خرابی پیدا ہو جانے کا

اتہام بے بنیاد ٹھہر جاتا ہے۔ برخلاف اس کے تاریخ علانیہ بتارہی ہے کہ حکومت کے بگڑ جانے پر دہلی کی مرکزیت سے زیادہ شاندار اشاعت اسلام احمد آباد، جونپور، بنگال، مالوہ، گجرات، احمد نگر اور دکن کے مرکزوں سے ہوئی۔ حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے دکن میں جو کارہائے نمایاں کئے وہ بے آنکھ والے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ سلطنت دہلی کی مرکزیت ختم ہو جانے کے بعد اسلامی تہذیب وتبلیغ کو جو فائدہ پہنچا اسے لامرکزیت نہیں کہا جاسکتا۔

تاریخ مشائخ چشت کے تعارف میں میرے فاضل ومحترم دوست جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب نے ہندوستان میں تصوف کے انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروزشاہی کی غیر شائع شدہ (اور غالباً غیر مقبول کتاب ''فتاویٰ جہانداری'') کے اقتباسات سے کچھ نتائج اخذ کئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک یہ ہے کہ ''برنی نے رسول خدا اور خلفاء کی روایات ومعمولات کو یہ کہہ کر برطرف کردیا کہ یہ اصول اس دور کی یادگار ہیں جو محض وقتی تھا۔ جس کا دوبارہ ظہور میں آنا اس لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک مثالی چیز تھے اور تبدیل شدہ حالات میں ان کے حصول کی کوشش بے سود ہے۔ نبی کریم ﷺ پر وحی آتی تھی اور خلفاء راشدین کو انہوں نے تربیت دی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ جو واقعات گزر گئے ان کی تکرار ناممکن ہے''۔

اگرچہ اس اقتباس کا سیاق وسباق نہیں معلوم۔ لیکن یہ خیالات ونتائج ہر چند سیاست و جہانداری کے ہی متعلق کیوں نہ ہوں، کچھ عجیب سے ہیں۔ اللہ ایسے خیالات سے بچائے۔ وہ اسلامی اصولوں کو مثالی ونمونہ سمجھنے کے باوجود بدلے ہوئے حالات میں تبدیلی کے قابل سمجھنا۔ اس قسم کی ترمیم زمانی ومکانی اصولوں میں تو ممکن ہوسکتی ہے۔ لیکن اسلام کا تمدن تدین پر منحصر ہے۔ اس میں سلوک انبیاء و اصفیاء کے مطابق اجتہاد کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن اصل حقیقت سے ہٹ جانا کبھی بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ برنی اپنے وسیع علم کے ذریعہ سے جن نتائج پر پہنچا ہے وہ مغالطوں پر مبنی ہے۔ اور ان سے یقیناً یہ ظاہر ہوتا ہے

کہ وہ مذہب کو سیاست اور جہانداری کا تابع مہمل سمجھتا ہے۔ برنی کی درباداری اور بادشاہوں کی خوشامد تدین سے گریز کرنے کی اسے اجازت دیتی ہے۔ وہ خود اقرار کرتا ہے۔ کہ مجھ جیسے بے دیانت و بے دین نے برسوں ہاں میں ہاں ملائی ہے اور طمع و حرص دنیا سے مجبور ہو کر ہم احکام دین کے خلاف ان کی مدد کرنے لگے۔ اور روایت ہائے مجہول بیان کرتے تھے۔ اس اقرار صالح کے بعد اس کی ثقاہت قابل اعتبار نہیں رہتی۔ لہٰذا برنی نہ قابل ذکر ہے اور نہ لائق سند۔ لیکن اگر برنی اپنے علم کو تدین کے ساتھ استعمال کرتا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح ان حقائق کو سمجھتے ہوئے شیخ کبیر کی ''ہند گیری'' والی وصیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی سلطنت و حکومت برباد ہو گئی۔ اور تعلیم چشتیہ کو فروغ ہو گیا۔ اسی غرض کے لئے محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی بھیجا گیا تھا اور تاریخ ان دونوں کی شہادت پیش کر رہی ہے۔

سیدوں اور لودھیوں کے عہد میں تعلیم تصوف جاری رہی۔ تعلیم تصوف کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں ویدانت اور تصوف میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ تحریک فضول ہی سہی۔ لیکن تصوف کی تائید اس سے ہو جاتی ہے۔ اس تحریک کا بانی رامانج تھا۔ اس کی دو شاخیں ہو گئیں جو کبیر پنتھی اور داؤد پنتھلی کہلائیں۔ کبیر کو شیخ بھیکا چشتی اور شیخ تقی سہروردی کی خلافت حاصل تھی۔ اس کے عرصہ دراز کے بعد اس قسم کی کوشش گرونانک نے بھی کی ہے۔ سکھ ازم کا منشا تھا کہ برہمنوں کی آقائیت سے بچ کر اپنی قوم کو اسلام کی مساوات سے علیحدہ کیا جائے۔ لیکن یہ ستم ظریفی قابل ملاحظہ ہے کہ سکھ قوم برہمنوں کا کلمہ پڑھ رہی ہے۔ اور مسلمانوں سے دوری رکھنے لگی ہے۔

شیر شاہیوں کے عہد میں شاید سلیم شاہ سوری نے تعلیم تصوف کی مخالفت کی تھی۔ مگر صوفیوں کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ مغلوں کے زمانہ میں شیخ محمد گوالیاری نے سلسلہ شطاریہ کی اشاعت کی اور شیخ احمد ردولوی نے سلسلہ چشتیہ صابریہ کو فروغ دیا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے خلفاء میں ہمایوں بادشاہ، حضرت جلال تھانیسری اور شیخ عبدالاحد صاحب کے اسمائے

گرامی شامل ہیں۔ شیخ عبدالاحد حضرت مجدد صاحب سرہندی کے والد ماجد تھے۔ اکبر کے
اتحاد کو مورخین کتنی ہی اہمیت دیں۔ لیکن وہ دروں خانہ کا معاملہ تھا۔ ملک وسلطنت کے عقائد
پر دربار کی چہ میگوئیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگر چہ مشرق کی طرف بہار و بنگال میں اور شمالی و
مغربی سرحدوں پر شاکیوں اور باغیوں نے ان چہ میگوئیوں کو اپنی سیاسی اغراض کے لئے
استعمال کیا۔ اور نتیجہ میں ان کو شکست ہوئی۔ پھر علماء سوء کے اثرات بے معنی ہو کر آخر فنا
ہو گئے۔ ۱۵۸۰ء میں جب اکبر نے خلیفۃ اللہ کا لقب اختیار کرنا چاہا تو جون پور کے قاضی
القضاۃ ملا محمد یزدی نے اعلانیہ مخالفت کی جس کی وجہ سے ان کو سزائے قتل دی گئی۔ حدود
دربار میں قطب الدین خاں کوکہ (1) اور شہباز خاں کمبوہ نے بڑی جرأت کے ساتھ اپنے
ولی نعمت کو سمجھا بجھا کر اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اکبر کے زمانے میں اسلامی
علوم کا گہوارہ گجرات تھا۔ عہد اکبری میں حضرت جلال تھانیسری، شیخ سلیم چشتی، ان کے
خلیفہ شیخ فتح الدین ترین سنبھلی، ملا عبدالقادر بدایونی (2)، شاہ محمد عبدالحق محدث دہلوی اور
محب اللہ اکبرالہ آبادی نے ظلمت کی گھٹاؤں میں حق کو نمایاں کر کے دکھا دیا۔

مجدد اور محدث کی حق نمائیوں نے اسلام کی بہترین خدمت کی ہے۔ لیکن اکبری دربار
ان سے مستفیض نہیں ہوا ہے۔ علماء دربار اپنی خود غرضیوں میں سرشار تھے۔ اور اکبر کے گمراہ
کرنے میں ان کا مفاد تھا۔ ورنہ اکبر موت سے پہلے اپنے خیالات سے توبہ کر لیتا۔

جہانگیر اور مجدد صاحب سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مختلف بے سروپا روایتیں مشہور
ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جہانگیر نے مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک
مکتوب پر جس میں انہوں نے اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل لکھا تھا۔
اس سے باز پرس کی تھی۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اگر چہ تاویل کر دی مگر عوام
کے عقائد میں رخنہ پڑ جانے کے اندیشہ کی وجہ سے نظر بند کر دیئے گئے۔ اس نظر بندی میں

1۔ حضرت شیخ سلیم چشتی کے یہ نواسے ہیں۔ جہانگیر کے دودھ شریکی بھائی ہیں اور میرے مورث اعلیٰ ہیں۔
2۔ باوجود قادریہ سلسلہ میں بیعت رکھنے کے ملا عبدالقادر بدایونی حضرت ترین کے بھی مرید اور شاگرد ہیں اور ان
کی زیارت کے لئے اکثر سنبھل جایا کرتے تھے۔

ہر ممکن طریقہ سے ان کا ادب ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بند کرنے پر جہانگیر نے عقیدت کے ساتھ عطیات ونذرانے بھی پیش کیے ہیں۔ اب رہا سجدہ تعظیمی پر اعتراض تو وہ رسم پہلے سے چلی آرہی تھی۔ اگر ان روایتوں سے معتقدان مجدد صاحب جہانگیر سے سیاسی اختلاف کو تقویت پہنچانا چاہتے ہیں تو سیاسی معاملات کو معتقدات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ بقیہ روایتیں جو مشہور ہیں وہ محقق بھی نہیں ہیں اور محض یار لوگوں کے حاشیے ہیں۔ داراشکوہ حضرت میاں میر کے خلیفہ ملا بدخشانی کا سلسلہ قادریہ میں مرید تھا۔ اس کا ذوق تصوف اس کی تصانیف سفینۃ الاولیاء اور مجمع البحرین وغیرہ سے ظاہر و ثابت ہوتا ہے اور یہی ذوق وراثت سے محروم کیے جانے کا باعث ٹھہرا۔ اورنگ زیب نے بہترین مذہبی خدمات کیں۔ تقریباً ۲۷ سال دکن کی معرکہ آرائی میں صرف کیے۔ سلطنت کو صاحبزادوں میں تقسیم کیا۔ ۱۷۰۷ء میں بمقام دکن اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد سلطنت مغلیہ بازیچہ بن کر آخر کار انگریزوں کے ہاتھ پہنچ گئی۔ اس عرصہ میں بھی صوفیوں نے اپنے نبی کا کلمہ پڑھوایا ہے۔ اب یہ قیاس کہ اسلامی سلطنتوں کے ختم ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے ذہنی و دماغی جوہر اور اخلاقی اوصاف قطعی زائل ہو گئے۔ محض مؤرخانہ وہم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں سلطنت مرض الموت میں مبتلا تھی۔ اور سوسائٹی میں بدنظمی وابتری پیدا ہوگئی تھی مگر باایں ہمہ مذہبی تبلیغ کی کامیابیاں ہر جگہ نمایاں ہیں۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، کلیم اللہ جہاں آبادی، نظام الدین اورنگ آبادی، شاہ فخر الدین، مرزا مظہر جان جاناں کالے صاحب، سید نور اللہ، شاہ نور محمد، جمال الدین رام پوری، علمائے بریلی وبدایوں، اصحاب مارہرہ اور شاہ بھیک صاحبان کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد انیسویں صدی میں مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور علمی انحطاط کی کوئی حد نہیں رہی اور مغربی تعلیم کے اثرات کی وجہ سے مذہب وآخرت کا تصور بھی موہوم سا ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس دور میں بھی خواجہ محمد سلیمان تونسوی، شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی، غوث علی شاہ قلندر پانی پتی، حاجی وارث علی شاہ، حاجی محمد شیر میاں، مولانا عبدالقادر

بدایونی نے اپنی ناخدائی ثابت کر کے دکھا دی۔ لیکن اب ہم اپنی اس بیسویں صدی کے متعلق کیا عرض کریں۔ مذہب سے دوری ہے۔ مسلمانوں میں اتحاد مفقود ہے۔ شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا ہے۔ اور بظاہر روحانیت عنقا بن گئی ہے۔ اس زبوں حالت اور کمی استعداد کا جس قدر بھی مرثیہ پڑھا جائے کم ہے۔ لیکن پھر بھی ایسے حضرات موجود ہیں جو اپنی گمنامی وگوشہ نشینی میں ڈھارس بندھائے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فضا مسموم ہے۔ عقائد کمزور ہو گئے ہیں۔ اور یقین کا کہیں پتا نہیں۔ لیکن ملکی قومی اور مذہبی آزادیوں کے ہنگاموں میں روحانیت کا کلمہ پڑھنے والوں کی آوازیں خواہ کیسی ہی بے سری کیوں نہ ہوں۔ مختلف سمتوں سے اب بھی سنائی دیتی ہیں۔ اور ہجوم مئے پرستان برور میخانہ می بینم۔ اس کے علاوہ ظاہر پرست امن وسکون کے لئے جہاں سے مدد لے رہے ہیں وہاں مہاتما بدھ کی پنچ شیلا میں بھی نئی روح پھونک رہے ہیں۔ ان گئے گزرے اصولوں کو لاکھ مشعل راہ بنایا جائے اور نئے نئے لباس میں پیش کر کے روحانیت سے موسوم کیا جائے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہیں۔ امن و سکون کی تلاش کرنے والوں میں اگر واقعی خلوص ہے تو ایک نہ ایک دن ان کو یقینی حقیقی روحانیت کے بیت معمور تک رسائی حاصل ہو سکے گی۔ جہاں سے طمانیت حاصل ہوئی تھی اور جہاں سے سکینیت اب بھی مل سکتی ہے۔ یہ بے یقینی خود یقین کی طرف لے جانے کی ذمہ دار ہے۔ اگرچہ نشہ غفلت میں سرشار ہونے کی وجہ سے خبر نہ ہو مگر روحانیت کا چمن اب بھی مہک رہا ہے۔ اور مہکے چلا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے امید ہے کہ غنچوں کی چٹک اور مہک مشام جاں میں صحیح حس پیدا کر دے گی۔ لیکن جب تک خدا وہ دن لائے۔

دلم بہ پاکی دامان غنچہ لرزد
کہ بلبلان ہمہ مستند و باغباں تنہا

چند اہم تاریخیں

ولادت رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۵۷۰ء
ہجری کی ابتداء	۶۲۲ء
فتح مکہ	۶۳۰ء
چینی سیاح ہیان سیانگ کی ہندوستان کو روانگی	۶۲۹ء
عرب ایرانیوں میں جنگ قادسیہ	۶۳۹ء
ہیان سیانگ کی ہندوستان سے واپسی	۶۴۵ء
مسلمانوں کا اسپین پر حملہ	۷۱۱ء
عرب، گجرات و مالوہ میں خلافت امیہ کا خاتمہ	۷۲۵ء
خلافت عباسی کی ابتدا	۷۵۰ء
ہارون رشید	۷۸۶ء/۸۰۹ء
مالا بار میں مسلمانوں کی پہلی تعمیر	۱۶۶ھ/۷۸۸ء
خلفاء عباسی سے سندھ نکل گیا	۸۷۱ء
ہندو اور مسلمانوں میں بمقام کابل پہلی جھڑپ	۹۷۵ء
سبکتگین کی تخت نشینی	۹۷۷ء
راجہ بھوج	۱۰۱۶ء/۱۰۶۵
محمود غزنوی کا سومنات پر حملہ	۱۰۲۵ء
چانکیہ وکرامات کا بنگال پر حملہ	۱۰۴۴ء/۱۰۶۲
سدہ راج نے مسلمانوں کے لئے گجرات میں مسجد بنوائی	۱۰۹۶/۱۱۴۳

گوبند چندر راجہ قنوج و پٹنہ	۱۱۵۵/ ۱۱۱۲ء
خلیفہ مسترشد	۵۲۹/ ۵۱۲ھ
خلیفہ راشد	۵۳۲ھ
خلیفہ المقتفی	۵۵۵/ ۵۳۲ھ
حضور غریب نواز کی پیدائش	۱۱۳۹ء/ ۵۳۴ھ
کاکایستان درنگل نے چولون اور یادوں سے جنگ کی	۹۹/ ۱۱۳۸ء
جنگ صلیبی نمبر ۲	۱۱۴۷ء
علاء الدین جہانسوزی نے غزنوی کو جلایا	۱۱۵۵ء
سلطان صلاح الدین مصر میں	۱۱۶۹ء
پرتھی راج کی فتح مہوبہ	۱۱۸۹ء
حکومت غزنی کا خاتمہ	۱۱۸۶ء
صلاح الدین کی فتح بیت، یاد دکن میں کامیاب و آزاد ہوئے	۱۱۸۷ء
جنگ صلیبی نمبر ۳	۱۱۸۹ء
محمد غوری نے بھٹنڈا (سرہند) فتح کیا	۹۱/ ۱۱۹۰ء
پہلی جنگ ترائن	
دوسری جنگ ترائن	۱۱۹۱ء
حضور غریب نواز کی آمد ہندوستان میں	۱۱۹۲ء
جنگ صلیبی نمبر ۴	۱۲۰۲ء
ایبک نے سلطنت دہلی کی بنیاد رکھی	۱۲۰۶ء
چنگیز خان نے پیکنگ فتح کیا	۱۲۱۴ء
انگلستان میں میگنا چارٹا کنگ جان نے تسلیم کیا	۱۲۱۵ء
چنگیز خان کا حملہ خوارزم	

جنگ صلیبی نمبر ۵	۱۲۱۸ء
حضرت غریب نواز کی تشریف آوری ہند	۹۲_۱۱۹۱ء/ ۵۸۷ھ
حضرت غریب نواز کا اجمیر سے سفر دہلی پہلی مرتبہ	۶۱۲ھ
حضرت غریب نواز کا عقد ثانی	۱۲۲۰ء/ ۶۱۶ھ
حضرت کا اجمیر سے سفر ثانی	۱۲۲۱ء/ ۶۱۷ھ
تولی خان کا محاصرہ ملتان	۱۲۲۵ء/ ۶۲۱ھ
حضرت غریب نواز کا وصال	۱۲۳۶ء/ ۶۳۳ھ
سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ۲۰ شعبان	۱۲۳۶ء/ ۶۳۳ھ
خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ	۱۱۴۳_۱۲۳۷ء/ ۵۴۸_۶۳۴ھ
حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ	۵۶۹ھ/ ۱۲۶۱ء
بیعت حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ بمقام مسجد ملتان	۵۸۹ء
خلافت بمقام دہلی حاصل ہوئی	۶۱۲ھ
حضرت کا ورود پاک پتن شریف میں	۱۲۳۸ء/ ۶۳۴ھ کے بعد
بیعت محبوب الٰہی صاحب بمقام پاک پتن	۶۵۵ھ
وصال حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۶۶۱ھ
وصال حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ	۶۵۸ھ
وصال حضرت جلال الدین تبریزی بمقام سلہٹ	۱۲۲۶ء/ ۶۲۲ھ
حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا بعد حصول خلافت ملتان آنا	۱۲۱۷ء/ ۶۱۳ھ

باب ۱

حضرت خواجہ معین الدین حسن اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کا زمانہ و ماحول

عیاں ہونے لگے انوار باری

سلجوقی سنجر نے خراسان میں بیس سال گورنری کی تھی۔ جب بھائیوں اور بھتیجوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ۵۲۳ھ میں وہ خراسان اور ماوراء النہر کا سلطان بن گیا۔ مرو اس کا دارالسلطنت تھا۔ اس کے خلیفہ المقتفی (۵۳۲۔۵۵۵ھ) کے عہد کی تاریخ بتا رہی ہے کہ زمانہ پر آشوب تھا۔ ظلمت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ انسانیت شرمندہ ہو کر رہ گئی تھی۔ بے چینی اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ خانہ جنگیوں نے سلجوقی سلطنت کے بخیے ادھیڑ دیے تھے۔ عمادالدین نے شہر روز فتح کیا تھا اور ۵۳۴ھ میں عیسائیوں سے قلعہ عرقہ و تعبرین لے لیا تھا۔ اور نورالدین نے شیر کوہ کو حمص کا گورنر مقرر کیا تھا۔ باطنیوں کی سفاکیاں زوروں پر تھیں۔ قزاق، رہزن اور لٹیروں نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ مگر باین ہمہ یہ تباہیاں اور ویرانیاں تعمیر کی شکل بھی پیدا کر رہی تھیں۔ ان تاریکیوں میں روشنی جھلک رہی تھی اور خوارزمی و غوری سلطنتیں منصہ وجود میں آ رہی تھیں۔ اس طرح اس قسم کی چکا چوند پیدا کرنے والی شفق نے مژدہ سنایا کہ آفتاب چشت مطلع قدس سے جلوہ فرما ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت غریب نواز قدس سرہ کی ولادت خراسان میں چھٹی صدی ہجری کے وسط میں ہوئی تھی۔ اس روایت کے دو جز ہیں اور دونوں میں سے کوئی جز بھی ایسا نہیں جس پر سب کا اتفاق ہو۔ یعنی جائے ولادت اور سال ولادت دونوں مشکوک ہیں۔ اس

سلسلہ میں کوئی تذکرہ نویس یہ نہ سمجھ سکا کہ چھٹی صدی ہجری کا وسط کہاں ہے۔ اور پھر خراسان تو ایک صوبہ ہے جس کو سنجرستان سے کوئی تعلق نہیں۔ ۵۳۷ھ سے لے کر ۵۳۷ھ تک کو چھٹی صدی ہجری کا وسط بھی ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس مدت کے کسی نہ کسی سال کو تذکرہ نویسوں نے بغیر کسی دلیل کے من مانی طور پر حضرت والا کا سال ولادت تحریر کر دیا ہے۔ ان تک بندیوں میں ۵۳۷ء کو اس سعادت کے لئے کثرت رائے حاصل ہے۔ صاحب معین العارفین نے سال ولادت ۵۳۰ھ فرض کیا ہے۔ مولانا شرؔ لکھنوی اور دیگر حضرات نے ۵۳۶ھ کا اعلان کیا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس طرح حضرت والد کا سال وصال بھی معمہ بن کر رہ گیا ہے۔ وصال کے وقت معتقدین و معاصرین سب ہی موجود تھے۔ مگر دن اور مہینے ہی کی غلطی نہیں ہے بلکہ سال اور سن بھی یاد سے فراموش ہو گیا ہے۔ ۶۲۷ھ سے لے کر ۶۳۴ھ کے درمیان میں سال وصال تسلیم کئے گئے ہیں۔ پیدائش اور وصال کے دونوں کے حدود متعین نہ ہونے کی وجہ سے عمر شریف بھی غیر متعین ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ نوے برس سے ایک سو چھ ہی نہیں بلکہ ایک سو ستر برس تک سن مبارک قیاس کیا گیا ہے۔

ہم سال وصال ۶۳۳ھ کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ سیر الاقطاب نے یہی سن "آفتاب ملک ہند" سے استخراج کی ہے۔ سرمد علیہ الرحمۃ بھی اسی سال کے مؤید ہیں۔

شد ز دنیا چو در بہشت بریں ‏ ‏ ‏ مرشد متقی معین الدین
گفت تاریخ رحلتش سرمد، محرم دل ‏ ‏ ‏ ولی معین الدین ۶۳۳ھ

اور صاحب خزینۃ الاصفیا نے بھی یہی سال وصال مانا ہے۔ مگر معلوم نہیں امیر علی نے "اسپرٹ آف اسلام" میں سال وصال ۶۶۳ھ/۱۲۵۶ء کیسے لکھ دی ہے۔

عمر شریف کے متعلق بھی مختلف مفروضات پائے جاتے ہیں اور کسی کو تاریخی شہادت حاصل نہیں ہے۔ بعض لوگ ستانوے برس کی عمر بتاتے ہیں۔ بعض اٹھانوے برس مانتے ہیں اور بعض سو برس کہتے ہیں۔ ہم اگر اسماء حسنیٰ کی رعایت سے حضرت والا کا سن شریف ۹۹

سال مان لیں تو اعتراض کی کوئی ضرورت نہیں اور ممکن ہے کہ یہی مبارک و مسعود بھی ہو۔ بہر حال خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم۔

ننانوے برس کی عمر اور ۶۳۳ھ کو سال وصال طے کرنے کے بعد از روئے حساب ۵۳۴ھ کو سال ولادت ہونے کا فخر حاصل ہو جاتا ہے۔ اکثر صاحبان نے ۵۳۳ھ کو سال ولادت مان کر عمر شریف سو (۱۰۰) برس یا اس سے زیادہ بتائی ہے جو مبالغہ سے خالی نہیں۔

اب رہی جائے ولادت تو دنیا بھر کے تذکرہ نگاروں نے متفقہ طور پر علانیہ کہا ہے کہ حضرت والا کی پیدائش خراسان میں ہوئی تھی۔ لیکن یہ قطعی غلط ہے۔ کیونکہ خراسان ایک صوبہ اور ایک سلطنت کا نام ہے۔ اس نام کا کوئی قصبہ یا شہر نہیں پایا جاتا۔

صوبہ خراسان کے مشہور شہر بلخ، مرو، ہرات، اور نیشاپور تھے۔ اب خراسان کا کچھ حصہ روس میں ہے کچھ ایران کے قبضہ میں ہے اور کچھ افغانستان میں شامل ہے۔ حضرت والا کی جائے پیدائش کے سلسلہ میں اصفہان اور سنجر کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ اور ان دونوں مقامات کا خراسان سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ اصفہان صوبہ اصفہان میں ایک شہر تھا جو سلجوقیوں کی ایک شاخ کا دار السلطنت تھا(1) اور سنجر نام کے تین مقامات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک سنجار بغداد سے سات منزل مغرب میں موصل کے قریب ہے۔ سلطان سنجر سلجوقی اسی جگہ پیدا ہوا تھا اور اس کا نام تماریک بھی تھا(2)۔ دوسرا سنجر اصفہان میں ایک محلّہ کا نام تھا۔ معلوم نہیں یہ محلّہ کس زمانہ میں آباد تھا۔ ممکن ہے کہ اتابیگ سنغر کے نام سے یہ محلّہ آباد ہوا ہو۔ سنغر نے صوبہ فارس فتح کر کے یہاں اپنی سلطنت قائم کی تھی۔ مگر یہ بعد کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے والد علیہ الرحمۃ کے قیام کی یادگار میں اس محلّہ کا نام سنجر رکھا گیا ہو۔ کیونکہ یہاں ان کی سسرال تھے۔ اور وہ یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ مگر یہ قیاس قطعی

1۔ یہ برقیاروق۔ محمود اور مسعود والی شاخ تھی۔

2۔ ماہ شوال ۵۶۵ھ میں یہاں عظیم زلزلہ آیا تھا۔ ۵۶۶ھ میں ملک العادل نے سنجار فتح کر کے عماد الدین زنگی کو دیا تھا۔ اسی سال خلیفہ مستنجد کا انتقال ہوا اور اسی سال صلاح الدین نے مصر کے قصر خلافت پر قبضہ کیا اور ۵۶۷ھ میں عباسیوں کا خطبہ پڑھایا اور خلافت فاطمیہ کو ختم کیا۔

ضعیف ہے۔ تیسرا سنجر صوبہ سیستان میں تھا اور اسی کو حضرت والا کا وطن کہا جاتا ہے۔ صوبہ سیستان ایران اور افغانستان کی حدود کے درمیان نیشاپور سے دور جنوب میں واقع ہے۔ سیستان میں قبل پیدائش مسیح قوم ساکائی کی حکومت تھی۔ اسی قوم کے نام سے یہ صوبہ ساکا استہان اور شنکر استہان کہلایا۔ بعد میں ایرانیوں، عربوں اور ترکوں نے سنکرستان، بجستان(1)، سیوستان اور سیستان کہا۔ غرض سیستان ایک صوبہ تھا اور سلجوقیوں کے عہد میں یہاں ایک گورنر رہا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس صوبہ سیستان میں والی خراسان سلطان سنجر کے نام سے یہ شہر یا قصبہ آباد کیا گیا ہو۔ مشہور تو یہی ہے کہ اب اس قصبہ کا نام ونشان بھی نہ رہا۔ لیکن صاحب معین العارفین کو دارالعلوم معینیہ، عثمانیہ اجمیر کے ہراتی طالب علم سے معلوم ہوا کہ قصبہ سنجر اب تک موجود ہے۔ اور حضرت والا کے خاندان والے اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

بہر حال صاحب معین العارفین نے فیصلہ ناطق فرمادیا ہے کہ اصفہان کے محلہ سنجر کو حضرت والا کی جائے ولادت سمجھا جائے۔ لیکن اہل تحقیق اس فرمان کو سن کر مسکرا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیستانی سنجر سے حضرت والا کے والد رحمۃ اللہ علیہ کا سسرال ہونے کی وجہ سے یا کسی اور غرض سے اصفہان جانا تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی ان کے مستقل قیام کو نہیں مانا جاسکتا۔ اس قسم کی شہادت ملتی ہے اور نہ اس زمان کے حالات تسلیم کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ صوبہ سیستان اور قصبہ سنجر میں مصیبت کی کتنی ہی آندھیاں آئیں۔ مگر اصفہان کے طوفانوں کے سامنے ان کی کوئی وقعت نہیں۔ سلجوقیوں کی خانہ جنگیوں، خلیفہ کی مصلحتوں اور باغیوں کی خونریزیوں کا اس وقت اصفہان آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے

1۔ ربیع بن زیاد نے بجستان (۵۰ھ۔ ۶۷۰ء) میں فتح کیا تھا۔ خلیفہ متوکل کے عہد میں یہاں کا گورنر صالح بن نصیر تھا۔ خاندان طاہریہ کا مورث اعلیٰ رازق بھی یہیں کا صوبیدار تھا۔ یہاں خوارج رہتے تھے۔ یعقوب صفاری نے اس کو فتح کر کے یہاں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ اس نے خارجیوں کو زیر کیا اور فتح کرتا ہوا کابل سے آگے سندھ و مکران تک پہنچ گیا۔ ۱۰۴۰ء میں مسعود غزنوی کے قتل کے بعد خلیفہ القائم نے ہرات اور سیستان موسیٰ ارسلان بیاغوں کو مرحمت کیا اور مرو چغری کو دیا اور عراق طغرل کو عطا کیا۔

اصفہان اور اس کے محلہ سنجر کو حضرت والا کی جائے ولادت سمجھنا محض ایک وہم ہے۔ دستور اور قرینہ کے مطابق اب یہی کیا جا سکتا ہے کہ حضرت والا کی جائے ولادت سیستانی سنجر تھا۔ اور اسی پر اجماع بھی ہے۔ عربی دان حضرت کا سجستان کے اس قصبہ سنجر کو ''سنجر'' کہنا صحیح ہے۔ لیکن ترکوں نے سنجرستان کے اس قصبہ کو ''سنجر'' کہا تو غلط نہیں کہا۔ اس مقام کے تلفظ پر اصرار کرنا علمیت کی نہیں بلکہ ضد کی بات ہے۔ یہاں کے باشندوں کو ان رعایتوں کی وجہ سے سنجری بھی کہا جا سکتا ہے اور سنجری بھی قابل ترجیح نہ یہ اور نہ وہ۔

حضرت والا کے نسب کے متعلق بغیر کسی اختلاف کے مستند و متفق علیہ روایت ہے کہ حسنی الحسینی سادات سے تھے اور حضور غوث پاک سے ان کا ظاہری و نسلی قریبی رشتہ تھا۔ چنانچہ شجرہ نسب اور شجرہ طریقت دونوں یہاں دکھا دیے گئے ہیں۔ جن سے ان حقائق کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

حضرت والا کے والد سید غیاث الدین حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ متقی پرہیزگار، صاحب ثروت اور دولت مند تھے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اکثر اصفہان، نیشاپور اور بغداد کا سفر کرتے تھے۔ ان کا مزار مبارک بغداد میں ہے۔ نہیں بتایا جا سکتا کہ شغل و پیشہ کیا تھا۔ تجارت کرتے تھے، کسی سرکاری عہدہ پر فائز تھے یا تبلیغ دین میں مصروف تھے۔ قیاس غالب یہی ہے کہ ان کی جائیداد سنجر میں تھی۔ نیشاپور میں ان کی ملکیت کا ثبوت نہیں ملتا۔ پیدائش و قیام سنجر میں ثابت ہو جانے کے بعد ظاہر ہے کہ حضرت والا کی پرورش، تربیت اور ابتدائی تعلیم والدین کے زیر سایہ سنجر میں ہی ہوئی۔ چار پانچ برس کی عمر یعنی ۵۳۹ھ میں سلسلہ نوشت و خواند جاری ہوا۔ دو بھائی اور بھی بتائے جاتے ہیں۔ شاید ایک دو ہمشیرہ بھی تھیں۔ ورنہ خواجہ علی سنجری وغیرہ کو خواہر زادہ نہ لکھا جاتا۔

اس زمانہ میں عام طور پر سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں تعلیم سے فراغت حاصل کر لی جاتی تھی۔ مگر آفات ارضی و سماوی حضرت والا کی تعلیم میں رخنہ انداز ہوئیں۔ قارا خطائی گرخاں کے ورثاء نے ۵۳۶ھ میں خراسان پر حملہ کیا اور مظالم کی حد کر دی۔ اس موقع پر گورنر سیستان

کو قارا خطائیوں نے گرفتار کیا تھا۔ ان کے حملوں کے بعد عزیز خوارزمی نے بھی خراسان پر قوت آزمائی کی۔ پے در پے حملہ ہونے کی حالت میں زندگی کا تہ و بالا ہو جانا قرین قیاس ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد غالباً ۵۴۴ھ میں جب حالات کچھ سازگار ہوئے تو دس برس کی عمر میں حضرت والا کو مدرسہ نیشاپور میں داخل کر دیا گیا۔ نیشاپور شاہ پور ثانی نے ۳۴۰ء میں ہجرت نبوی سے پہلے آباد کیا تھا۔ سلطان طغرل کی دارالحکومت رہ چکا تھا۔ اور علم و فضل کا میدان تھا۔ بہترین استاد تھے۔ اور یہاں کے مدرسے سوائے مدرسہ نظامیہ بغداد کے کل ایران و خراسان میں ممتاز و مشہور تھے۔ حضرت امام غزالی نے یہیں تعلیم پائی تھی۔ حضرت والا کی تعلیم چونکہ نیشاپور میں ہوئی تھی۔ اور نیشاپور خراسان سے متعلق تھا۔ اس لئے تذکرہ نویسوں نے کہہ دیا کہ ان کی نشو و نما خراسان میں ہوئی۔ لیکن نشو و نما سے مدعا تعلیم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ صاحبزادے کو نیشاپور بھیج دینے کے بعد سید غیاث الدین حسن رحمۃ اللہ علیہ کا سکون و اطمینان اس امر سے واضح ہے کہ انہوں نے سفر بغداد اختیار کیا۔ اس سفر کی مدت بہرام شاہ کے انتقال کے سال بھر بعد ۵۴۸ھ میں متعین کی جا سکتی ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ بہر زمین کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ مدرسہ نیشاپور میں تعلیم پاتے ہوئے چار پانچ سال گزرے ہونگے کہ قیامت آ گئی۔ خون کی ندیاں بہنے لگیں اور گلی کوچوں میں لاشوں کے انبار لگ گئے۔ سلطان سنجر کو جنگ بلخ میں گرفتار کر لینے کے بعد غزنیوں نے ۵۴۹ھ میں بلاد طوس و نیشاپور کو قتل و غارت کا نشانہ بنایا۔ مسجد شعمی میں پناہ لینے والوں کو بے رحمی سے قتل کیا۔ شفاخانے کے مریضوں اور طبیبوں کو جام فنا پلایا۔ کتب خانے جلائے مدرسوں میں قتل عام کیا۔ عوام اور فوجیوں کے علاوہ علماء و شیوخ کو چن چن کر شہید کیا(1)۔ اور اپنے خیال میں کسی جاندار کو زندہ نہیں چھوڑا۔ اس وحشت ناک مظالم کے

1۔ محمد یحییٰ فقیہ شافعی جو علم و فضل میں مرجع عالم تھے اور جن کے درس میں مشرق و مغرب کے طلبہ کا اجتماع ہوتا تھا۔ عبدالرحمٰن بن عبدالصمد نیشاپوری جو عابد و زاہد اور فقیہ تھے۔ اور جن سے سلطان سنجر کو عقیدت تھی۔ امام قشیری کے نواسے احمد بن حسین کاتب، ابوالبرکات فرادی، امام علی صباغ جو مشہور متکلم تھے، احمد بن عبدالوہاب مقاآبادی، قاضی ساجد بن عبدالملک، حسن بن عبدالحمید رازی اور دیگر عباد و زہاد جن کی فہرست طویل ہے۔

نظارے میں حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ پر کیا گزری۔ سمجھنے والے آنکھیں بند کر کے اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر خود سوچیں۔ واقعہ یہ ہے کہ محافظ حقیقی نے ان کو بے لاگ بچالیا اور وہ راہ دراز طے کر کے بخیر وخوبی اپنی والدہ صاحبہ کے پاس سنجر پہنچ گئے۔ ان کا جسم بال بال بچا مگر دل پر ہزاروں چوٹیں آئیں اور لاکھوں زخم لگے۔ غرض دماغ پر جو اثر ہوا وہ ناگفتنی ہے۔

اس وقت سید غیاث الدین حسن رحمۃ اللہ علیہ بغداد میں تشریف فرما تھے۔ واقعات غزنی اور ہنگامہ نیشاپور کی وحشت اثر خبروں کو سن کر ان کا دل قابو سے باہر ہو گیا۔ غربت اور پریشانی میں صاحبزادے کے متعلق جو فکر دامنگیر ہوئی۔ اس نے ان کی جان پر بنا دی اور جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔ ان کا مزار بغداد میں دروازۂ شام کے قریب ہے۔ ان کے انتقال کی خبر جب سنجر میں پہنچی تو حضرت والا کا سن مبارک پندرہ سال کا تھا۔ نیشاپور کی تباہی ابھی آنکھوں میں ہی گھوم رہی تھی۔ والد ماجد کی رحلت کی خبر نے آنکھوں کے ساتھ دل کو بھی پتھر بنا دیا۔ وہ دل وجگر قابل آفرین ہیں جنہوں نے ایسی ایسی قباحتوں کو برداشت کیا۔ اندریں حالات سلسلہ تعلیم ختم کر دینا پڑا۔ خانگی ذمہ داریوں کی مصیبت سر پر آپڑی۔ معلوم نہیں بھائیوں نے ورثہ تقسیم کر کے یگانگت برتی یا بیگانگی اختیار کی۔ لیکن ابھی کچھ اور دیکھنا تھا۔ سال نہیں گزرنے پایا تھا کہ ۵۵۰ھ میں والدہ صاحبہ بھی مفارقت کا داغ دے گئیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ)

حضرت والا کو جو ترکہ ملا وہ ایک پن چکی اور ایک باغ پر مشتمل تھا(1)۔ یکہ وتنہا باغ کی نگرانی اور کاشت خود ہی کیا کرتے تھے۔ ابھی تک تعلیم کا مشغلہ تھا۔ اب پڑا سابقہ زراعت ومزدوری سے بس خدا یاد آ گیا۔ اس عالم وکیفیت میں ذکر الٰہی رفتہ رفتہ وجہ سکون بن کر اطمینان ویقین کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ باغ کی نگہداشت کے مشغلہ میں والدین کی سرپرستی وشفقت یاد آئی اپنی آسودگی و بے فکری کا تصور جما' ہنگامہ نیشاپور میں استادوں اور ساتھیوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ ان جملہ واقعات کی یاد نے

1۔ سیر الاقطاب ومونس الارواح

دل پہ جو کچھ نہ گزار دی ہو وہ کم ہے۔ ان اثرات و کیفیات کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر دنیا یہ جانتی ہے کہ وہ روزانہ کے کام میں مشغول رہے۔ ظاہر ہے کہ دماغ قوی تھا۔ ظرف عالی تھا۔ اور مشکلات پر صبر کرنے کی ہمت تھی۔ خستہ حالی اور ہمت عالی کے عالم میں نقطہ نظر بدل جایا کرتا ہے۔ اور پھر بدلے ہوئے نظریات کے مطابق دنیا اور دنیا کی ہر چیز بھی بدلی ہوئی نظر آیا کرتی ہے۔ اپنے گھر اپنے باغ اور اپنے ہر معاملہ میں بے اختیاری کی جھلک اور اپنی مرضی و خواہش کی شکست جب نظر آنے لگی تو چہ کنم کی کیفیت مسلط ہو گئی۔ اس کے بعد تذبذب نے اپنے انچھر چھینکے ہوں تو بعید نہیں۔ اضطراری حالت میں کسی ہم خیال و ہمنوا کا میسر نہ آنا بذات خود قیامت ہے۔ اس کیفیت اور کاشت کاری کی مدت کو دو تین سال سے کم تصور نہیں کرنا چاہئے۔ اس کیفیت کے پختہ ہو جانے پر ۵۵۲ھ میں جب کہ عمر شریف اٹھارہ سال کے قریب تھی تو ایک روز جوہر قابل کے تلاش کرنے والے اور خدا کے بھیجے ہوئے ایک مجذوب حضرت ابراہیم قندوزی(1) جھومتے جھامتے باغ میں تشریف لائے۔ انہوں نے ایک پچھتم کی کہی اور ایک پورب کی جو سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی۔ لیکن ان کی والہانہ روش سے قلب مضطر نے تسکین پائی۔ اضطراب کا علاج بجائے کسی دانشمند مولوی کے مجذوب سے کروایا گیا۔ اس میں قدرت کاملہ کی یہی مصلحت ہو سکتی ہے کہ ہرزہ کار عقل کو صحت و سکون کی ہوا نہ لگنے پائے۔ جب اس طرح خوف و رجا سے بھرے ہوئے دل کو قرار

1۔ نفحات الانس میں حضرت جامی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ ابراہیم قندوزی جلیل القدر مجذوب تھے۔ حضور غوث پاک کی آرزو تھی کہ ان کے ساتھ ایک شب گزاریں۔ بڑی مشکل کے بعد یہ موقع نصیب ہوا۔ چنانچہ دونوں نے شہر کی جامع مسجد میں قیام کیا۔ نصف شب گزرنے پر کھانے کی فرمائش کی۔ یہ حضرت اول تو کچھ کھاتے نہ تھے اور جب کھانے پر آتے تھے تو بس نہ کرتے تھے۔ حضور غوث پاک کو ان کی عادت کا علم تھا۔ چنانچہ بڑی دقت سے حد سے زیادہ کھانا فراہم کر کے لائے۔ جب وہ سب کھا چکے تو کہا کہ لیٹ جاؤ، سو جاؤ میں کھانا کھا کر ابھی آتا ہوں۔ جب واپس آئے تو حضور غوث پاک کے سرہانے ایک بڑا پتھر لے کر کھڑے ہو گئے۔ اور کہا کہ جی چاہتا ہے کہ سر کچل دوں۔ مگر تیری ماں ضعیف ہے اسے صدمہ ہوگا۔ کئی مرتبہ اسی حرکت کی تکرار کی۔ جب ایک تہائی رات رہ گئی تو مجذوب نے کہا: ”میں جانتا ہوں تو سو نہیں رہا ہے۔ بس اب سو جا اور میں نیچے کتب خانہ میں جاتا ہوں“۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ نیچے سے کچھ کاٹنے چبانے کی آواز آتی رہی۔ صبح کو معلوم ہوا کہ تمام کتابوں کے پٹھے توڑ کر کھا لئے تھے۔

آ گیا تو پھل وغیرہ پیش کر کے مجذوب مہمان کی تواضع کی گئی۔ مجذوب چونکہ مغلوب الحال ہوتا ہے اس لئے ذمہ داری نہیں لیتا۔ وہ محض دستگیری کر دیا کرتا ہے۔ مجذوب صاحب نے شکریہ کے طور پر اپنے دانتوں سے کاٹ کر کھلی کا ایک ٹکڑا میزبان کے منہ میں رکھ دیا۔ رحمت حق بہانہ می جوید۔ کھلی کا حلق سے اترنا تھا کہ از سر نو اضطراب نامعلوم سرعت کے ساتھ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ غنودگی طاری ہوئی۔ نیند سی آ گئی اور بےخودی اور بے ہوشی کے آثار نمودار ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھ کھلی اور ہوش میں آئے تو مہمان صاحب غائب تھے۔ مگر اضطراب کا علاج ہو چکا تھا۔ چہ کنم کی دوا میسر آ گئی تھی اور بڑھے ہوئے اضطراب نے سکون قلب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسی عالم میں مصمم ارادہ کر لیا گیا۔ حائل راہ موانعات سے ایک دم فرصت اختیار کر لی تھی۔ باغ فروخت کر کے قیمت راہ خدا میں صرف کر دی۔ علائق سے منہ موڑ لیا۔ اس بات سے قطع نظر کر لی اور ہر چہ باداباد۔ توکل علی اللہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اب وحشت نہیں تھی، اضطراب نہیں تھا۔ محض حیرانی تھی اور لاعلمی سی تھی۔ اسے سکون کہا جائے یا جنون سمجھا جائے غرض ایک ہی بات ہے۔ سکون وجنون محض علم وعقل کی اصطلاحیں ہیں۔ ورنہ اصلیت یہ ہے۔

ادھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

باب ۲

گھر سے روانگی

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ است

۵۵۴ھ۔ عمر اٹھارہ سال

سر بہ صحرا نکل کھڑا ہونا معمولی بات نہیں۔ مگر کوئی کھینچے لئے جا تا تھا۔ تلاش حق منزل مقصود کی طرف جا رہی تھی۔ راہزنوں کا خوف تھا نہ بے راہ روی کا اندیشہ۔ توفیق الٰہی نے چند روز ادھر ادھر پھرا کر اور وسعت کا میدان دکھا کر مشہد وطوس والی سڑک پر ڈیرہ ڈال دیا جو بخارا کو جاتی تھی۔

بخارا جنت تمثال تھا۔ علم وفن کی وہاں بہتات تھی۔ خانقاہوں اور مدرسوں میں یکتائے زماں صوفیہ وعلماء تعلیم دیتے تھے۔ بوریہ نشین استادوں کے سامنے امیر وغریب اور دیسی و بدیسی طلبہ ادب واحترام سے بیٹھتے تھے۔ اور تقریر کا ایک ایک حرف لوح دل پر لکھتے تھے۔ بہ یک بینی و دو گوش۔ جب حضرت خواجہ بخارا پہنچے تو مدرسوں نے اپنی طرف متوجہ کیا شوق و طلب نے تعلیم کی تکمیل پر آمادہ کیا اور شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ جیسے جید عالم کی خدمت میں پہنچ کر زانوئے ادب تہہ کیا۔ جب یہاں علم ظاہر کے محسوس خطرات سے آگاہی ہو گئی تو سمرقند کا رخ کیا۔ سمرقند اقصائے عالم میں علم وفضل کے لئے مشہور تھا۔ اور بخارا سے دعویٰ ہمسری رکھتا تھا۔ یہاں صاحب شرع اسلام مولانا شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ سے جملہ علوم دینی وعقلی کی سند لی۔ قرآن پاک سمرقند میں ہی حفظ کیا۔ نیشاپور میں شاید پورا حفظ نہیں کر پائے تھے۔ بخارا و سمرقند کے قیام اور حصول تعلیم کی مدت میں اختلاف ہے۔ کوئی ستائیس سال بتاتا ہے۔ کوئی سترہ برس کہتا ہے۔ کوئی سات برس مانتا ہے۔ اور کوئی پانچ فرض کرتا ہے۔ مدت سفر کو ملا کر ہم پانچ سال کے قائل ہیں۔ یہ تعلیم حصول دنیا کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ

اس کا مدعا خود آگاہی اور خود شناسی تھا۔ معرفت کی چٹکی والدین نے گھٹی میں شامل کر دی تھی۔ اس تعلیم سے اس میں جلا ہوئی۔ علم حقیقت نے جب علم ظاہر کے نقوش حباب کی طرح ختم کرنا شروع کیے تو یہاں سے بے اختیار ارض مغرب کا رخ کیا۔ مغرب میں پر انوار مقدس مقامات تھے۔ جہاں اولیاء کبار روحانیت کی ضیاء باری فرما رہے تھے اور جہاں بزرگان ملت کے مزارات تھے۔ جن سے ایک جہان کو فیض پہنچ رہا تھا۔

۵۵۷ھ میں مغرب کی جانب جاتے ہوئے حضرت والا نیشا پور سے ایسے گزرے جیسے کوئی اجنبی گزرتا ہے۔ طالب علمی کی یاد اور سانحہ روح فرسا کے تصور نے بیگانگی اور اجنبیت پیدا کر دی تھی یا کیفیات قلب نے حس و دماغ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ ۵۵۳ھ میں نیشا پور نے ایک اور انقلاب دیکھا تھا۔ غیروں کے اشارے پر شہر والوں نے شہر میں آگ لگا دی تھی۔ اور امام الحرمین حضرت محمد جوینی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان تک کو پھونک دیا تھا۔ اسی سال کسی شریر نے سلطان سنجر کے جانشین سلطان محمود کو بھی تہہ تیغ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ افتاد زمانہ کی وجہ سے کوئی پرانا جاننے والا بھی باقی نہ رہا ہو تو بعید نہیں۔ یہاں سے گزرتے ہوئے خواجہ عثمان ہرونی (1) نور اللہ مرقدہ کی شہرت سنی۔ اس عہد کے مشائخ کبار میں وہ ممتاز تھے اور چشمۂ ہدایت کے منبع و منشا تھے۔ کبھی وہ ہرون میں رہتے تھے اور کبھی بغداد شریف میں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ کا وطن وہ ہرون تھا جو نواح نیشا پور میں تھا یا وہ ہرون تھا جو بغداد کے قریب کرمان شاہ کے جنوب میں واقع تھا۔ ہارون آباد اس کو بھی کہتے ہیں اور اُس کو بھی۔ عالم شہرت تو نیشا پور والے ہرون کے متعلق ہے۔ لیکن جو حالات بتائے جاتے ہیں۔ وہ مضافات بغداد والے ہارون آباد پر موزوں و منطبق ہوتے ہیں۔ اگر بغداد والے ہرون کو حضرت خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ کا وطن سمجھا جائے تو تمام شکوک کا دفیعہ ہو جاتا ہے۔ اب اتنے عرصہ کے بعد کون طے کرے کہ حضرت غریب نواز

1۔ خیر المجالس میں ہے کہ ہارونی نیست بلکہ ہرونی است۔ ہرون دیہے است و خواجہ دران دیہہ بود۔

رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد کا وطن کون سا ہرون تھا۔ راہ دراز طے کر کے نیشاپور والے ہرون سے بغداد پہنچنے کے لئے براراست جانا ہوتا تھا۔ بہر حال یہ سننے کے بعد کہ ہرون حضرت عثمان رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات کی وجہ سے جگمگا رہا ہے۔ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے نیشاپور سے اس قصبہ میں جانے کا ارادہ کیا۔ ہرون پہنچ کر خدمت اقدس میں حاضری دی اور بیعت کی(1)۔

مگر بیعت کے متعلق بھی اختلاف ہے کہ اسی موقع پر اس مرتبہ حاصل کی یا یہاں سے روانہ ہو کر بغداد میں حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ سے سعادت حاصل کرنے کے بعد واپس آکر ہرون میں مرید ہوئے۔ یہ بھی مختلف فیہ ہے کہ بیعت بمقام ہرون کی یا بمقام بغداد۔ شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا۔ لیکن معمولی سی تدبیر کے بعد حقیقت واضح اور صاف ہو جاتی ہے۔ شہرت یہ ہے کہ حضرت والا پہلے ہرون پہنچے پھر بغداد گئے۔ جب غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ شخص مقتدائے روزگار ہوگا۔ اور اس سے بہتوں کو فائدہ پہنچے گا۔ سوال یہ ہے کہ پہلی مرتبہ خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کیوں نہ لی؟۔ شاید اس لئے کہ مختلف بزرگوں سے ملنے کے بعد انتخاب شیخ خود کریں۔ مگر انتخاب شیخ مرید کی قوت سے باہر ہے۔ مشہور ہے کہ عشق اول دردل معشوق پیدا می شود۔ شیخ خود دیکھا کرتا ہے کہ کس کا حصہ اس کے پاس ہے۔ اب یہی سوال حضور غوث پاک کے متعلق بھی ہے۔ انہوں نے محض پیشین گوئی پر اکتفا کیوں کیا۔ اور مرید کیوں نہ کرلیا۔ حضرت کا ارشاد گرامی بذات خود اس معمہ کا حل ہے۔ اور اسی سے تمام گتھیاں حل ہو جاتی ہیں۔ جن کی نورانی آثار و کیفیات منتشر نہیں تھیں بلکہ مرتب ہو چکی تھیں اور مرتب قبل بیعت ہو نہیں سکتیں۔ اگر وہ نورانی کیفیات کو غیر مرتب پاتے تو وہ یقیناً اپنی مریدی میں لے لیتے۔ اس طرح چون و چرا کا خاتمہ ہو جاتا اور ثابت ہو جاتا کہ پہلی مرتبہ

1۔ ہمارے حساب سے سال بیعت ۵۵۸ھ صحیح ہے۔ بعض روایات میں سال بیعت ۵۶۰ھ بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے ہندوستان کی طرف کوچ ۵۸۹ھ میں ہوا یا اس کے بعد ہونا چاہئے اور یہ غلط ہے۔

پہلی ملاقات میں شیخ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کو مرید کر لیا تھا۔ خواجگان چشت کا دستور ہے کہ اڑتی چڑیا کے پر کتر لیا کرتے ہیں۔ جب پہلی مرتبہ حضرت والا خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں از راہ شوق پہنچے تو ان کو محسوس ہوا کہ خود نہیں آئے ہیں۔ بلکہ بلائے گئے ہیں۔ رحمت و شفقت نے عقیدت مندی کو ابھارا اور والہانہ انداز میں سر نیاز قدموں پر رکھ دیا۔ سفر مغرب سے جو مدعا تھا وہ پہلی ہی منزل میں حاصل ہو گیا۔ حضرت والا کا ارادہ سفر مغرب کا ہر چند مختلف بزرگوں سے ملنے اور مختلف مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے کا ہو مگر شکاری گھات میں تھا اور اس روز سے تھا جس روز سے ابراہیم قندوزی نے کھلی کا ٹکڑا کھلایا تھا۔ ایسے شاہباز کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی نظر انداز کرنا شوق کا خون اور دین کا نقصان کرنا تھا۔ اب رہا مقام بیعت کا اختلاف تو اس میں کوئی الجھن کی بات نہیں ہے۔ مضافات بغداد والے ہرون کا فاصلہ سینکڑوں کوس کا نہ تھا۔ مشکل سے ایک یا ڈیڑھ منزل ہوگا۔ پہلی ملاقات میں جب یہ طے کر لیا گیا کہ مرید کرنا ہے تو دونوں حضرات بغداد پہنچے اور وہاں جیسا کہ انیس الارواح میں مذکور ہے۔ مسجد جنید میں بیعت لی گئی۔ بیعت کی تفصیل جو بیان کی گئی ہے وہ پہلی حاضری کی بیعت کے مانع نہیں ہو سکتی۔ مانع سمجھنے والے خاندان چشت کی خصوصیات سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چشتیوں کا اصول ہے کہ جس کا خود ہاتھ پکڑتے ہیں اس کو اسی وقت اپنی روحانیت سے اس کا آخری مقام دکھا دیتے ہیں۔ تاکہ اس کے حصول کی بعد میں مرید خود جدو جہد کرے اور بغیر نفس و شیطان کے فریب میں آئے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ ایسے مواقع پر حرارت عشق یکدم آسمان پر پہنچا دیا کرتی ہے۔ اور پھر بعد میں جو جدو جہد ہوتی ہے وہ محض استقامت کے لئے ہوتی ہے۔ یہ واقعہ بیعت ۵۵۸ھ کا ہے۔ جب کہ عمر شریف چوبیس پچیس سال کی تھی۔ اب حضرت والا ہی کی زبان سے بیعت کی روداد سننے کے قابل ہے۔

"اس روز بڑے بڑے بزرگ حضرت خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس گرامی

میں موجود تھے۔ (گویا رسم کا پیشگی خاص اہتمام کیا گیا تھا) حکم ہوا معین الدین تازہ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو۔ میں نے تعمیل کی۔ فرمایا کہ اس طرح قبلہ رو بیٹھ کر سورۃ بقر پڑھو۔

اب اکیس مرتبہ سبحان اللہ پڑھو۔ اس کے بعد کھڑے ہو کر اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ''آؤ میں تمہیں خدائے عز و جل تک پہنچا دوں'' (گویا یہ مرشد کا تصرف ہے) یہ فرماتے ہی قینچی اپنے دست مبارک میں لے کر میرے سر پر چلائی اور کلاہ چار تر کی اور گلیم عطا فرمائی۔ پھر فرمایا بیٹھ جاؤ اور ارشاد کیا ہمارے خانوادے میں آٹھ پہر کا مجاہدہ ہوتا ہے وہ پورا کرو۔

بعد تعمیل دوسرے دن میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا: اب ہزار بار سورۃ اخلاص پڑھو۔ میں نے پڑھی فرمایا: ادھر دیکھو اور بتاؤ کیا نظر آتا ہے۔ عرض کیا: عرش اعظم تک سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ فرمایا: ہزار بار پھر سورہ اخلاص پڑھو۔ میں نے پڑھی۔ حکم ہوا اوپر دیکھو۔ اب کیا نظر آتا ہے۔ عرض کیا: حجاب دکھائی دیتا ہے۔ فرمایا: آنکھیں بند کرو اور کھولو جب میں نے ایسا کیا تو اپنی دو انگلیاں دکھا کر دریافت کیا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ عرض کیا اٹھارہ ہزار عالم۔ اب فرمایا۔ بس معین الدین تمہارا کام پورا ہو گیا''۔ سامنے ایک اینٹ پڑی تھی فرمایا اس کے نیچے جو کچھ ہو اٹھا لو۔ اس کے نیچے چند دینار تھے۔ ارشاد ہوا جاؤ ان کو فقیروں پر صدقہ کر دو۔ جب میں تقسیم کر کے واپس آیا تو حکم ہوا چند روز ہمارے پاس اور رہو۔ میں نے سر تسلیم خم کر لیا کہ جیسی رائے عالی ہو۔

بیعت کی خصوصیت قابل غور ہے کہ مرید کے بجائے شیخ نے صدقہ دیا۔ ان مشاہدات اور عروجی کیفیت سے مرید کے ظرف اور شیخ کی قوت کا اظہار ہے۔ بیعت کے وقت صدقہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ پیر نے مرید کا انتخاب کر لیا۔ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے اس انتخاب پر شکریہ ادا کیا۔ لیکن جب شیخ خیرات کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ شیخ نے مرید کو اپنے کام کے لئے خرید لیا۔ شیخ اسی وقت صدقہ دیتا ہے جب کہ وہ مرید کو اپنی وراثت و خلافت کے لئے منتخب کیا کرتا ہے۔ اس نکتہ کو معلوم کرنے کے بعد اہل نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا

کہ حضرت والا کو پہلے ہی موقع پر خلیفہ اعظم بنانے کا تہیہ کرلیا گیا تھا۔ اور اسی حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر حکم دیا تھا کہ چند روز ہمارے پاس رہو۔ چنانچہ یہ چند روز کی مدت ڈھائی سال کی نکلی۔ قیام ہردن میں رہا اور اس عرصہ میں مشاہدات بیعت ذاتی بنا دیے گئے۔ انہیں آثار کو دیکھ کر حضور غوث پاک نے وقت ملاقات ان کے متعلق پیشین گوئی کی تھی جو مذکور ہوئی۔

سلسلہ چشتیہ بھی قادریہ وسہروردیہ کی طرح امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے چلتا ہے۔ چشتیہ کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ خواجہ ابو اسحاق شامی اپنے وطن شام سے اپنے شیخ خواجہ علی دینوری رحمۃ اللہ علی کی خدمت میں حاضری کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ تو قصبہ چشت میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ شیخ نے بجائے شامی کے چشتی کا خطاب مرحمت فرما دیا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کہ اس زمانہ میں چشت نام کا کوئی قصبہ تھا بھی یا نہیں۔ موجودہ جغرافیہ اور نقشوں میں اس مقام کا نام شاقلان ہے(1)۔ اگر پہلے اس کا نام چشت تھا اور اب شاقلان ہے تو یہ بڑا ظلم ہے۔ سلسلہ کے نام کی یادگار میں اس قصبہ کے نام کو باقی رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر اصل مقام شاقلان تھا اور اس کو مشائخ کی وجہ سے چشت کہا گیا ہے۔ تو وجہ تسمیہ کچھ اور ہونا چاہیے۔ اور اس صورت میں اس کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے۔

''اس سلسلہ کے اولین بزرگوں کا سابقہ آتش پرستوں سے رہا ہے اور اسی قوم میں انہوں نے تبلیغ فرمائی ہے۔ ممکن ہے کہ ایمان لانے کے بعد از راہ ادب ان مشائخ کو یہ آتش پرست چشتی کے لقب سے یاد کرتے ہوں۔ ان کی زبان میں لفظ چشتی کے معنی ہیں عرفان اعلیٰ اور یہی لفظ چشتی ان کے معبود کا اسم صفت بھی ہے۔ اگر اس توجیہ میں کچھ وزن ہے تو یوں کہنا پڑے گا کہ حضرت علی دینوری نے ابو اسحاق شامی کے حق میں تسلیم کر کے مستند بنا دیا۔ اور ابو اسحاق شامی نے شاقلان میں چونکہ بود و باش اختیار کرلی تھی۔ اس لئے عربی و فارسی قاعدہ کی رو سے چشتی کی یاء کو یائے نسبتی سمجھا گیا۔ اور شاقلان کا عرف چشت ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

1۔ حسن ایر نے شاقلان کو چشت کہا ہے۔ جو متصل ہرات ہے۔ انگریزی میں اسپیلکر ان کہتے ہیں۔

اڑھائی برس میں جب انفس کا تماشا دکھا دیا گیا تو آفاق کی سیر کا حکم دیا گیا۔ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (انعام:۱۱) کے حکم میں آموختہ انفس کی آزمائش منظور تھی۔ بشر کا کمال یہ ہے کہ جہان کون و فساد کی سیر کرے۔ اپنی تہذیب یافتہ بشریت میں مستقل رہے۔ اور مخلوق خدا کی، خدا کی طرف ہدایت کرے۔ ان مراحل و مدارج کے حصول سے پہلے اگر سیر مغرب یا سیر آفاق کا حکم دیا جاتا تو یہ مقصد عظیم حاصل نہ ہوتا۔ مجبوری و قید کے آئین میں کامل بنا دینے کے بعد آزادی و مختاری کی مشق کرنے کا حکم دیا گیا۔ اگر ادب مانع نہ ہو تو یوں سمجھا جائے کہ باکمال جوہری نے اپنے در یتیم کو بازار جہاں میں اس لئے بھیجا کہ۔

آنکھ والے تیرے جوبن کا تماشا دیکھیں

باب ۳

سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ

دلم بہیچ تسلی نمی شود حاذق

بہار دیدم وگل دیدم وخزاں دیدم

۵۶۱۔۵۶۵ھ

۵۶۱ھ کی ابتدا میں مرشد کے حکم کے مطابق حضرت والا ہرون سے اس طرح روانہ ہوئے جس طرح ماہ نیم ماہ اٹھکیلیاں کرتا ہوا سیر فلک کو نکلتا ہے، یا اس طرح روانہ ہوئے جس طرح پنہاء فلک کو چیرتا ہوا راکٹ چاند کی طرف جاتا ہے۔ سامان سفر میں محض لباس تھا جو زیب تن تھا اور وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ زادراہ بھی کچھ نہ تھا۔ روٹی کی ٹکیہ جب مل جاتی تو پانی میں تر کر کے ساتویں دن افطار کے کام آتی۔ مدعاء سیاحت بظاہر اپنے آپ کو دکھانا اور دوسروں کو دیکھنا تھا۔ مگر یہ باطن فراق مرشد کو برداشت اور آتش شوق کو تیز کرنا۔ اس سیاحت کی نہ تفصیل ہے نہ کل مقامات بتائے گئے ہیں اور نہ کسی مدت کا ذکر ہے۔ ملفوظات میں بر سبیل تذکرہ چند مقامات کا اتفاقیہ ذکر آگیا ہے جن سے سیاحت تین قسم کی معلوم ہوتی ہے۔ سفر دوم میں مرشد کی معیت پائی جاتی ہے اور سفر اول وسوم خود کیا ہے۔ جب سیاحت زمان ومکان اور راہ وماہ کے قیود سے آزاد ہو تو مندرج چند مقامات میں ترتیب اور سمت کا سوال ہی بے کار ہے۔ منسلکہ نقشہ میں ان مذکورہ مقامات کو دکھا دینا ہی کافی ہے۔ راہ کی ہمواری اور دشواری کے لحاظ سے پہلے منزلیں مقرر کی جاتی تھیں۔ ہر منزل بارہ سے لے کر سولہ فرسخ کی ہوا کرتی تھی۔ بغداد سے حرمین کو بصرہ ہو کر جاتے تھے۔ سنجار و دمشق ہو کر جاتے تھے۔ نجف کربلا اور قادسیہ ہو کر بھی راستہ تھا اور کرمان سے بھی۔ جن چند شہروں کے نام بتائے گئے ہیں۔ وہ بغیر کسی ترتیب کے حسب ذیل ہیں:

بغداد

ہرون سے روانہ ہو کر سب سے پہلے بغداد پہنچے۔ یہاں حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ، شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اور اوحد الدین کرمانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان حضرات کی ملاقاتوں کو دنیوی ورسمی معیار سے نہیں جانچنا چاہیے۔ بلکہ ان کی روحانیت کی جلوہ گری سے اندازہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ملاقات کس درجہ اہم ہوئی۔ ان کی باطنی ملاقاتوں کے لئے زبان ومکان یا کسی اور قسم کی مادیت کی قید بے معنی ہوگی۔

لہٰذا یہ بحث کہ کس بزرگ سے ظاہری ملاقات ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی تو اتنی بار ہوئی محض فضول اور لغو ہے۔ اس موقع پر جن حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ روحانیت اور خلوص پر مبنی تھا اور ان میں ظاہری تکلف کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ہر بزرگ نے حضرت والا کو نظر بھر کر دیکھا اور ہر پہلو سے دیکھا۔ ان کی بلندی کا اعتراف کیا۔ ان کے مرشد کی مشاطگی کو تسلیم کیا۔ غوث پاک (متوفی ۵۶۱ھ) نے دل کھول کر تواضع فرمائی اور ارشاد کیا کہ یہ مرد مقتدائے روزگار ہوگا اور لوگ اس سے منزل مقصود کو پہنچیں گے۔ شیخ ابوالنجیب نے جو شیخ شہاب الدین کے چچا اور پیر تھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی محبت وشفقت سے نوازا۔ شیخ شہاب الدین کا ابتدائی زمانہ تھا(1)۔ انہوں نے ادب اور خاطر ومدارات میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اوحد الدین کرمانی تو اس درجہ والہ وشیدا ہوئے کہ مفارقت نہ برداشت کر سکے۔ ہمراہ ہو لئے۔ غرض جملہ بزرگوں نے قدر فرمائی اور برابر والوں نے احترام کیا۔ حضرت والا نے ہر بزرگ کی محبت کا علیٰ فرق مراتب جواب دے کر اپنے مرشد کا نام روشن کیا۔

بغداد میں دریا کنارے جھونپڑی میں ایک تارک الدنیا درویش سے ملاقات ہوئی۔ اپنی ترک دنیا کی وجہ بتائی کہ ایک رئیس کو جو لین دین میں جبر وتعدی سے کام لیا کرتا تھا۔

1۔ شیخ الشیوخ کا سال پیدائش ۵۳۹ھ ہے گویا حضرت والا سے چھ سال چھوٹے تھے۔ اور اس ملاقات کے وقت ان کی عمر ۲۲ سال تھی۔

میں نے جبر سے باز رہنے کی جب فہمائش نہیں کی تو غیب سے آواز آئی کہ اگر حق پرستی کے اصول پر اس مالدار کو تنبیہ کر دی جاتی تو ممکن تھا کہ وہ اللہ سے ڈرتا اور جبر و سختی سے باز آ جاتا۔ بس اس روز سے میں نے عہد کر لیا کہ نہ دنیا داروں سے ملوں گا اور نہ آئندہ مجھ سے جواب طلب ہوگا (اس عذر اور توجیہ میں قیل وقال کی بڑی گنجائش ہے) بہر حال شام کے وقت غیب سے کھانا اور پانی ملا۔ اور دونوں نے روزہ افطار کیا رخصت کے وقت اس درویش نے مصلے کے نیچے سے دو سیب نکال کر دیے (دلیل العارفین مجلس ۴)۔

بصرہ

ایک درویش کے ساتھ قبرستان میں جانا ہوا۔ وہ صاحب کشف تھے۔ ان کو محسوس ہوا کہ قریب کی قبر کے اندر عذاب ہو رہا ہے، نعرہ مار کر گر پڑے، بے ہوش ہو گئے، مر گئے اور جسم پانی ہو کر نمک کی طرح بہہ گیا۔ فرمایا ایسا خوف میں نے کسی پر طاری ہوتے نہ دیکھا نہ سنا (دلیل العارفین مجلس ۴)۔

شام کا نامعلوم شہر

اس شہر کے غار میں شیخ محمد الواجدی غزنوی رہتے تھے۔ ان کے جسم پر سوائے پوست کے کچھ نہ تھا۔ دو شیر ان کے پاس کھڑے تھے۔ مجھے ان سے خوف معلوم ہوا۔ فرمایا ڈرو نہیں۔ اگر تم کسی پر حملہ نہیں کرو گے تو وہ بھی تم پر حملہ نہیں کرے گا۔ جس دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے۔ اس سے مخلوق خود خوف کیا کرتی ہے۔ غرض اسی طرح کی بہت سی نصیحتیں فرمائیں اور کہا کہ بزرگی حاصل کرنے کے لئے درویشوں کی خدمت لازمی ہے۔ پھر بتایا کہ اس غار میں مدت سے ہوں، اور تیس سال سے ایک خاص بات کے متعلق رو رہا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر ذرہ برابر بھی شرط نماز پوری نہیں ہوتی تو سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔ نماز کے حق سے عہدہ برآ ہونا بہترین کمال ہے۔ پھر حدیث رسول ﷺ سنائی کہ اللہ کے نزدیک کوئی گناہ دنیا میں اور کوئی دشمن قیامت میں اس سے زیادہ بڑھ کر نہیں کہ نماز کو شرائط کے ساتھ ادا نہ کیا جائے۔ نماز کا عہدہ بڑا بزرگ ہے۔ اگر سلامتی کے ساتھ عہدہ برآئی ہوگئی تو خلاصی ہے،

ورنہ منہ دکھانے کی جگہ نہیں۔ (دلیل العارفین مجلس ۲)۔

ایک شہر حرمین کی راہ میں

یہاں اسلم طوسی کے صاحبزادے سے ملاقات ہوئی۔ جب وہ عالم صحو میں آئے تو نصیحت فرمائی کہ درویشوں کی خدمت سے قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ طریقت میں ہوائے نفس حرام ہے۔ جو دام ملیں ان کو جمع کرنے کے بجائے خرچ کر دینا، خلقت سے عزلت رکھنا اور سوائے حق تعالیٰ کے کسی اور سے مشغول نہ ہونا۔ اتنا کہہ کر وہ پھر عالم تحیر میں غرق ہو گئے۔ (فوائد السالکین ص ۱۴۰)۔

اصفہان

شیخ محمود اصفہانی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مراتب روحانی کو سمجھا، بے حد محظوظ ہوئے اور نکات معرفت پر گفتگو ہوئی۔ ان کی ہی محفل میں خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر پہلی مرتبہ نگاہ ڈالی (1)۔

ہمدان

یہاں کی روداد نہیں لکھی گئی ہے۔ ملفوظات میں شیخ یوسف ہمدانی کی ملاقات اس لئے غلط ہے کہ ان کا وصال ۵۳۲ھ میں ہو چکا تھا۔

رے

یہ شہر بغداد کی تجارتی شاہراہ پر واقع ہے۔ آتے جاتے حضرت والا متعدد مرتبہ یہاں سے گزرے ہوں گے۔ مگر یہاں کے متعلق کوئی خاص واقعہ درج نہیں ہے۔

تبریز

حضرت جلال الدین تبریزی کے پیرو مرشد شیخ ابو سعید تبریزی سے ملاقات ہوئی اور کچھ عرصہ ان کی صحبت بابرکت میں قیام کیا۔ مگر حضرت جلال الدین تبریزی کا اس موقع پر

1۔ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کا سال ۵۸۲ھ بتایا گیا ہے۔ لیکن غریب نواز کے سیاحت کے زمانہ ۶۵۔۵۶۱ھ میں خواجہ قطب صاحب کا پہلی مرتبہ تعارف ہوا۔ لہٰذا ان کا سال پیدائش ۵۸۲ھ صحیح نہیں مانا جاسکتا۔

ذکر نہیں ہے۔

استر آباد

شیخ ناصر الدین سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر ایک سو ستر سال کی تھی۔ اور وہ دو واسطوں سے شیخ بایزید بسطامی سے نسبت رکھتے تھے۔

خرقان

شیخ ابوالحسن خرقانی کے مزار پر حاضری دی۔

چشت

چند صاحب جمال بزرگوں کے ساتھ حضرت یوسف چشتی کی خانقاہ میں پہنچ کر سماع میں شرکت کی۔ جب یہ اشعار پڑھے گئے:

عاشق بہوائے دوست بیہوش بود   وزیاد محبت خویش مدہوش بود

فرداکہ بہ حشر خلق حیران باشد   نام تو دردن سینۂ و گوش بود

تو سب لوگ سات شب و روز وجد و رقص میں رہے۔ اور برابر یہی اشعار پڑھواتے رہے۔ ایک درویش زمین پر گر کر ایسے بے ہوش ہوئے کہ درمیان سے غائب اور لاپتہ ہوگئے۔ (دلیل العارفین مجلس ۴)

یہ روایت بھی پائی جاتی ہے کہ پیران سلسلہ کی خصوصیت کی وجہ سے حضرت والا نے نواح چشت میں تقریباً دو سال قیام کیا ہے۔ جائے قیام کوئی میمنہ بتاتا ہے اور کوئی خرقان ظاہر کرتا ہے۔ لیکن میمنہ و خرقان کو بوجہ فاصلہ دراز ہرگز نواح چشت نہیں کہا جا سکتا۔

بدخشاں

حضرت جنید بغدادی کے پوتے سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر ایک سو چالیس سال کی تھی اور ان کا ایک پاؤں کٹا ہوا تھا۔ وجہ یہ بتائی کہ چالیس سال ہوئے اعتکاف چھوڑ کر کسی اور ہی کام کی غرض سے میں نے باہر جانے کا ارادہ کیا تو آواز آئی کہ اے مدعی تو اپنے عہد کو ہو کر اسی وقت میں نے اپنا پیر کاٹ ڈالا اور اب تک یہی فکر ہے کہ بدعہدی کی وجہ سے اپنا

کالا منہ کس طرح دکھاؤں گا۔ (انیس الارواح ص ۳۰۲)

سنجار

حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اور کچھ عرصہ ان کی خدمت میں قیام کیا(1)۔

جیل

یہاں پہنچ کر حضور غوث پاک کے مزار پر چلہ کیا۔ حجرہ اعتکاف موجود ہے لیکن جیسا کہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ جیل و سنجار کا سفر اپنے مرشد کے ساتھ کیا تھا، صحیح نہیں ہے۔ اسی واسطے ان دونوں مقامات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ ۵۶۱ھ میں حضور غوث پاک کا وصال ہو چکا تھا۔ مرشد کی معیت کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔

کرمان

شیخ اوحد الدین کرمانی(2) ہمسفر تھے۔ ایک نحیف و لاغر درویش سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ضمیر پر مطلع ہو کر انہوں نے جواب دیا کہ ایک دن دوستوں کے ساتھ قبرستان میں بیٹھا ہوا تھا۔ کسی بات پر مجھے ہنسی آ گئی۔ ایک قبر سے آواز آئی کہ اے غافل! جسے مقام گور در پیش ہو اسے ہنسنے سے کیا واسطہ۔ یہ سن کر دوستوں سے رخصت ہوا۔ اور اس غار میں اس وقت سے مقیم ہوں، قبر کی ہیبت سے پگھلا جاتا ہے اور چالیس برس سے بوجہ شرمندگی آسمان کی طرف نہیں دیکھا ہے۔ (دلیل مجلس ۴)

بخارا

یہاں ایک درویش سے ملاقات ہوئی۔ یاد الٰہی میں مشغول تھے اور نابینا تھے۔ وجہ یہ بتائی کہ وحدانیت اور جلال عظمت پر میری نگاہ پڑنا شروع ہوئی تھی کہ اتفاقیہ نگاہ غیر پر جا پڑی۔ آواز آئی: ''ہماری محبت کا دعویٰ اور نگاہ غیر کی طرف''۔ میں نے منفعل ہو کر اپنے

1۔ چنگیز خان کے حملہ گرگنج میں (۶۱۵ھ/ ۱۲۲۲ء) میں شہید ہوئے جبکہ حضرت والا اجمیر میں متمکن تھے۔

2۔ دمشق میں شیخ محی الدین عربی کے مزار کے قریب شیخ فخر الدین عراقی اور اوحد الدین کرمانی کے مزارات ہیں۔

اندھے ہونے کی دعا کی۔فوراً بینائی جاتی رہی۔(دلیل مجلس دہم)

سمرقند

حضرت ابواللیث کے محل کے قریب ایک مسجد تعمیر ہو رہی تھی اور سمت کعبہ کے متعلق تجسس تھا۔ایک عالم نے وثوق سے ساتھ سمت کعبہ تعین کر دی۔جس پر مجھے اعتراض ہوا۔ عالم کی منطق نے جب میری بات نہیں مانی تو میں نے ان کی گردن پھیر کر اپنی بتائی ہوئی سمت کو ان کا منہ کر دیا۔جب کعبہ ان کو دکھائی دے گیا تو قائل ہوئے۔(دلیل مجلس ششم)

سفر سمرقند و بخارا میں گزشتہ علمی صحبتوں کی یاد آ جانا تعجب کی بات نہیں۔لیکن حضرت والا جس عالم و کیفیت میں تھے وہ یاد گزشتہ سے بے نیاز تھی اور وہ یاد کیفیت میں حارج نہیں تھی۔ غرض دیکھنے اور دکھانے اور سبق لینے اور دینے کے ساتھ مرشد کی یاد برابر جوش کرتی رہی۔ ہزاروں مرتبہ قلبی طور پر التجائیں کیں کہ جدائی کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں۔لیکن جواب میں ایک بے نیازی تھی۔جس پر کوئی زور اور اختیار نہیں تھا۔یہاں پہنچ کر جب آتش شوق حد سے گزر گئی تو جرأت کر کے سیدھی بغداد کی راہ لی۔خوف تھا کہ حاضری پر عتاب نہ ہو مگر راستہ کے تمام مناظر گواہی دے رہے تھے کہ طلبی ہے۔

تذکرہ نویسوں نے اس مدت فراق کا تعین کیا۔صاحب معین العارفین نے اپنی جدت بھری تحقیق سے بارہ برس کی مدت ٹھہرائی ہے۔جدائی کی گھڑیوں کا شمار قلب مہجور ہی کر سکتا ہے۔اور محتسب سے ممکن نہیں۔بارہ برس تو قیامت برپا کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ مجاہدے کی غرض سے اڑھائی سال مرشد نے اپنے پاس رکھا تھا۔اس مدت فراق کو پانچ چھ سال سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔بہر حال بغداد پہنچ کر لرزاں و ترساں مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔دیکھا کہ حضرت شیخ ہمہ تن اشتیاق بنے بیٹھے ہیں۔اور مسرت رونگٹے رونگٹے سے ٹپک رہی تھی۔مقناطیسی کشش سے بے اختیار بجلی کی سرعت کے ساتھ سر نیاز قدموں پر رکھ دیا۔عقیدت و نیازمندی کی فراوانی نے سماں باندھ دیا کہ۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

باب ۴

سفر مرشد کی معیت میں

۵۶۷ھ تا ۵۸۴ھ.....عمر ۳۳ سال تا ۵۰ سال

پہلے سفر کی واپسی کے بعد قیام کی مدت نہیں بتائی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان روحانی بزرگوں کے سفر جس قدر بامعنی ہو سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کے قیام بھی وقیع ہوا کرتے ہیں۔ واقفان حقیقت سے پوشیدہ نہیں کہ صحبت مرشد از بس ضروری ہے۔ شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ۔

موت بھی زندگی کا وقفہ ہے　　　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مدت قیام کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے اصل حقیقت پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن عقل و فراست کا خون ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اس موقع سے حضرت والا نے مرشد کی خدمت میں کتنا وقت گزارا۔ تکان سفر کو دور کرنا یا داستان کو دہراتے نیا پرانا ہو جانا مدعائے قیام نہیں۔ بلکہ اس کا مقصود تربیت و فیوض ہے۔ جس طرح ہجر و فراق سے عشق میں پختگی آتی ہے۔ اسی طرح وصل و قیام سے پامردی و توانائی حاصل ہوتی ہے۔ پیر و مرشد چاہتے تھے کہ ہجر و وصل کے منازل طے کروا کر گوہر مقصود کو مدینہ لے جائیں اور حضور نبوی میں پیش کر کے قبولیت کی سند اور مراتب علیا دلوائیں۔ لہٰذا اس قیام کے زمانے میں نہ صرف اخلاق و سلوک باہمی کی تعلیم پائی۔ بلکہ حضرت والا نے حاضرین دربار اور شرکائے مجلس سے رسم و راہ پیدا کر کے ان کے ضمائر و طبائع کا بھی مطالعہ کیا۔ مدت قیام چند ماہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ گویا اس طرح ۵۶۶ھ ختم ہو گئی۔

ایک روز حسب معمول پیر و مرشد مجلس میں تشریف لائے اور اچانک طور پر ظاہر کیا کہ ہمارا ارادہ سفر کا ہے۔ پھر مسکرا کر حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا: ”اگر تمہارا جی

چاہے تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو''۔ یہ خوشی سے اچھل پڑے۔ سر تسلیم خم کر دیا اور معیت خضر کے تصور میں مزے لینے لگے۔ ہمرکابی کو شرف سعادت سمجھا مگر اس کی نوعیت کچھ اور بھی تھی۔ جذب محبت سے یقین پیدا ہوتا ہے۔ بقا باللہ اس کا مقصد وحید ہے۔ یہ بقا حواس کھو کر بھی حاصل کی جاتی ہے اور عقل و ہوش کو رکھ کر بھی۔ کوئلہ کا راکھ ہو جانا بھی صحیح ہے اور انگارا ہو جانا بھی درست ہے۔ اس سفر میں یہی راز سمجھانا تھا اور طبیعت کا رجحان دیکھنا تھا کہ کس سمت کو ہے۔ سوز محبت کا خدمت خلق میں منتقل ہو جانا مرتبہ ابراہیمی ہے جس کی تکمیل رسول عربی ﷺ نے کی تھی۔ مرشد کامل نے پہلے ہی مجذوبیت کو راہ پر لگا کر سلوک کی طرف مائل کر دیا تھا۔ اب اس سفر میں اس مقام پر قائم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ ایسے حضرات کا بھی مشاہدہ کروایا جو ذات الٰہی میں فانی ہو کر باقی بن چکے تھے۔ اور ایسے حضرات سے بھی ملایا جو اپنے سلوک کی خدمت کر کے درجہ بقا میں پہنچ چکے تھے۔ حضرت والا کو مرشد کی معیت پر مسرت تھی مگر بلائے صحبت لیلیٰ سے بھی مفر نہ تھا۔ فی الواقع سفر کے نام سے آزمائش منظور تھی اور ایک انقلاب مقصود تھا۔ یہ زندگی فانی انقلاب ہی تو ہے۔ رنج ہو یا راحت، یہ سب منقلب ہیں۔ خدمت مرشد اس سفر کی خصوصیت تھی۔ اور اسی پر کامیابی کا دارومدار تھا۔ بہر حال ترقی مراتب کی امید کے ساتھ ادب کے قیود بھی اس سفر میں ہمعنان رہے۔

مرشد کی رفاقت میں سفر کی مدت بیس سال ظاہر کی جاتی ہے۔ انیس الارواح میں ہے کہ ''اس طرح دس سال میں خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سفر کرتا رہا۔ پھر سفر سے واپس آ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اس کے بعد پھر دس سال تک توشہ و بستر سر پر لئے ہوئے سفر کرتا رہا اور واپسی میں پھر گوشہ نشینی اختیار فرمائی''۔ اس کے برخلاف دوسری کتاب گنج الاسرار میں تحریر ہے کہ ''میں بحالت مسافرت بائیس سال تک اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ رہا'' لیکن حضرت والا کے ان دونوں مفروضہ بیانات کے باوجود خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ دلیل العارفین میں ناقل ہیں کہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جب میں شیخ الاسلام سلطان المشائخ خواجہ عثمان ہرونی نور اللہ مرقدہ کا مرید ہوا تو آٹھ سال

تک ان کی خدمت میں ایک دم بھی آرام نہیں کیا۔ جب میری خدمت دیکھی تو ایسی نعمت عطا فرمائی جس کی کوئی انتہا نہیں ان تینوں روایتوں کی جس طرح بھی تاویل کی جائے مگر بیس برس کی خدمت مشکوک ہوگئی اور قابل اعتماد نہیں۔ انیس الرواح میں پہلے دس سال کے سفر کے چند مقامات مذکور ہیں مگر دوسرے دس سال کے سفر کا ایک مقام بھی نہیں بتایا گیا ہے۔
سیر الاولیاء، سیر الاقطاب، اخبار الاخیار، مونس الارواح اور سفینۃ الاولیاء میں لکھا ہوا ہے کہ بیس سال خدمت شیخ میں رہے اور اس مدت میں دس سال سفر کئے ہیں۔ اگر چہ جائے دم زدن نہیں۔ مگر ان روایات کی موجودگی کے باوجود درمیانی وقفہ قیام کو شامل کر کے مدت سفر سترہ سال سمجھنا زیادہ مناسب ہے۔ یعنی دلیل العارفین کی روایت کے مطابق ایک سفر کی مدت آٹھ سال ہے۔ لہٰذا دونوں سفر کی مدت آٹھ آٹھ سال فرض کر لی جائے اور درمیانی گوشہ نشینی کو ایک سال یا اس سے کچھ کم قرار دیا جائے۔ بغیر تعین سمت و ترتیب اس حساب سے مرشد کے ساتھ سفر کے حصہ اول کی مدت ۵۶۷ھ سے لے کر ۵۷۵ھ تک مان لی جائے۔ بہر حال تفصیل سفر یہ ہے:

نامعلوم شہر براہ کعبہ

سفر کعبہ میں پہلا مسافر میں ہی تھا۔ ایک شہر میں پہنچ کر ہم نے مقربان خدا کی ایک جماعت دیکھی جن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ ان کے پاس چند روز قیام کیا۔ مگر وہ عالم ہوش میں نہیں آئے۔ (انیس الارواح صفحہ ۲)

دمشق

خواجہ عثمان ہرونی، اوحد الدین کرمانی اور میں مدینہ کی طرف جاتے ہوئے دمشق پہنچے۔ یہاں کے مزرات سے مشرف ہوئے اور بزرگوں سے ملے۔ ایک دن ہم تینوں محمد عارف کی معیت میں دمشق کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ برابر میں چند درویش اور بھی قیام فرماتے تھے۔ محمد عارف نے کہا کہ قیامت میں مالداروں سے حساب ہوگا۔ اور درویش معذور ہوں گے۔ ان درویشوں میں سے ایک کو یہ بات قبول نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس نے دریافت کیا

کہ کس کتاب میں ایسا حکم درج ہے۔ محمد عارف کو کتاب کا نام یاد نہ تھا۔ اس نے مراقبہ کیا اور روحانی طور پر اس درویش کو وہ کتاب معائنہ کرا دی۔ بعد ازاں گفتگو یوں چلی کہ حاضر الوقت اپنی اپنی کرامات دکھائیں۔ حضرت شیخ نے مصلے کے نیچے سے تنکہائے زر نکالے، حلوہ منگایا اور سب کو تقسیم کیا۔ اوحد الدین کرمانی نے لکڑی پر ہاتھ رکھا وہ سونا ہو گئی۔ میں ازراہ ادب خاموش بیٹھا تھا تو مجھ سے بھی اصرار ہوا۔ لہٰذا میں نے بھی اپنی گلیم میں سے جو کی روٹیاں نکالیں اور قریب والے درویش کو دے دیں جو بھوکا بھی تھا اور سوال سے بھی گریز کرنا چاہتا تھا۔ آخر میں محمد عارف نے کہا کہ جس میں اتنی قوت نہ ہو اسے درویش نہیں کہنا چاہئے۔ (دلیل العارفین مجلس نہم)۔

ان جملہ کرامات پر تبصرہ بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔ حضرت والا کی کرامات دوہرے معنی رکھتی ہیں اور دقیق ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

مدینہ منورہ

روضہ اطہر پر پہنچ کر مجھے حکم ہوا کہ سلام کرو۔ میں نے سلام عرض کیا روضہ مطہر کے اندر سے جواب ملا: ''وعلیکم السلام یا قطب المشائخ بحر و بر'' یہ سن کر ارشاد کیا کہ بس تمہارا کام بن گیا۔ (انیس الارواح ص ۳) صلو اعلیه و آله۔

مکہ معظمہ

خانہ کعبہ کی زیارت کی حضرت شیخ نے میرا ہاتھ پکڑ کر خدا کے سپرد کیا اور خانہ کعبہ کے پرنالے کے نیچے کھڑے ہو کر میرے لئے دعا فرمائی۔ ندا آئی: ''ہم نے معین الدین کو قبول کیا''۔ (انیس الارواح ص ۳) سبحان الله و بحمده۔

کنار دجلہ

جب ہم کنار دجلہ پہنچے تو کشتی نہیں ملی۔ فرمایا آنکھیں بند کر لو۔ پھر جب آنکھیں کھولیں تو ہم دوسرے کنارے پر تھے۔ (دلیل مجلس ہفتم)۔

بخارا

یہاں کے بزرگوں کو اور ہی حالت میں پایا۔ ان کے وصف تحریر میں نہیں آسکتے۔ گویا بے خودی طاری تھی۔ (انیس الارواح ص ۳)۔

اوش

شیخ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ ایک درویش اور میں ہم سفر تھے۔ ہم نے شیخ بہاء الدین بختیار (1) اوشی کو بزرگ پایا۔ ان کی خانقاہ کا دستور یہ تھا کہ جو آتا خالی ہاتھ نہ جاتا۔ اگر ننگا ہوتا تو نفیس کپڑے مرحمت فرماتے اور پھر غیب سے ویسے ہی کپڑے آجاتے۔ چند روز ان کی خدمت میں گزارے۔ نصیحت فرمائی کہ جو کچھ ملے راہ خدا میں صرف کردو۔ اور بندگان خدا کو کھانا کھلاؤ، تاکہ اللہ تعالیٰ کی دوستی حاصل ہو۔ (دلیل مجلس دہم)۔

سیوستان

صومعہ میں چند دن صدر الدین محمد احمد شیوستانی سے صحبت رہی۔ جو شخص ان کے یہاں آتا، محروم نہ جاتا۔ عالم غیب سے اسے تحفہ دیتے اور استدعا کرتے کہ میری سلامتی ایمان کی دعا کرو۔ اگر قبر میں ایمان سلامت لے گیا تو گویا بڑا کام کیا۔ الغرض موت اور قبر کی ہیبت سے کانپ جاتے اور خون کے آنسو بہاتے۔ (دلیل مجلس چہارم)

یہ مقام وہ تھا جس کے ایک قصبہ میں حضرت والا کا آبائی وطن تھا۔ یہیں پیدائش ہوئی تھی۔ یہیں نشو ونما پائی تھی۔ اس کے گلی کوچے کشش رکھتے تھے۔ یہاں لاکر حب وطن کا امتحان کرنا تھا مگر یہ عارضی وطن تھا۔ وطن کی محبت فطری شے ہے۔ مگر رجوع اصل ہی کی طرف ہوا کرتی ہے۔ یہ کڑی منزل تھی۔ مگر مرشد کی توجہ سے اصلی وطن پر نگاہ رہی۔ اور عارضی وطن کی الفت بے کار ہو کر رہ گئی۔ اس کل سفر کا حاصل یہ تھا کہ حضرت والا کے متعلق

1۔ بختیار لقب نہیں ہے بلکہ خاندان ہے۔ بختیاری قبیلہ فرغانہ والے اوش سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ مضافات بغداد والے اوش سے متعلق ہے۔ مگر خواجہ قطب الدین اوشی رحمۃ اللہ علیہ کا اس خاندان سے تعلق نہیں۔ بلکہ خواجہ بزرگ نے ان کو بختیار کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

دربار رب العزت میں دعا قبول ہو چکی تھی۔ بارگاہ نبوت سے مقبولیت کی سند مل چکی تھی۔ اور اپنی معیت میں تمام اوصاف سے مزین فرما چکے تھے۔ خدمت وادب دیکھ کر خود بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ لہٰذا واپسی کی ٹھہرائی۔ بغداد واپس آ کر خالق بے نیاز کا شکریہ ادا کرنے کے لئے معتکف ہو گئے۔ مرشد کی گوشہ نشینی کے دوران میں حضرت والا کو ان کی نیابت ملی اور اخلاق کریمانہ سے ہر ایک کو انہوں نے خوش کیا اور راضی رکھا۔ کیفیت قیام و نیابت حسب معمول پردہ خفا میں ہے۔ یہاں محض ان چند حضرات کے اسمائے گرامی درج کر دینا جو شرکائے مجلس تھے۔ حضرت والا کے مرتبہ کی رفعت کی وضاحت کرنے کو کافی ہے۔

شیخ اوحدالدین کرمانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ داؤد کرمانی، شیخ برہان الدین محمد چشتی، شیخ تاج الدین محمود اصفہانی، مولانا بہاء الدین بخاری صاحب تفسیر، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی، شہاب الدین محمد بغدادی، مولانا عماد الدین بخاری، خواجہ اجل شیرازی، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ علی سنجری، شیخ واحد برہان غزنوی، خواجہ سلیمان عبدالرحمٰن، شیخ محمد احد چشتی، شیخ محمد صفاہانی، وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ یہ وہ حضرات تھے جو خواجہ عثمان ہرونی کے حاضر باش تھے۔ اور نیابت کے زمانے میں جن کو حضرت والا سے سابقہ پڑتا ہے۔

سفر دوم مرشد کے ساتھ (۵۸۴۔۵۷۵ھ)

گوشہ نشینی اور اعتکاف کا حاصل اگر اہل نظر نہ پالیں مگر گفتنی نہیں اور نہ اس کو حصر وقید میں لایا جا سکتا ہے۔ بہر حال ایک روز عزم واستقلال کے تیر و تفنگ سے مرصع ہو کر حضرت خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں اس شان سے جلوہ افروز تھے گویا۔

بھویں تنی ہیں۔ خنجر ہاتھ میں ہے۔ تن کے بیٹھے ہیں۔

یکبارگی نہایت بے رخی سے اعلان کیا: ''ہمیں ایک سفر درپیش ہے''۔ پھر خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اور تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے''۔ عادت تسلیم و تقاضائے ادب کی وجہ سے نہیں بلکہ جلال سے مرعوب ہو کر یہی کہتے: ''بہت خوب''۔

اس سفر کے مقامات وحالات کہیں مذکور نہیں۔ بزعم خود تذکرہ نویسوں نے قیاس کر کے سفر اول کے بعض مقامات اس سفر دوم کے تحت دکھا دیے ہیں۔ لیکن کیا وجہ کہ اس سفر کو روحانی سیر سے موسوم نہ کیا جائے جس میں مادی تگ و دو کو مطلق دخل نہیں۔ چونکہ مقامات عام نگاہوں سے بلند تھے اور عالم بالا سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے احاطہ تحریر میں نہ آسکے۔ پہلے مشرق ومغرب کا گشت لگوانے کے بعد اس مرتبہ اگر عرش اعظم اور تحت الثریٰ کی سیر اپنے ساتھ کرائی ہو تو جائے حیرت نہیں۔ وقت بیعت جو مشاہدات اپنی روحانی قوت سے کروا دیے تھے۔ وہ اس مرتبہ حضرت والا کی ذاتی روحانی قوت سے ادا کروائے گئے۔ اس عجیب و غریب سفر کی داستان سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ دنیا و مافیہا سے علیحدہ رہے اور بے خودی طاری رہی۔ اس کے بعد خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عزلت نشینی جاری رکھی اور حضرت والا کو حکم دیا کہ چاشت کے وقت آجایا کرو تا کہ مریدوں اور فرزندوں کے لئے تعلیم فقر کے متعلق کچھ لکھوا دیا کریں۔ چنانچہ اٹھائیس دن میں انیس الارواح کی اٹھائیس مجلسیں مرتب کروا دیں۔ لیکن انیس الارواح کی جو نقل ہم تک پہنچی ہے۔ وہ اس دعویٰ کو پورا نہیں کرتی۔ کسی صاحب نظر کو کوئی نکتہ فقر اس میں مل جائے تو مل جائے۔ ورنہ اس میں ظاہری تعلیم کے علاوہ باطنی تعلیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور پھر ذاتی روایات وقصص نے اس دعویٰ ارشاد کو اور بھی کمزور کر دیا ہے۔ بہر حال آخری مجلس میں فرمایا:

''اے معین الدین میں نے تمہارے حال کو کمالیت پر پہنچا دیا۔ تم اپنی ذمہ داری محسوس کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت میں شرمندگی ہو''۔

ان الفاظ کے ساتھ عصا، خرقہ، نعلین اور مصلیٰ بھی دیا اور ارشاد فرمایا کہ ''یہ ہمارے پیروں کی یادگاریں ہیں۔ جو رسول اللہ ﷺ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ جیسی ہم نے ان کی حفاظت کی ویسی ہی تم بھی کرنا اور جس مرد خدا کو اہل سمجھنا اپنی طرف سے حوالے کر دینا''۔

یہ فرماتے ہی بے ساختہ مجھ سے بغلگیر ہو گئے اور کہا ''تمہیں خدا کے سپرد کیا''۔

سپردم بتو مایہ خویش را

باب ۵

عطیہ ولایت ہند

پسلی پھڑک اٹھی نگہ انتخاب کی

(۵۸۵ھ)

قبض و بسط کو خزاں و بہار سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔قبض و خزاں میں پھول تو پھول کانٹے بھی سوکھ جاتے ہیں۔ اور بسط و بہار میں سبزہ خوابیدہ میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ خلافت عطا کرنے کی مسرتوں اور فراق و جدائی کے مہیب تصوروں کو بہار و خزاں ہی کہا جا سکتا ہے۔مگر شیخ و خلیفہ اس منزل میں تھے جہاں قبض کے کوئی معنی ہی نہیں ہوتے۔ مسرت و جدائی کی کیفیتوں کو شیخ عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے عالم تحیر میں غرق کر دیا۔اور خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے سکوت کی نذر کیا۔خلافت کی ذمہ داریوں سے جب حضرت والا کو ہوشیار کیا تو فکر ہوئی کہ کیا کریں۔ روانگی کی ٹھہرائی۔ خیر باد کہنے سے پہلے صاحب اختیار بن جانے کی مبارک بادیوں کے جواب میں شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہما کو ازراہ محبت و دوستی خرقہ عطا کیا۔ اور یہی شایان شان بھی تھا۔ پھر مسجد ابواللیث سمرقندی میں تزک و احتشام کے ساتھ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی کو بیعت سے مشرف کیا(1)۔ اور حکم دیا کہ وطن جا کر انتظار کریں۔ اس کے بعد موقع بموقع دوسرے صاحبان کے ساتھ برہان الدین چشتی کو بھی بیعت سے شادکام کیا اور پھر بغداد سے چل دیے۔

1۔خواجہ قطب صاحب کی ملاقات اصفہان ۵۶۳ھ اور واقعہ بیعت بغداد ۵۸۵ھ میں ہمارے حساب سے بائیس سال کا فاصلہ ہے۔ان کی پیدائش ۵۸۲ھ میں بتائی گئی ہے۔اور یہ صحیح نہیں ہوسکتی۔ وقت ملاقات ان کی عمر اگر پندرہ سال کی تھی تو وقت بیعت عمر شریف ۳۶ یا ۳۷ سال ہونی چاہئے۔ گویا مرشد سے پندرہ سال چھوٹے تھے اور انکی پیدائش کا سال ۵۴۸ھ ہوسکتا ہے۔

بیعت وارادت میں فرق

کہتے ہیں کہ مرید ارادت سے ماخوذ ہے جو شخص کسی سے ارادت کرے تو سمجھا جاتا ہے کہ بیعت ہوگئی۔ لیکن ارادت و بیعت میں فرق ہے۔ ارادت سے مدعا حصول علم ہے۔ اور بیعت کا مفہوم ہے پابند ہو جانا۔ ارادت مرید کا فعل ہے اور بیعت شیخ کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ ہر ارادت مند کو بیعت بھی حاصل ہو۔

اس مرتبہ حضرت والا جب سفر پر روانہ ہوئے تو مدعا نہ صرف حزب اللہ میں بھرتی کرنے کا تھا۔ بلکہ حرمین شریفین پہنچ کر نعمت خداوندی کا شکریہ ادا کرنا اور توفیق طلب کرنا بھی تھا۔ بغداد سے روانہ ہو کر لوگوں کو مرید کرتے ہوئے مضافات بغداد میں بمقام اوش پہنچے۔ جہاں خواجہ قطب صاحب حج میں ساتھ چلنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔

حضرت والا کی ہمرکابی میں اب چالیس صاحب ہو گئے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام کی ابتداء میں جب چالیس حضرات رسول مقبول ﷺ کے دست مبارک پر ایمان لے آئے تھے تو اللہ جل شانہ نے اسلام کو وہ رفعت مرحمت فرمائی تھی۔ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت والا نے اسی حقیقت کا واسطہ دیا۔ جواب ملا ''وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ'' (محمد:35)۔

اے معین الدین! ہم نے تمہیں اور تمہارے مریدوں کو فتح ونصرت عطا کی۔ یہ مژدہ سن کر حضور بے نیاز میں سربسجود ہوئے اور شکریہ ادا کیا جیسا کہ چاہئے تھا۔ اس کے بعد یہاں سے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ دربار رسالت میں سلام وصلوٰۃ پیش کئے، دل بھر آیا، گریہ طاری ہو گیا، بشارت ہوئی۔ معین الدین تم عین دین ہو۔ تمہیں ہندوستان کی ولایت دی جاتی ہے۔ اجمیر کو اپنا مستقر بناؤ۔ اور ایک انار شیریں مرحمت ہوا۔ ہوشیار ہوئے تو سلام وصلوٰۃ میں شکریہ کا رنگ جھلک مار رہا تھا۔ مگر فکر یہ ہوئی کہ اجمیر کہاں ہے۔ روحانی طور پر اسی روحانی انار شیریں کے گلوب پر اجمیر جانے کا راستہ دکھا دیا گیا۔

خواجہ ابو محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ باوجود کبر سنی کے سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ غزوہ

سومنات میں شریک ہوئے تھے۔ اور نازک مواقع پر اپنی توجہ و دعا سے سلطان کی مدد فرماتے تھے۔ غالباً ان ہی کی تمنا تھی کہ ہندوستان میں اشاعت اسلام ان کے خاندان کے ذریعہ سے ہو۔ اور وہ اس طرح وجود میں آئی۔ جب دیکھا کہ اجمیر مکہ معظمہ سے مشابہت رکھتا ہے اور اس میں دیار حبیب کی شان نمایاں ہے تو مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اب چین کہاں تھا۔ بیتابی نے مجبور کیا اور مع چالیس رفیقوں کے بغداد پہنچ کر دم لیا۔ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مژدہ ماجرا کہہ سنایا۔ خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ پھولے نہ سماتے تھے۔ مگر تواضع و عجز نے ساکت بنا دیا تھا۔ اس کیفیت کا اثر در و دیوار سے نمایاں تھا۔ کل فضا نے مسرت و عجز کی تصویر کھینچ دی تھی۔ آخر کار سکوت دور ہوا اور فرمایا:

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد

دربار رب العزت کے اکرام، رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے انعام اور مرید کامل کے الطاف ایسے نہ تھے کہ سمائی ہو سکتی۔ بیتاب نے مجبور کیا کہ زکوۃ دیں اور بار ہلکا کریں۔ تائید غیبی اور اشارہ رسول سے خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سامنے آ گئے۔ ان میں ہی بار امانت اٹھانے کی اہلیت تھی۔ انہیں جوش کے ساتھ سینے سے لگا لیا اور جو دینا تھا وہ دے دیا۔ عرف عام میں اس کا نام ہوا "عطیہ خلافت"۔ اس وقت خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر عام طور پر سترہ برس لکھی گئی ہے۔ لیکن اہل تدبیر کی درماندگیاں نمایاں ہیں۔ ان کا مسئلہ عمر سال ولادت و سال وصال ان کے وطن اوش کی جائے وقوع کی طرح مابہ النزاع ہے (1)۔

1۔ ایک اوش فرغانہ میں ہے۔ اور ایک اوش اصفہان و بغداد کے قریب ہے۔ واقعات مؤید ہیں کہ حضرت کا وطن اصفہان والا اوش تھا۔ اصفہان میں جب حضرت والا نے خواجہ قطب صاحب پر نگاہ ڈالی تھی تو ان کی عمر ۱۵ سال ہونی چاہئے تھی۔ روایت کے مطابق حضرت قطب صاحب کی مخدومیت دیکھ کر اُن کی شادی اسی زمانہ میں کر دی تھی۔ سال پیدائش ۵۴۸ھ ہوا۔ خواجہ قطب صاحب کا وصال ۶۳۳ھ۔ ۶۳۴ھ اور ۶۴۱ھ میں بتایا جاتا ہے۔ معتبر ۶۳۴ھ ہے۔ لہٰذا عمر شریف ۸۵ یا ۸۶ سال ہونی چاہئے۔

جس وقت حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کو خلافت دی ہے تو بابا صاحب کی عمر ۴۳ سال کی تھی اور قطب صاحب کی ۶۴ سال۔

اسی سال ۵۸۵ھ/ ۱۱۹۰ء میں اسی موقع پر ایک روز ایک لڑکا جس کی عمر بارہ برس کی تھی۔ سامنے سے گزرا۔ حضرت والا نے دیکھتے ہی فرمایا کہ جب تک یہ لڑکا دہلی کا بادشاہ نہ ہوگا۔ خدا اسے دنیا سے نہ اٹھائے گا۔ چنانچہ بعد میں یہ لڑکا سلطان شمس الدین التمش کے نام سے مشہور ہوا(1)۔

فرصت کم تھی زیادہ قیام مناسب نہ تھا۔ شیخ اور خلیفہ دونوں بے قرار تھے۔ آخر کار جدائی کی گھڑی آگئی۔ حضرت والا نے ہندوستان روانہ ہونے کی اجازت طلب کی۔ خواجہ عثمان نے الوداع کہتے ہوئے دور تک مشایعت کی۔ پھر خدا حافظ و ناصر کہہ کر کھڑے ہو گئے اور دیکھتے رہے جب تک کہ دیکھا گیا۔

دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست   تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

(1) التمش کا انتقال ۶۳۳ھ میں ہوا۔ ۵۸۵ھ میں ان کی عمر بارہ برس کی تھی۔ لہٰذا عمر ۵۹ یا ۶۰ سال کی ہوئی اور پیدائش ۵۷۳ھ میں ہوئی۔ واللہ اعلم۔

باب ٦

ہندوستان کی طرف کوچ

سلطان خوباں رود...... گردش ہجوم عاشقاں

(۵۸۶ھ/۹۱-۱۱۹۰ء) عمر ۵۳ سال

اس مرتبہ گرانقدر سامان ہمراہی میں تھا۔ مرشد کے عطا کردہ تبرکات تھے۔ تیر و کمان تھے۔ چقماق و نمکدان تھا۔ اور قرآن پاک تھا۔ قرآن کو سینہ سے خود لگائے ہوئے تھے۔ تبرکات خواجہ قطب صاحب کے سر پر تھے(1)۔ اور بقیہ اسباب دوسروں کے سپرد تھا۔ حضرت والا قافلہ سالار تھے۔ جلو میں جاں نثار چل رہے تھے۔ اور روحانی صورت سے آگے آگے خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ خضر راہ بنے ہوئے تھے۔ اتنی بزرگ ہستیوں کا قافلہ عہد صحابہ کے بعد مشرق کو جاتے ہوئے تاریخ نے شاید ہی دیکھا ہو۔ یہ قافلہ شان و شوکت کے ساتھ آب رواں کی طرح ادھر اُدھر لہریں مارتا ہوا رواں تھا۔ اور انگلیاں سر اٹھاتے تھے کہ وہ آتے ہیں ہر قریہ اور ہر شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔ جوق در جوق مخلوق خدمت میں آتی تھی۔ اور خوش خوش تسکین قلب حاصل کر کے چلی جاتی تھی۔ اس مرتبہ قیام بجائے ویرانوں کے آبادیوں اور باغوں میں کیا گیا۔

سبزوار

بغداد سے جب مختلف مقامات پر جن کے متعلق اہل تذکرہ خاموش ہیں۔ روحانیت کی بارش کرتے ہوئے جب یہاں تشریف لائے تو قیام کے لئے ایک باغ دل پذیر پسند

1۔ایک ضعیف روایت یوں بھی ہے کہ اس موقع پر خواجہ قطب صاحب دوسرے راستے سے روانہ ہو کر دہلی پہنچے تھے۔ دوسری روایت یوں ہے کہ خواجہ قطب صاحب اس مرتبہ ہمراہی میں نہیں تھے۔ بلکہ بعد کو ہندوستان آئے تھے۔ صحیح یہ ہے کہ رفیق سفر تھے۔ اور ان کا شمار چہل تن میں تھا۔

فرمایا۔ یہ باغ محمد یادگار حاکم شہر کا تھا۔ محمد یادگار قرامطی تھا یا باطنی جب سیر کرنے اپنے باغ میں آیا تو بے علم واجازت درویشوں کا وہاں تصرف دیکھ کر بوکھلا اٹھا اور نکال دینے کا حکم جاری کر دیا۔ ان صاحبان نے عتاب کا جواب بے نیازی سے دیا۔ پھر بے تعلقی نے ایک آہنی دیوار درمیان میں کھڑی کر دی۔ غصہ جس قوت سے کیا گیا تھا۔ اسی شدت سے سکوت و بے نیازی کی دیوار سے ٹکرا کر اپنے مخرج کی طرف واپس گیا۔ حاکم شہر جز بز ہو کر اپنے پسپا شدہ عتاب کی تاب نہ لا سکا۔ اس کا جسم کانپا، سر چکرایا اور دھم سے زمین پر گر پڑا۔ لوگ سمجھے فقیروں کی کرامت ہے۔ لیکن درحقیقت یہ حاکم شہر کے عمل کا ردعمل تھا۔ ورنہ ان جیسے اعلیٰ ظرفوں کو معمولی سی بات پر کرامت دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے منہ پر پانی چھڑکا گیا۔ حرارت دور ہوئی تو ہوش آیا۔ قدموں پہ سر رکھ دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اب ایسی خطا قبلہ حاجات نہ ہوگی۔ اپنے باطل عقائد سے توبہ کی۔ اپنے جبر و ظلم پر پشیمانی کا اظہار کیا اور اپنا کل مال و متاع حضرت والا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انفعال میں یہی صورت پیش آیا کرتی ہے۔ جواب میں کہا کہ یہ مال ان لوگوں کو واپس کر دو جن سے یہ جبر سے لیا ہے۔ وقت رخصت اس نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ غالباً درخواست قبول ہوئی اور شاید اس لئے کہ راہ راست دکھا کر اسے تعلیم سے آراستہ کر دیا جائے۔ چنانچہ غزنین پہنچنے سے پہلے کوہ حصار سے اسے واپس کیا تھا اور ہدایت فرمائی تھی کہ اپنی حکومت میں مجبوروں اور مظلوموں کی خدمت کر کے تلافی مافات کرے۔

ہرات

خواجہ عبداللہ انصاری کی درگاہ میں فروکش ہوئے۔ انہیں بزرگ کا لقب پیر ہری ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تخت غوری کی دونوں آنکھیں کشور کشائی کی طرف متوجہ تھیں۔ سلطان غیاث الدین خوارزمیوں سے برسرپیکار تھا اور سلطان معزالدین سام عرف شہاب الدین ہندوستان میں مشغول تھا۔

بلخ

ہرات سے غزنین کو سیدھا راستہ تھا۔ مگر بلخ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ممکن ہے کہ راہ میں چشت بھی گئے ہوں۔ بلخ کو پہلے باختر کہتے تھے۔ ابتدا میں مسلمان اس کو فوجی مرکز سمجھتے تھے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی عزت و شہرت آتشکدۂ نوبہار کی وجہ سے تھی۔ یہ تمام آتش کدوں کا قبلہ گاہ تھا۔ قتیبہ بن مسلم نے اس کی آگ بجھا کر اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ بلخ سلطان الطائفہ حضرت ابراہیم بن ادھم قدس سرہ العزیز کا مولد و مسکن تھا۔ یہیں انہوں نے ظاہری تخت و تاج کو چھوڑ کر (1) باطنی بادشاہت حاصل کی تھی۔ یہاں حضرت والا نے احمد خزرویہ کی خانقاہ میں قیام فرمایا۔ اس نواح میں ایک عالم و حکیم و فلسفی ضیاء الدین کا مدرسہ مشہور تھا۔ وہ فلسفہ و منطق کے ماہر تھے۔ انہیں یہ کمال تھا کہ دو اور دو کو پانچ ثابت کر سکتے تھے۔ ماورائے عقل کو نہ ماننے کی وجہ سے تصوف سے انہیں ازلی دشمنی تھی۔ جب یہ سنا کہ ایک بزرگ عالی مرتبت کا قافلہ قیام پذیر ہے تو آستینیں چڑھا کر مقابلہ پر آ گئے۔ سلام و دعا کے مراسم ادا کرنے کے بعد انہوں نے اپنے فلسفہ کی پٹاری کھول کر سامنے رکھ دی۔ اس میں ظن و تخمین کے عجیب و غریب شعبدے تھے۔ اور ان کی فصاحت و بلاغت جادو سے کم نہ تھی۔ قافلہ والے ان کی باتیں سن کر ان کا منہ تکنے لگے۔ حضرت والا نے کسی بات پر تبسم زیر لب سے کام لیا اور کسی دلیل پر ایک آدھ استفہامیہ لفظ فرما دیا۔ حکیم صاحب خفیف سی مسکراہٹ کو جب دیکھتے تھے تو ان کا چہرہ فق ہو جاتا تھا۔ اور زور تقریر میں کچھ سستی آ جاتی تھی۔ جب استفہامیہ الفاظ ان کے کان میں پہنچتے تھے۔ انہیں نہ صرف حیرت ہوتی تھی بلکہ اپنے کلام پر ایک قسم کا شک سا پیدا ہو جاتا تھا۔ اور ان کی منطق کچھ شرما سی جاتی تھی۔ کھانے کے وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کلنگ شکار کر کے پکایا گیا تھا۔ حکیم صاحب کی بھی تواضع کی گئی۔ اور

1۔ اس زمانے میں سامانی خاندان بلخ کا حکمران تھا۔ بادشاہوں اور وراثان تخت میں حضرت کا اسم گرامی نہیں پایا جاتا۔ اور غالباً حضرت کا تعلق سامانیوں سے ہے۔ ایسی صورت میں تخت چھوڑنے کی روایت سمجھ میں نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ کسی ماتحت و باج گزار ریاست کے مالک ہوں گے۔

خندہ پیشانی کے ساتھ "پائے چوبین سخت بے تمکین بود" کہہ کر ایک ران ان کے سامنے رکھ دی گئی۔ وقت طعام سکوت رہا۔ اس خاموشی کے عالم میں حکیم صاحب نے خود بخود اپنی الجھن دور کرنے کی سوچی۔ کچھ ایسا ہوا کہ انکا قلب ان سے گفتگو کرنے لگا۔ حضرت والا کے استفہام و تبسم نے ان کے قلب کو گویائی عطا کر دی تھی۔ قلبی بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ گرہ پر گرہ کھلتی چلی گئی۔ منطق و فلسفہ کا قلعہ ڈھ کر رہ گیا۔ تاریکی کٹ کٹ کر دور ہو گئی اور روشنی کے نفوذ نے حواس گم کر دیے۔ جب تحیر نا قابل برداشت ہو گیا تو بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا۔ ہوش میں آ کر ہاتھ دھوئے۔ اپنے تخیلات لایعنی سے توبہ کی اور منفعل ہو کر معافی طلب کی۔ علم کی گمراہیاں اس طرح صحیح راستہ پر پڑ گئیں۔ حضرت والا نے نہایت متانت و لطف کے ساتھ نہ صرف خرقہ درویشی عطا فرمایا۔ بلکہ اس علاقہ کی ہدایت پر بھی ان کو مامور کر دیا۔

غزنین

یہاں شیخ عبد الواحد رحمۃ اللہ علیہ بڑے پائے کے درویش تھے۔ یہ نظام الدین ابو المؤید کے پیر تھے۔ ان کے ہی یہاں قیام فرمایا۔ اور ان کی صحبت سے حظ وافر اٹھایا۔ غیاث الدین نے غزنین ۵۶۹ھ میں فتح کیا تھا اور ترکوں کو جو سلطان سنجر کو قتل کرنے کے بعد یہاں متصرف ہو گئے تھے، نکالا۔ اپنے بھائی معز الدین سام کو حاکم مقرر کیا تھا اور شہاب الدین کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔ شہاب الدین محمد غوری کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ کوئی صاحب یہاں ٹھہرے تھے یا ان کا قافلہ یہاں سے گزرا تھا۔

ملتان

ہندوستان کا پہلا شہر تھا۔ جہاں پہلی مرتبہ غزنین سے حضرت والا نے قدم رنجہ فرمایا۔ یہاں عربوں نے سب سے پہلے حکومت قائم کی تھی۔ اس کے بعد قرامطی برسر اقتدار آئے۔ ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۵ء میں شہاب الدین محمد غوری نے فتح کیا۔ حضرت والا کا یہاں قیام معمول سے کچھ زیادہ رہا۔ نہ صرف اس لئے کہ یہاں کے مزارات کی زیارت اور اہل اللہ سے ملاقات منظور تھی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اسلامی حکومت اور ہندوستانی حکومت کا مقابلہ و

موازنہ کرسکیں۔اور ہندوستان کی ذات پات کی تقسیم اور ان کے رسوم و ادب کی تفاصیل سے واقف ہوسکیں۔افہام وتفہیم کے لئے زبان کا بھی استقراء کرنا تھا۔تاریخ فرشتہ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ دس محرم ۵۶۱ھ میں خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔اس وقت سید حسن خنک سوار اجمیر کے داروغہ تھے۔وہ آپ کی تشریف آوری پر بہت خوش ہوئے۔یہ بیان تاریخی حیثیت سے قطعی لغو ہے۔اس لئے کہ سید حسن خنک سوار کا بہ حیثیت داروغہ اجمیر ۵۹۱ھ تقرر ہوا تھا۔فرشتہ کتنا ہی مستند مؤرخ ہو مگر اس سے یہ غلطی بہر حال سرزد ہوئی۔مولانا شرر لکھنوی مرحوم اس بیان پر چکرا کر رہ گئے۔اور خواجہ اجمیر کی سوانح عمری لکھتے لکھتے قلم روک لیا۔صاحب معین العارفین نے فرشتہ کے سامنے سر جھکا دیا اور ایک قدم آگے بڑھ کر عذر گناہ کے طور پر یہ تاویل کی کہ پہلی مرتبہ خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ ۵۶۱ھ میں ملتان آکر براہ لاہور واپس چلے گئے تھے۔اور بعد میں دوبارہ اجمیر تشریف لانا ہوا تھا۔معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ کے کاتب اول نے ۵۹۱ھ کے بجائے ۵۶۱ھ لکھ کر کج بنیاد رکھ دی ہوگی۔اور اب یہ غلطی ثریا تک جاری رہے گی۔اور معین العارفین کی تاویل قطعی بے تکی ہے۔جب حضرت والا ملتان تشریف لائے، حضرت بہاء الدین زکریا خورد سال تھے یا ابتدائی درسی علوم کا اکتساب کر رہے تھے۔ان کے والد محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ۵۷۷ھ میں ہوا تھا اور بقول فرشتہ حضرت زکریا کی پیدائش کا سال ۵۷۸ھ ہے۔

لاہور

غزنوی حکومت کا ہندوستان میں لاہور دار سلطنت تھا۔خسرو ملک غزنوی سے شہاب الدین نے ۵۸۰ھ/۱۱۸۶ء میں فتح کیا تھا۔جب حضرت والا ملتان سے یہاں وارد ہوئے تو شہاب الدین جانب جنوب ہندوستان کی سرحد پر مصروف پیکار تھے۔حضرت والا نے حضرت ہجویری (متوفی ۴۶۵ھ) کے مزار اقدس پر چلہ کیا۔اب حجرہ اعتکاف خوشنما بنوا دیا گیا ہے۔جو مزار کے پائیں ہے۔یہاں ہر خاص و عام سے صحبتیں رہیں۔یہاں کے متعلق معلومات میں اضافہ کیا۔یہاں حضرت سعد الدین حمویہ کے پیر حضرت سید حسن زنجانی

(متوفی ۶۰۶ھ) سے مراسم دوستی ہوگئے۔ اس نام کے ایک بزرگ اور ہیں جو حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی تھے۔ جن کے وصال کے دن حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ لاہور تشریف لائے تھے۔

حضرت والا کے قافلہ میں ابتدائی سفر سے چالیس اصحاب کی شمولیت بعض تذکرہ نویسوں کو تسلیم نہیں۔ لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ لاہور میں یہ قافلہ چالیس بزرگوں پر مشتمل تھا۔ لیکن قرین عقل یہی ہے کہ رفقاء سفر از اول چالیس تھے۔ لاہور کی آخری مجلس میں روانہ ہونے سے پیشتر کسی ملتانی بزرگ کا توبہ کے متعلق بیان دہراتے ہوئے، جب مختلف فوائد بیان فرما چکے تھے، آبدیدہ ہو کر فرمایا: ''اب وہاں کا سفر کرنا ہے جہاں میرا مدفن بنے گا''۔ یعنی اجمیر کا (دلیل العارفین مجلس یازدہم)۔

اب اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ آبدیدہ کیوں ہوئے تو۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ شاید وجہ یہ ہو کہ اسلامی سلطنت سے جدا ہونے کا افسوس تھا۔ شاید یہ فکر ہو کہ اہالیان ہند سے کیسی بنے گی؟ شاید خیال ہو کہ مدفن کے تصور سے رقت پیدا ہوگئی۔ شاید یہ ہو کہ اب تک آزاد تھے اور اب صاحب ولایت ہونے کی وجہ سے اپنے حدود میں رہنا پڑے گا(1)۔ لیکن عظیم المرتبت شخصیتیں اس قسم کے توہمات سے بالا ہوا کرتی ہیں۔ اب آبدیدہ ہونے کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ ہندوستان کی نازک حالت کا تصور کر کے جی بھر آیا۔ ہندوستان کی بہتری واصلاح کے متعلق جب فکر کی تو یہ تخیل بندھا کہ سنت موسوی کے اصول پر عصا کو اژدہا بنا کر کام نکالیں یا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع میں قوت یقین اور شان رحمت کو ذریعہ بنائیں۔ طریقہ اول ہندوستان کی طبیعت کے موافق تھا۔ اور طرز ثانی مبلغ کے ذوق کے مطابق تھا۔ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے کے لئے ذکر و عبادت کرنا سنت ابراہیمی ہے۔ جس سے علم واعتقاد پختہ ہوتا ہے۔ اس سنت میں حوادث قبر و مابعد کے خوف وبشارت کا اضافہ طریقہ محمدی ہے۔ اس

1۔ کوئی رسم ومثال ایسی نہیں کہ صاحب ولایت روان ولایت اپنی ولایت سے باہر گیا ہو۔ اس کے خلاف ہر مفروضہ نامعتبر ہے۔

طریقہ میں صرف نیکی و گناہ کا ہی علم کافی نہیں ہے۔ بلکہ ان کا ہر وقت ملاحظہ کرنا بھی ضروری ہے تاکہ انسان کے تمام اعضاء ان کے اثرات کی تعمیل کر سکیں۔ بہر حال اس قسم کی کش مکش نے غالباً آبدیدہ کر دیا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ مومن جب نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور آدھی جدو جہد کر لیتا ہے تو شفقت خداوندی بقیہ نصف کی ذمہ دار ہو جاتی ہے۔ مگر مرد مخلص کا معاملہ مرد مومن سے کچھ جدا ہے۔ مخلص امید و بیم کی دو جستوں کی محنت میں مبتلا نہیں کیا جاتا بلکہ یقین کی ایک ہی جست میں پار ہو جایا کرتا ہے۔ جب مخلص نیت کرتا ہے تو توفیق خداوندی فوراً ہی قبولیت و نصرت کا مژدہ سنا دیتی ہے۔ اب آبدیدہ ہونے کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ حضرت ہندالولی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا اصول طے کیا۔ اور قبولیت نے ہاتھوں ہاتھ سند مرحمت فرما دی۔ تعلیم تصوف و روحانیت کے لئے زبان کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ محض نگاہ کافی ہوا کرتی ہے۔ آنکھوں کا پرنم ہو جانا' معبود حقیقی کے الطاف و اکرام کی مسرت میں قطرہائے آب آنکھوں میں آ گئے اور حضرت والا بسم اللہ کہہ کر چل کھڑے ہوئے۔

شہاب الدین محمد غوری اس وقت سرہند (بھٹنڈا) فتح کر چکا تھا۔ حضرت والا لاہور سے دو ماہ کے عرصہ میں براہ سامانہ دہلی میں کچھ قیام کرتے ہوئے اپنے مستقر مشہور دارالخیر اجمیر میں جلوہ فرما ہو گئے۔ کوہ ریگستان کی فضا وجد و رقص کرتی ہوئی رسیلی موسیقی کے ساتھ گونج اٹھی۔

نگار آمد قرار آمد　　　بہار آمد بہار آمد

باب ۷

رفقائے سفر چہل تن

زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست

حضرت والا کے ساتھ اجمیر شریف چالیس حضرات آئے تھے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آخری مرتبہ حاضری بیت اللہ و روضۂ نبوی کے موقع پر بھی چالیس ہمراہی تھے۔ تذکرہ نویسوں کو وثوق کے ساتھ نہیں معلوم کہ ہندوستان کے سفر میں وہی چالیس رفیق تھے یا ان سے مختلف اصحاب تھے۔ لہٰذا یہ بات بھی بحث طلب ہے کہ ابتدائی سفر سے چالیس حضرات ساتھ تھے یا لاہور پہنچتے پہنچتے یہ عدد پورا ہوا تھا۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ لیکن ان چالیس رفقائے سفر کی فہرست اور ان کے متعلق کسی قسم کی واقفیت و معلومات کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ اسمائے گرامی ہی ان سب کے معلوم ہو جاتے تو ان سے مزید حالات کا بہت کچھ پتہ چل جاتا اور داستان سفر، قیام اجمیر اور تبلیغ و اشاعت پر کافی روشنی پڑتی۔

اس فہرست کو مکمل کرنے کی کوئی صورت نہیں، سوائے اس کے کہ شبہات کی بناء پر قیاسات سے کام لیا جائے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہاں وجہ شبہ بھی نمایاں نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت والا کے حاشیہ نشینوں میں ایسے بزرگ بھی شامل ہیں جو ان کے ہم خرقہ تھے۔ اور ایسے بھی ہیں جن کو انہوں نے خود خرقہ مرحمت فرمایا تھا۔ اگر جائزہ لیا جائے تو ان ہی حضرات میں سے رفقائے سفر کی فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ یہ فہرست تیار کرنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ لیکن قیاس ہے کہ امتثال امر کے لئے فہرست بنانے کی کوشش مین کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے کہ اہل نظر اس میں ترمیم و تنسیخ کر کے صحت کر سکیں۔

حضرات ذیل کے رفیق سفر ہونے میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ بر سبیل تذکرہ کہیں کہیں پر ان صاحبان کی رفاقت کا ذکر پایا جاتا ہے۔

۱۔خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی رحمۃ اللہ علیہ

۲۔شیخ محمد الدین سنجری رحمۃ اللہ علیہ	رفیق سفر وحضر
۳۔مولانا احمد خادم رحمۃ اللہ علیہ	ہر سفر میں شریک رہے ہیں۔
۴۔خواجہ علی سنجری رحمۃ اللہ علیہ	ہمشیر زادہ اور کاتب تھے۔
	مزار دہلی میں ہے۔
۵۔علیم الدین عالم نواز رحمۃ اللہ علیہ	سہارنپور میں آرام فرما رہے ہیں۔
۶۔شرف ابدال رحمۃ اللہ علیہ	دھولپور میں آسودہ ہیں۔
۷۔شاہ علاء الدین رحمۃ اللہ علیہ	مراد آباد میں مدفون ہیں۔
۸۔برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ تالے والے بابا	نواح جے پور میں مزار ہے۔
۹۔میران ناطمع شاہ رحمۃ اللہ علیہ	مزار اجمیر میں ہے۔
۱۰۔شیخ محمد ترک نارنولوی رحمۃ اللہ علیہ	ہم خرقہ تھے۔
۱۱۔خواجہ فخر الدین گردیزی رحمۃ اللہ علیہ	ہم خرقہ و منتظم لنگر۔
۱۲۔حاجی رومی رحمۃ اللہ علیہ	ہم خرقہ بروایت تذکرہ اولیاء بیجاپور۔
۱۳۔سید معین الدین رحمۃ اللہ علیہ	ہم خرقہ مزار بیانہ (بھرتپور) میں ہے۔
۱۴۔خواجہ محمد یادگار رحمۃ اللہ علیہ	مزار غزنین میں ہے۔
۱۵۔شیخ عبداللہ رازی رحمۃ اللہ علیہ	آتش پرست جو حضرت والا کی توجہ سے مسلمان ہوئے۔
۱۶۔شیخ صفی الدین ابراہیم رازی رحمۃ اللہ علیہ	جن کو گود میں لے کر خواجہ عثمان ہرونی آگ میں سے گزرے تھے۔

۱۷۔مولانا علی کرمانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۸۔سید نور الدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۔شیخ برہان الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ

۲۰۔شیخ واحد برہان غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

۲۱۔شیخ محمد صفاہانی رحمۃ اللہ علیہ

۲۲۔شیخ کمال احمد بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

اب چالیس کے عدد میں جو کمی رہ جاتی ہے۔اس کو پورا کرنا کارے دارد ہے۔لیکن ان کا انتخاب خلفاء میں سے ہوسکتا ہے۔صحت کے مطابق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔مگر ایسے حضرات کے اسمائے گرامی پر بنائے قیاس فہرست خلفاء میں نشان لگا دیے گئے ہیں۔وہ وہاں ملاحظہ فرمالئے جائیں۔حضرات ذیل اگرچہ حضرت والا کے پیر بھائی ہیں۔مگر رفیق سفر نہیں ہیں۔ ہندوستان میں بعد کو پہنچے۔

۱۔سید عرب صاحب بدایونی رحمۃ اللہ علیہ

مزار بدایوں میں ہے۔حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے نانا ہیں۔

۲۔قاضی قدوہ رحمۃ اللہ علیہ

اودھ کا خاندان قدوائی ان ہی کی اولاد سے ہے۔مزار فیض آباد میں ہے۔رفیع احمد قدوائی مرحوم کی قبر کے لئے اسی رعایت کی وجہ سے حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کی چادر بھیجی گئی تھی۔اور رفیع صاحب اپنی خصوصیات کی وجہ سے اور بڑے باپ کے بیٹے ہونے کے سبب شاید اس کے مستحق بھی تھے۔

۳۔شیخ نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ

عہد التمش میں دہلی کے شیخ الاسلام تھے۔

باب ۸

ہندوستان جنت نشان

چشتی نے جس زمین میں پیغام حق سنایا

ہندوستان کے قدرتی حصے چار ہیں۔ دامن ہمالیہ، وادی گنگا، دکن اور جنوبی ساحلی میدان۔ ان چاروں حصوں میں بھانت بھانت کی قومیں آباد تھیں۔ اور متعدد حکومتیں تھیں۔ افغانستان سے ہمالیہ اور دندھیا چل کے درمیانی حصہ میں حسب ذیل قومیں حکمران تھیں۔ سندھ کے رائے، گندھارا کے برہمن، مالوہ کے پرمار، گجرات کے سولنگی، اجین کے گرجار پر۔ بہار، اجمیر کے چوہان، قنوج کے کورو، مہوبہ کے چنڈیل، چھیدی کے کلچور اور بنگال کے پال اور سین۔

کہتے ہیں کہ اشوک کے زمانے میں یہاں سے وہاں تک ایک ہی سلطنت تھی۔ اور ہر جگہ امن وامان تھا۔ مگر ان راجاؤں کے زمانے میں ایک پھل پیدا ہوا جس کو پھوٹ کہتے ہیں۔ لہٰذا سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ مہاتما بدھ، کمریلا بھٹہ اور دوسرے بزرگوں نے ہر چند اصلاح اور اتحاد کی کوشش کی۔ لیکن ہر تعلیم سے مستفیض ہونے کے بعد بھی شنکراچاریہ کی تقلید میں ہندوستان نے پھوٹ کو نہیں چھوڑا۔ اور پھوٹ مایہ ناز خصوصیت بن کر رہ گئی۔

معتقدات و مذہب کا تعلق قلب سے ہوا کرتا ہے۔ اور دماغ قلب کی پیروی کیا کرتا ہے۔ مگر قانون فطرت کے خلاف لوگ الٹی گنگا بہانے پر فخر کیا کرتے ہیں۔ اور اس طرح قلب دماغ کا مطیع بن جاتا ہے۔ قلب کی جب تشریح و وضاحت کی جاتی ہے تو دماغ کی بن آتی ہے۔ اور علمیت کی فراوانی جوش ایمانی کو محجوب کر دیتی ہے۔ تاریخ اسلام بتا رہی ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایران کے مال غنیمت کو تقسیم کرتے وقت گریہ فرما رہے تھے کہ دولت ایمان کی کمزوری کا باعث ہوگی۔ تو اس وقت قوم و ملت حصول دولت پر آپے

سے باہر ہوئی جارہی تھی۔ دولت کی ہوس نے علمیت کو ذریعہ بنا کر مذہب کو سیاست میں تبدیل کردیا۔ اس کے بعد تعلیم اسلام اور حکومت میں بُعد واقع ہوگیا۔ مگر یہاں ہندوستان میں شروع سے ہی دماغ کی حکمرانی رہی ہے۔ وید کی تشریح برہمنوں نے کچھ اس انداز سے کی ہے کہ فطرت ہی بدل گئی۔ اصول بدلے، حکومتیں بدلیں لیکن نہ بدلے تو برہمن۔ کوئی انقلاب اسے زیر نہ کرسکا۔ ہر رنگ میں اس نے اپنا ہی کلمہ پڑھوایا۔ برہمن نے اپنے نقطہ نظر اور اپنی طاقت سے یونانی فلسفہ کو دنگ کردیا۔ بدھ مذہب کو دیس سے نکال دیا۔ اور اپنی توہمات کے ذریعہ سے نہ صرف مخالفین کو زک دی بلکہ اپنے کو بھی زیر کیا۔ ذات پات کا قصہ ایجاد کرکے برہمن نے برتری کا اقبال کروالیا۔ چھتریوں کی بہادری اس کے سامنے سرنگوں رہی۔ ویش کی معاملہ فہمی نے اس کے آگے ہاتھ باندھے۔ اور شودر تو پھر شودر تھے ہی۔ اب آخر میں مہاتما گاندھی نے مساوات کا سبق پڑھایا۔ مگر برہمن نے اپنی برتری تسلیم کرالی۔ ذات پات ہر چند تقسیم کار کے اصول پر مبنی ہو۔ لیکن برہمن کے وقار کو قائم رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ہمالیہ کی سربفلک چوٹیاں برہمن کے دماغ سے منسوب ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ سرتاج نہ سمجھا جائے۔

ظہور اسلام سے بہت پہلے عرب کے تاجر براہ سمندر چین اور جاپان تک سے تجارت کیا کرتے تھے۔ ان عربوں کے معتقدات برہمنوں سے ملتے جلتے تھے۔ لہٰذا ہندوستان میں وہ ہاتھوں ہاتھ لے لئے گئے۔ بعد میں جب عربوں میں تغیر واقع ہوا اور اپنی توہمات سے تائب ہوکر دائرہ اسلام میں آگئے تو یہاں بجائے کسی قسم کا اختلاف ہونے کے تعلقات میں اور بھی خوشگواری و شگفتگی پیدا ہوئی۔ کیونکہ اب عربوں کی تجارتی خودغرضیاں دور ہوگئیں۔ اور ان کا ہر قول و فعل انسانیت اور سماج کی بہتری و بہبودی کے لئے ہونے لگا۔ ابھی تک اپنی تجارت سے ضروریات فراہم کرنے کی وجہ سے مقبول تھے۔ اور اب اپنے اخلاق و سلوک اور ایثار کے سبب اور بھی محبوب بن گئے۔

زین الدین مؤرخ نے لکھا ہے کہ سیون میں کرنگا نور کا راجہ پیرول معجزہ شق القمر کے

مشاہدے کے بعد مسلمان ہو گیا تھا۔ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ پہنچ کر وہ نبی کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اور اسی سفر میں وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کے ساتھیوں نے شرف بن مالک کو اپنے ساتھ واپس لا کر کرنگا میں مسجد تعمیر کروائی۔ اور مالک بن دینار سے اشاعت اسلام کروائی۔ اس کے بعد مالک بن حبیب نے مالا بار میں تبلیغ کی اور کوکن میں مسجد بنوائی۔ مسلمانوں کا پہلا لشکر ۱۴ھ۔۶۳۶ء میں بہ عہد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مغربی ساحل پر بمبئی کے قریب بندرگاہ تھانہ میں لنگر انداز ہوا تھا۔ دوسرا لشکر ۲۲ھ/ ۶۴۴ء میں بہ عہد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکران سے سندھ کے ساحل پر اترا تھا۔ دونوں لشکر جہاد کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ پھر ۴۳ھ میں مہلب مرد کی راہ سے کابل پہنچے تھے۔ اس کو فتح کرنے کے بعد خود خراسان چلے گئے۔ اور اپنی جگہ ابو عبیدہ کو چھوڑ گئے۔ کابلیوں نے فریب دے کر ابو عبیدہ کو گرفتار کر لیا پھر طلحہ بن عبیدہ نے کابلیوں کو شکست دی۔ جس کے صلہ میں ان کو سیستان کی حکومت ملی۔ طلحہ کی معزولی کے بعد کابل کا حاکم خالد بن عبید کو بنایا گیا۔ خالد بن عبید نے اپنی لڑکی کی شادی کسی افغانی سردار سے کر دی تھی۔ اس کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ لودی اور سوری یہی دونوں اس نام کے دونوں خاندان کے مورث کہلائے۔ افغانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا کابل آنا ثابت نہیں۔ درحقیقت یہ دونوں کابلی خاندان خالد بن عبید سے منسلک و وابستہ تھے۔

پہلی صدی ہجری کے آخر میں عرب کے مسلمان تاجروں نے مغربی ساحل ہند اور لنکا میں سکونت اختیار کر کے بستیاں بسائی تھیں۔ وہاں کے باشندے اس قدر مانوس ہوئے کہ برضا و رغبت اپنی لڑکیوں کی شادی مسلمان تاجروں سے کرنے لگے۔ عربی اور ہندوستانی آمیزش سے جو اولاد ہوئی اس کو از راہ محبت موپلا سے موسوم کیا گیا۔ موپلا کے معنی ہیں دولہا یا فرزند کلاں۔ بادشاہ زمورن نے اعلان کر دیا تھا کہ ماہی گیروں کے ہر خاندان کا ایک فرد مسلمان ہو جائے اور مسلمانوں سے جہاز رانی سیکھے۔ گجرات میں راجہ راسٹر کوٹ اور راجہ

بلہارا مسلمانوں سے انس و محبت رکھتے تھے۔ راجہ انہلواڑہ سے بھی اچھے تعلقات تھے۔
جب کاہے والوں نے مسلمانوں کو ستایا تو راجہ سدہ راج ۵۲۷-۴۹۰ھ/ ۱۱۳۳ء-
۱۰۹۴ء نے ان لوگوں کو سخت سزا دی۔ اور مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لئے مسجد بنوادی۔
جی چاہتا ہے کہ ان اولین مسلمان تاجران عرب کو ''صوفی'' کہہ دیا جائے۔ لیکن اس زمانے
میں از قسم صوفیت و مولویت کوئی تفریق و تخصیص نہیں تھی۔ بلکہ وہ صرف خالص مسلمان تھے۔
جن کے اخلاق اور طریقے کی وسعت غیروں کو بھی اپنا بنا لیتی ہے۔ عرصہ دراز کے بعد اس
محبوبیت و مقبولیت کے اثرات دیکھ کر برہمن کی آنکھ کھلی اور اس نے اپنے قلب کے
بخارات کا نام رکھا ''حب وطن'' پھر کیا تھا فلسفہ اور پھوٹ کا پرانا ہتھیار نکال لیا گیا۔ اس
زمانے میں ادھر خلافت امارت کا جھنڈا لہرا رہی تھی اور سیاست کا دور دورہ تھا۔ لہٰذا دونوں
طرف سے آتش بازی چھوٹنا شروع ہوگئی۔ قصہ یوں ہوا کہ مالابار سے ایک تجارتی قافلہ
گورنر بصرہ حجاج اور خلیفہ ولید کے لئے کچھ نذرانے اور سوغات لئے جا رہا تھا۔ بحری
قزاقوں نے جہاز کو گرفتار کر لیا اور قافلہ کو سندھ کے راجہ نے دیبل کی بندرگاہ میں مقید
کر دیا۔ ولید اور حجاج نے دو مرتبہ راجہ کو قافلہ کی رہائی کے لئے لکھا۔ مگر یہاں خبرے نہ
باشد۔ سندھ کا راجہ برہمن تھا۔ اس کا باپ مسمی چچ دراصل پہلے وزیر تھا۔ اس وزیر نے راجہ
سلہاسی کو معزول کر کے تخت اور رانی دونوں پر قبضہ کر لیا۔ اپنے چچا چندرا کے انتقال کے بعد
چچ کا لڑکا داہر مالک سلطنت بنا۔ داہر کے سکوت کی حجاج جیسا بے پناہ گورنر کب تاب لا سکتا
تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم کو کثیر فوج دے کر بھیج دیا اور ۷۱۲ء میں سندھ فتح
کر لیا گیا۔ بہر حال اس طرح سندھ اور ملتان میں عربوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

عباسی خلافت کے انحطاط کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دربار میں ترکوں کو غلبہ حاصل ہو گیا
تھا۔ ۳۷۰ھ/ ۹۸۶ء میں سبکتگین نے ہندوستان پر شمال و مغرب سے حملہ کر کے دریائے
انڈس تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ پھر اس کے بعد اس کے لڑکے محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ
جہاد کیے۔ جب ملتان کے داؤد قرامطی نے انند پال کو ملا کر اجین، کالنجر، قنوج، دہلی اور

اجمیر کی حکومتوں سے مدد حاصل کرنے کے بعد محمود غزنوی نے متحدہ مدافعت کی۔ اور ان سب کو شکست ہوگئی تو ہندو ریاستوں کا شیرازہ بکھر گیا اور محمود غزنوی کے لئے فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے بعد اسی طرح غزنوی فتوحات نے شہاب الدین محمد غوری کے لئے کامیابی کا میدان تیار کر دیا۔

عربوں نے سندھ فتح کیا۔ ترکوں نے ہندوستان پر اپنی بہادری کا سکہ جمایا اور واپس چلے گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تبلیغ اسلام کا کونہ ابتدائی تاجران عرب کی تسخیر میں پایا جاتا ہے یا بعد میں آنے والے عرب و ترک بہادروں کی فتوحات میں سے ملتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان عربوں اور ترکوں کی فتوحات میں فاروقی فتوحات کی شان نہیں پائی جاتی۔ خالص تعلیم اسلام کے معیار پر ان فاتحین ما بعد کو اس قسم کی وقعت نہیں دی جاسکتی جس کے پہلے حامل ہیں۔

محمود غزنوی کے بعد ہندوستانی حکومتیں دو پارٹیوں میں منقسم ہوگئی تھیں۔ گجرات کا راجہ پرمل اور قنوج کا راجہ جے چند ایک پارٹی میں شامل تھے۔ دہلی و اجمیر کے چوہان اور چتوڑ کے راجہ کی دوسری پارٹی تھی۔ علاؤالدین جہانوز کا بھتیجا شہاب الدین محمد غوری تھا۔ اس نے لاہور کے آخری بادشاہ خسرو ملک اور والی جمو راجہ چکرادیو کو زیر کر کے ۵۸۳ھ/۱۱۸۶ء میں جمو سے پنجاب اور خسرو ملک غزنوی کو گرفتار کر کے لاہور لے لیا تھا۔ پھر مختلف قلعے فتح کرنے کے بعد ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء کے موسم سرما میں دہلی و اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کے مضبوط قلعہ بھٹنڈا کو تسخیر کر لیا۔ پرتھوی راج بڑی قوت کے ساتھ مقابلہ پر آیا اور ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں تراوڑی (ترائن) متصل تھانیسر پر سخت خون ریز جنگ ہوئی۔ شہاب الدین زخمی ہو کر اور اپنی فوج میں اختلاف دیکھ کر بھاگ گیا۔ پرتھوی راج نے چالیس میل تعاقب کرنے کے بعد قلعہ بھٹنڈا کا محاصرہ کر لیا۔ پرتھوی راج کے محاصرہ کرنے سے پہلے قلعہ بھٹنڈا دو اڑھائی مہینہ مسلمانوں کے قبضہ میں رہا تھا۔ اب محاصرہ کے تیرہ مہینے بعد مسلمانوں سے اس قلعہ کو پرتھوی راج نے واپس لے لیا۔ شہاب الدین غوری جب

دوبارہ حملہ آور ہوا تو اس کے آنے سے پندرہ بیس روز پہلے قلعہ پرتھوی راج کے قبضہ میں پہنچ چکا تھا۔ گویا چودہ مہینہ کے بعد ۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء میں اسی مقام تراوڑی (ترائن) پر دوسری جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں چھوٹے بڑے ڈیڑھ سو راجہ شریک تھے۔ راجہ قنوج ذاتی دشمنی کی وجہ سے اپنے داماد پرتھوی راج کے خلاف رہا۔ گوبند رام راجہ دہلی اسی جنگ میں مارا گیا اور سرتی کے قریب پرتھوی زندہ گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔ اس طرح ہندو حکومتوں کا قلع قمع ہو گیا۔ شہاب الدین اور اس کے نائب قطب الدین ایبک نے اپنے پیشروؤں کے ملک سے ہٹ کر ہندوستان میں غوری حکومت کی بنیاد رکھ دی۔

باب ۹

اجمیر میں تشریف آوری کا تعین

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

(۵۸۷ھ/ ۱۱۹۲ء۔۱۱۹۱ء)۔بعمر ۵۴ سال

خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے اجمیر میں وارد ہونے کے متعلق کوئی صحیح تعین نہیں کیا گیا ہے۔تشریف آوری کی تاریخ فرشتہ نے دس محرم ۵۶۱ھ لکھی ہے۔اور سیر العارفین نے ۶۰۲ھ بتائی ہے۔ یہ دونوں از سرتا پا غلط ہیں۔اکبر نامہ، تزک جہانگیری، سیر الاولیاء اور دیگر تذکروں نے محمد غوری کی آمد سے پہلے بعہد پرتھوی راج (۵۸۷ھ/ ۹۲۔۱۱۹۱ء) تشریف لانا تحریر کیا ہے۔ مفتاح التاریخ اور بعض تذکروں کے مطابق حضرت والا محمد غوری کی آمد سے پہلے دہلی آئے اور محمد غوری کی فتح دہلی کے بعد اجمیر پہنچے۔ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، آئین اکبری، عہد جہانگیری کے مؤرخ و مصور چار جماں چتر ماں اور جادو ناتھ سرکار کی انڈیا آف اورنگ زیب سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد غوری کے ہمراہ آئے۔جب کہ دہلی فتح ہوا اور پھر اجمیر پہنچے۔

اگر ذرا بھی غور و تدبر سے کام لیا جاتا تو تاریخی واقعات کی روشنی میں حضرت والا کی تشریف آوری کے تعین میں بڑی مدد ملتی، نتیجہ صحیح نکلتا اور فضول قیاسات سے کام لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔محمد غوری نے بھٹنڈہ میں موسم سرما میں ۱۱۹۰ھ کے آخر میں فتح کیا تھا(1)۔اور اس کو ملک ضیاء الدین تولکی اور قاضی تولک محمد عبدالسلام تولکی کی نگرانی میں چھوڑا تھا(2)۔پرتھوی راج نے دو اڑھائی ماہ بعد تراوڑی کی جنگ اول میں شہاب الدین محمد غوری کو شکست دے کر قلعہ کا محاصرہ کیا اور تیرہ ماہ بعد تسخیر کر کے قبضہ کیا(3)۔قلعہ بھٹنڈہ کے اس

1۔تاریخ شرما، بلال ہندوستان میں ص ۱۷۔ 2۔طبقات ناصری۔ 3۔تاریخ شرما و طبقات ناصری۔

طرح نکل جانے کے پندرہ بیس روز بعد ۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء میں شہاب الدین محمد غوری حملہ آور ہوا۔ تراوڑی میں دوبار جنگ ہوئی۔ اس جنگ ثانی میں پرتھوی راج گرفتار کر کے قتل کیا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ تراوڑی کی جنگ اول اور جنگ دوم میں چودہ مہینہ کا وقفہ وعرصہ ہوا۔ اس دوران میں ہندوستان کے درمیان کاروبار اور راستوں کا بند ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں ہوسکتی۔ اندریں حالات ان راستوں سے کسی مسلمان کا گزرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ ایسی صورت میں چالیس مسلمان درویشوں کا ایک ساتھ سفر کرنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ تراوڑی کی پہلی جنگ سے پہلے قلعہ مذکور غوریوں کے قبضہ میں دو اڑھائی ماہ رہا ہے اور اڑھائی ماہ میں ہندوستان نے انتقام اور حملہ کی تیاریوں کے سلسلہ میں احتیاط اور حفاظت ضرور کی ہوگی۔ مگر بندش مکمل طور پر نہیں ہوئی ہوگی۔ اور سفر زیادہ دشوار گزار نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہی مناسب وقت ہے کہ واقعات وحالات سے فائدہ اٹھا کر درویشوں کا قافلہ براہ سامانہ (پٹیالہ) دہلی اور پھر دہلی سے اجمیر پہنچ گیا۔ جملہ تذکرہ نویس متفق البیان ہیں کہ لاہور سے اجمیر تک کا سفر دو ماہ میں طے کیا گیا۔ گویا اجمیر پہنچنے کا صحیح وقت یہی ہوسکتا ہے۔ یعنی قلعہ بھٹنڈہ فتح ہو جانے کے بعد اور تراوڑی کی جنگ اول سے پہلے۔ چنانچہ اس کی تصدیق خود بخود تزک جہانگیری اور اکبر نامہ کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔

اگر ورود اجمیر کا یہ تعین صحیح ہے تو حضرت والا کے سفر وقیام کے ابتدائی حالات اس تعین کی روشنی میں دیکھنا چاہئیں۔ اس حقیقت ومطابقت کو مدنظر رکھ کر اگر جملہ مشہور ومعروف روایات کو پرکھا جائے تو نتیجہ میں اصلی واقعات روایات سے مختلف ہو جائیں گے۔ مثلاً

۱۔ قلعہ بھٹنڈہ جب پہلی مرتبہ غوریوں نے فتح کیا تو محمود غزنوی کے حملوں کی یاد تازہ ہوگئی اور اس کا نتیجہ وحشت ودہشت ہونا چاہئے تھا۔ سرحد پر وحشت کے آثار نمایاں ہوئے۔ دہلی واجمیر میں بدحواسی پھیلی اور مقابلہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

۲۔ ان دو اڑھائی ماہ کی ابتدائی مدت میں جس وقت یہ روحانی قافلہ سامانہ (پٹیالہ) پہنچا تو سامانہ والوں نے قتل کی سازش کر کے منت وسماجت سے دعوت کے بہانے اپنے یہاں اس

قافلہ کو ٹھہرانے کی کوشش کی۔ ان حضرات نے دعوت قبول نہیں کی۔ نہایت مستعدی سے سفر جاری رکھا۔ اور فریب میں نہیں آئے۔ قتل کی اس سازش کا سبب قومی عادت کے علاوہ سرحد والوں کا ذاتی جوش بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ روایت بھی ہو سکتی ہے جو نجومیوں کی پیشن گوئی کے متعلق ہے۔ اور وہ یہ تھی کہ ایسے درویش آئیں گے اور پرتھوی راج کے راج کو ختم کر دیں گے۔ اسی وجہ سے اعلان عام بھی کر دیا گیا تھا کہ کہیں پر کوئی بھی مسلمان سفر کرتا ہوا پایا جائے قتل کر دیا جائے۔ شہرت تو یہاں تک ہے کہ پیشن گوئی کے مطابق راج ختم کرنے والے درویش کی تصویر بھی شائع کر دی گئی تھی۔

۳۔ جب سامانہ سے حضرت والا دہلی آئے تو ان دونوں وجوہات میں سے ایک وجہ بھی وجود میں نہیں آئی اور مخالفت ظاہر نہیں ہوئی۔ اندیشہ جنگ کی وجہ سے غالباً دہلی والوں کے ہوش بجا نہیں تھے۔ اور اپنی بدحواسی میں دعائے خیر کے لئے دہلی والوں نے درویشوں کی خدمت میں حاضری دی۔ ان صاحبان کے اخلاق وسلوک سے دہلی کی پریشان آبادی کے جی ٹھہر گئے اور اس طرح گرویدہ ہوئے کہ سب کے سب کلمہ پڑھنے لگے۔ اب اگر کچھ گرویدہ ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے ہوں تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ روایتوں میں جماعت کثیر کا مسلمان ہونا بتایا گیا ہے۔ محض اس لئے کہ مبالغہ کرنا تذکرہ نویسوں کا ہنر ہے۔ اس کے علاوہ اس موقع پر قیام دہلی بھی مختصر ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ زیادہ قیام کی فرصت ہی نہیں تھی۔

۴۔ دہلی سے راستہ میں اور اجمیر میں بھی کس قدر بدحواسی ہو گی۔ مگر اس کو جب حضرت والا کے اخلاق کریمانہ سے سابقہ پڑا تو نجومیوں کی پیشین گوئی اور پرتھوی راج کے احکامات دماغوں سے اوجھل ہو گئے۔ اور کسی نے کچھ شبہہ تک نہیں کیا۔ اجمیر کی کثیر آبادی حسن سلوک سے مسخر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے۔

۵۔ حضرت والا کے اجمیر میں داخلہ کی تاریخ اور ساعت تقریباً وہی ہے جو تراوڑی کی جنگ اول کی ہے۔ یہ دونوں واقعات متوازی ہیں۔ اور یہ دونوں امور قلعہ بھٹنڈہ کی فتح کے

اڑھائی ماہ بعد ایک ساتھ وجود میں آئے۔

۶۔ عقل سلیم اور تاریخی شواہد کسی طرح یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حضرت والا کے ورود کے وقت پرتھوی راج اجمیر میں تھا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ راہ میں تھا یا میدان جنگ میں تھا۔

۷۔ جنگ اول میں بمقام ترائن فتح حاصل کر کے پرتھوی راج نے محمد غوری کا تعاقب کیا اور قلعہ بھٹنڈہ کو محصور کیا۔ کچھ عرصہ بعد استحکام کر کے اپنے بجائے اپنے لڑکے گوالا کو قلعہ بھٹنڈہ کی تسخیر کے لئے مقرر کر کے(1) پرتھوی راج اجمیر آیا۔ یہاں آ کر حضرت والا کے حالات سنے اور جو کچھ کرنا تھا کیا۔

۸۔ تراوڑی کی پہلی جنگ میں شکست کھانے کے بعد غزنی پہنچنے پر محمد غوری کے انفعال و افسوس سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی بے وفائی پر از حد ملول و متردد تھا۔ اس کا تذبذب اسے پریشان کر رہا تھا کہ اتنے میں اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ فتح کا مژدہ سنا رہے ہیں۔ اس روحانی بشارت پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی۔ مگر سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ عالم اسباب کا وقوع کیونکر ہوگا۔ یہی فکر تھی کہ ایک معتمد سردار نے ایک لاکھ بیس ہزار مسلح سواروں کے جمع ہو جانے کی خوشخبری سنائی۔ یہ سردار علاقہ تولک کی پہاڑیوں کے سرداروں کا سرغنہ تھا۔ اس سرغنہ کا نام معین الدین تولکی تھا(2)۔

غرض اس طرح ظاہری و باطنی طور پر مطمئن ہو کر سلطان شہاب الدین نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے دوبارہ کوچ کیا۔ اثنائے راہ بمقام پشاور ایک پیر مرد غوری نے سلطان کو دعائے فتح دی اور نصیحت کی کہ امیروں کی بے وفائیوں کو درگزر کیا جائے۔ چنانچہ سلطان نے ملتان پہنچ کر دربار منعقد کیا، معافی کا اعلان کیا اور از سر نو فوج سے حلف وفاداری لیا۔ اس کے بعد لاہور سے آگے بڑھ کر دوسری جنگ تراوڑی میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ پتھورا گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔ دہلی فتح کی گئی اور پھر سلطان نے اجمیر پہنچ کر حضرت

1۔ طبقات ناصری۔ 2۔ تاریخ شرما بحوالہ طبقات ناصری ص ۲۷

والا کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضری کی سعادت حاصل کی۔

حقیقت واقعی تو اتنی ہی ہے۔لیکن تذکرہ نویسوں نے اس سلسلہ میں بے سوچی سمجھی جو غیر واقعی روایتیں بیان کی ہیں۔ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت والا جب اجمیر میں داخل ہوئے تو پرتھوی راج اجمیر میں موجود تھا۔تشریف آوری کے سلسلہ میں انہوں نے تاریخی واقعات اور محمد غوری کی فوج کشیوں اور فتوحات پر مطلق توجہ نہیں کی ہے۔اور نہ ان واقعات سے سلسلہ ملا کر تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق بیانات اس قدر متفرق ہیں کہ ان سے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی اور دماغ شکوک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ان جملہ متفرق بیانات میں تطبیق دینے کا خیال صاحب معین العارفین کو پیدا ہوا۔مگر ان کی بے سروپا مضمون آفرینی کی وجہ سے ان کی تحقیق عجیب قسم کی جدت کا نمونہ بن گئی ہے۔ان کے لئے اختلاف کی تردید مشکل تھی۔اور ان میں فیصلہ کرنا امکان میں نہ تھا۔اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت والا کا ہندوستان اور اجمیر میں متعدد مرتبہ آنا قابل انگشت نمائی نہیں ہو سکتا۔حضرت والا کے پہلی مرتبہ اجمیر آنے پر ۵۸۶ھ میں پرتھوی راج کو ناگواری ہوئی۔اس نے حکم دیا کہ ہماری حدود سلطنت سے نکل جاؤ۔حکم قرانی کے مطابق کہ حاکم کا کہنا مانو اور رسول کی اتباع میں کہ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی تھی۔حضرت والا شہر بدر ہونے پر راضی ہو گئے اور اوش چلے گئے۔اور پھر وہاں سے واپسی میں جب غزنی پہنچے تو معلوم ہوا کہ بر بنائے بشارت خواب اور بہ سبب اعانت ضیاء الدین تولکی سلطان محمد غوری دوبارہ ہندوستان پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے۔سلطان کے لشکر کے ساتھ خود بھی پیشاور تک آگئے۔یہاں ایک پیر مرد غوری نے سلطان کو دعائے فتح دی۔اور امیروں کو معاف کر دینے کی ہدایت کی۔چنانچہ سلطان پیشاور سے ملتان چلا گیا اور خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ سلطان سے جدا ہو کر لاہور چلے آئے جہاں سید زنجانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔اب اگر سمع خراشی کو بے ادبی نہ سمجھا جائے تو بقیہ داستان جس بلیغ و جدید طرز میں صاحب معین العارفین نے لکھی ہے وہ بعینہ پیش کر دی جائے۔لکھا ہے کہ

"جس مہینے اور سال (ذی الحجہ ۵۸۸ھ) میں دارالسلطنت دہلی فتح ہوا (جنگ ترائن میں شہاب الدین فتح یاب ہوا) اسی سنہ میں حضرت خواجہ لاہور سے وارد دہلی ہوئے۔ بعد ازاں پرتھوی راج کے میدان جنگ کی طرف روانہ ہونے سے چند دن قبل آپ دہلی سے (باردوم) وارد اجمیر ہوئے۔ اجمیر پہنچنے پر راجہ نے پھر آپ سے اجمیر چھوڑ کر چلے جانے کے لئے کہلا بھیجا۔ آپ سن کر مسکرائے اور فرمایا: "تین دن کی مہلت ہے۔ اس عرصہ میں یا تو میں نکل جاؤں گا، یا پتھورا"۔ چنانچہ تیسرے دن محمد شاہ (یعنی شہاب الدین غوری) کا لشکر آ گیا۔ (شہاب الدین نے فوج کشی کی) پرتھوی راج کو میدان جنگ (ترائن) کی طرف لڑنے کے لئے اجمیر سے جانا پڑا۔ اور ایسا گیا کہ پھر کبھی نہ آیا۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی آگے کچھ گرما گرم مزیدار اور بھی ہے۔ صاحب معین العارفین کو حضرت والا کے اس دوسری مرتبہ اجمیر آنے کے متعلق ایک خاص الجھن تھی کہ معین الدین تولکی اور پیر مرد غوری کی دو شخصیتوں کو خواجہ معین الدین حسن سنجری کی شخصیت میں کیسے مدغم کردیں۔ تاکہ من تو شدم تو من شدی کا مضمون پیدا ہو جائے اور وحدت الوجود کی اصلیت کھل جائے۔ بحمد اللہ کہ الجھن بآسانی دور ہو گئی۔ یعنی ایک فکر تو دونوں کے ناموں کی مشابہت نے دور کردی اور دوسری مشکل ہر بلاس سارو اصاحب نے حل کر دی۔ انہوں نے اپنی کتاب اجمیر کے صفحہ ۳۸ پر غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے آبائی وطن سنجر کے متعلق لکھا ہے کہ متصل سیستان ہے اور سیستان بلاد غور میں ہے۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ سنجر اور غور ایک ہی ہیں اور ان میں امتیاز کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس سند پر بلا خوف تردید صاحب معین العارفین نے خواجہ سنجری رحمۃ اللہ علیہ کو پیر مرد غوری بنا دیا۔ بہر حال اس داستان سرائی کا ماحصل یہ ہے کہ دھمکی سے ڈر کر غریب نواز اجمیر سے اوش چلے گئے۔ اوش سے واپسی میں غزنی آ کر انہوں نے سلطان کو خواب میں مژدۂ فتح سنایا اور عالم ظاہر میں بشکل معین الدین تولکی فوج سے امداد فرمائی اور پیشاور پہنچ کر پیر مرد غوری کی صورت اختیار کی۔ پھر سلطان ملتان چلا گیا اور غریب نواز لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاہور میں سید حسن زنجانی سے ملتے ہوئے دہلی آئے اور دہلی کے

فتح ہونے سے پہلے اجمیر میں داخل ہو گئے۔ یہاں پتھورا نے میدان جنگ میں جانے سے پہلے پھر نکل جانے کا ان کو حکم دیا اور اس مرتبہ بجائے سر تسلیم خم کرنے کے غریب نواز نے منہ توڑ جواب دیا۔ ''یا ہم نکلیں گے یا تو نکلے گا اور سمجھ لے تو زندہ گرفتار کر کے قتل کیا جائے گا''۔ اس طرح حضرت والا کا اجمیر میں دوبارہ تشریف لانا ثابت کر کے ایک محیر العقول مگر خلاف واقعہ وہمی کرامت کا انکشاف کر کے دکھا دیا۔ اب یہ خبر نہیں کہ رفقائے سفر پر کیا گزری۔ ان صاحبان نے بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی ہو گی جس کو بہ صیغہ راز سر بند رکھا گیا ہے۔

بہر حال تاریخی واقعات سے حضرت والا کے اجمیر تشریف لانے کے صحیح وقت اور سال کے متعلق تزک جہانگیری اور اکبر نامہ کا بیان مطابق واقعات ہو کر موزوں، واضح اور صحیح ہے کہ محمد غوری کی آمد سے پیشتر ۵۸۷ھ میں تشریف لائے۔ جب کہ اس نے قلعہ بھٹنڈہ فتح کر لیا تھا۔ اور جب تراوڑی کی دونوں لڑائیاں ہوئیں تو حضرت والا اجمیر میں تشریف فرما تھے۔ بیرون ولایت نہ کہیں گئے اور نہ متعدد مرتبہ اجمیر آئے۔ اب صاف واضح ہے کہ سرزمین اجمیر کو حضرت والا کے قدوم میمنت لزوم کا شرف (۵۸۷ھ مطابق ۹۲۔ ۱۱۹۱ء) حاصل ہوا۔ اور اس کے بعد اگر اجمیر سے باہر گئے تو حدود ہند میں ہی گئے۔

باب ۱۰

قیام اجمیر کی کرامتیں

باما شراب خوردو بہ زاہد نماز کرد

بہ ہزار جلوہ گری ورعنائی جب حضرت غریب نواز نوراللہ مرقدمع اپنے رفقائے سفر کے داخل اجمیر ہوئے تو اجمیر ہی نہیں بلکہ کل ہندوستان کی قسمت چمک اٹھی۔ حضرت والا کے سامان میں تیر و کمان تھا، چقماق و نمکدان تھا اور قرآن تھا۔ تشریف آوری کے وقت اجمیر میں نہ پرتھوی راج تھا اور نہ اتنی فوج تھی کہ اجمیر کی حفاظت کرسکتی۔ مزید برآں یہ کہ شہاب الدین محمد غوری کے حملہ کی وجہ سے یہاں بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔ اور کل فضامیں پریشانی کا عمل تھا۔ اسی عہد میں آگے چل کر کچھ دن بعد تاریخ نے ایک عجیب وغریب داستان سنائی ہے۔ محمد غوری کے ایک جنرل نے اٹھارہ آدمیوں کے ساتھ حیرت انگیز طریقے سے صوبہ بنگال فتح کیا تھا(1)۔ مگر یہاں اس وقت اٹھارہ کے بجائے حزب اللہ کے چالیس جانباز موجود تھے۔ تیر و کمان سے ملک فتح کئے جاسکتے ہیں مگر قلوب کی تسخیر نہیں ہوا کرتی۔ مادی غلبہ قلب کے مشبہات وحجابات کو دور نہیں کرسکتا۔ ان حضرات نے برہانی اور یقینی دلائل سے قلوب فتح کرنے کا کام بجائے تیر و کمان کے چقماق سے لیا اور پھر قرآن سے مہر لگائی۔ چقماق سے آگ پیدا کی جاتی ہے۔ آگ کا کام جلانا اور روشنی دینا ہے۔ چنانچہ قلبی چقماق

1۔ محمد بختیار خلجی نے ۱۱۹۹ء میں جس طرح بنگال فتح کیا تھا اس کی تفصیل طبقات ناصری میں ہے۔ بہار فتح کرنے کے بعد (نودیہ) لکسوتی (بنگال) میں اٹھارہ سواروں کے ساتھ پہنچا اور فوج کو بعد میں آنے کی ہدایت کی۔ یہاں کے لوگ ان اٹھارہ سواروں کو گھوڑوں کا تاجر سمجھے وہ سب رفتہ رفتہ رائے لچھمن سین کے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ وہاں تلواریں نکال کر انہوں نے حملہ کردیا فریاد وشور نے محل کو سر پر اٹھالیا۔ راجہ جو کے بن کھانا کھا رہا تھا سر پر پاؤں رکھ کر بے اختیار بھاگا۔ محمد بختیار نے خزانہ، حرم اور محل پر قبضہ کرلیا اور بعد میں آنے والی فوج نے شہر پر تسلط جمالیا۔

نے سینہ کی کثافت کو سوخت کیا اور قلب کو نور سے منور کر دیا۔ چقماق کی چنگاری عارضی ہوتی ہے۔ اور چیخ کر رہ جاتی ہے۔ قرآنی نور عشق کی چنگاری کو مستحکم مستقل و لازوال بنانے کا ضامن ہو جاتا ہے۔ نمکدان سے محبت میں ذائقہ پیدا کیا گیا۔ جراحت عشق پر نمک چھڑکا گیا اور اس سے ہنسی خوشی چٹخارے لئے گئے۔

حضرت والا نے آتش محبت کے ذریعہ نرالے انداز میں قلوب کو فتح کیا اور قرآنی روشنی سے تاریکی وظلمت کے بادل چھانٹ دیے۔ اس نورانی روشنی سے اجمیر جگمگا اٹھا۔ نورانی شعاعوں سے کل ہندوستان معمور ہو گیا اور ہندوستان کے قرب و جوار میں دور دور اُجالا پھیل گیا۔ وہ قلب اب بھی کارفرما ہے۔ وہ نور اب بھی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا ہوا ہے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر مزار پاک پر مغربی محراب میں نقرائی صندوق کے اندر قرآن پاک رکھا ہوا ہے۔ جو حضرت والا کے مطالعہ میں تھا۔ اس محراب کے باہر مغرب کی جانب نیم مسقف جگہ میں قرآن کی تلاوت روزانہ آج بھی اتنی ہی ہوتی ہے کہ بایدوشاید۔ وہ قرآن نورانیت کی یاد تازہ کر رہا ہے اور آج بھی سبق دے رہا ہے۔ اس قرآن اور قرآن خوانی پر لوگ توجہ نہیں کرتے اور ان کی ظاہر بین اور بندھی ہوئی نگاہ سماع پر جاتی ہے۔ جو فروعی شے ہے۔

بہ اتباع رسول عربی ﷺ قرآنی روشنی دوسرے عظیم المرتبت بزرگوں نے بھی پھیلائی ہے۔ اور بڑی آن شان سے پھیلائی ہے۔ مگر حضرت والا کے انداز اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ نرالے ہیں۔ خواجہ پیا کی چتونیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ غرابت وندرت کی وجہ سے ایک تو چشتیہ اصول خود ممتاز تھا۔ پھر ہندوستانی ماحول پر جب اسے منطبق کیا گیا تو رنگ چوکھا آیا اور ماحول کی خصوصیات نے اور بھی امتیاز پیدا کر دیا۔ ہندوستانیوں کی توہم پرستی یونانیوں کے توہمات سے بڑھی چڑھی ہے۔ اہل فکر جب سنجیدگی سے غور کریں تو حضرت والا کی اصلاح وجدت خود سامنے آجائے گی۔ بت پرستی کو تصور شیخ عطا کر کے روحانی بنا دینا اور شرک سے بچا لینا معمولی بات نہیں۔ لیکن چشتیہ تعلیم کی نورانیت اس قدر نظارہ سوز ہے کہ کمزور آنکھیں برائے چندے چکا چوند ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور اس نورانیت کو ہندوستانی

ماحول کے رنگ میں دیکھنے لگتی ہیں۔ اس تعلیم سے جب شعور اصلی وکامل حاصل ہو جاتا ہے تو نجات کا راستہ کھل جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بے شعوری ہی کی وجہ سے شعبدہ بازیاں وجود میں آتی ہیں۔ تذکرہ نویسوں کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہیں لے دے کر ساری داستان میں اتنا یاد ہے کہ حضرت والا نے خوارق و نوادر اور سماع سے اشاعت اسلام فرمائی تھی۔ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ﴿۱۶﴾ (نور) جملہ تذکروں میں بجائے حقیقی تعلیم کے کرامتوں کا حصہ چمکا چمکا کر لکھا گیا ہے۔ اور بہ تقلید اہل ہنود اسی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن جو کرامات چمکا چمکا کر لکھی گئی ہیں وہ ہیں کیا اور ان کی تعداد کتنی ہے۔ گنتی کی محض چند ہیں اور انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ اب اگر جائزہ لیا جائے تو یہ کرامتیں حضرت والا بالائے نورانی پر موزوں بھی نہیں آتیں اور پھر ان جملہ روایات کا موضوع بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کرامت کا تذکرہ جس انداز سے کیا گیا ہے۔ اس سے بجائے عظمت وجلال کے دہشت و وحشت کی تصویر سامنے آتی ہے۔ اور ان میں محبت ورافت کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ صاف کیوں نہ سمجھا جائے کہ حضرت والا کی جمالی خصوصیت اور امتیازی شان پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

معجزات وکرامات برحق ہیں۔ ان سے انکار کفر وفسق ہے۔ مگر ان کا منشا اس سے بہت زیادہ اہم ہے جو بظاہر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے اظہار کی صورت اس سے قطعی جدا ہے جو عام طور پر مشہور ہے۔ جب ابلاغ کی کوئی صورت نہیں رہتی تو بدرجہ مجبوری معجزہ کا صدور ہوتا ہے اور علانیہ ہوتا ہے۔ اسی واسطے معجزے کے انکار پر غضب الٰہی نازل ہوا کرتا ہے۔ اب کرامت کے متعلق یہ ہے کہ اس کو حیض اولیاء سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ولی جب اسکے اخراج پر مجبور ہوتا ہے تو پوشیدہ طور پر اسے خارج کرتا ہے۔ اعلان سے کرامت کی خوبی جاتی رہتی ہے۔ اور تاثیر غائب ہو جاتی ہے۔ معجزہ وکرامت اوہام پرستوں کا تماشا نہیں ہے۔ بلکہ حکمت الٰہی کے رازوں میں سے راز ہے۔ مخالفین متہم کرتے ہیں کہ رسول عربی ﷺ سے معجزات برائے ہیبت صادر ہوئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا تک معجزے سے خالی نہ تھا۔ مجلس اقدس میں صحابہ کو خوف لگا رہتا تھا کہ کہیں ان میں سے کسی کے متعلق

وحی نہ آجائے۔لیکن اگر کسی کو نہ دکھائی دیں تو یہ خود دیکھنے والے کا قصور ہے۔کرامت چونکہ حیض اولیاء ہے۔ اس لئے بے نیازی اور پردہ داری کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ معجزہ اعلان چاہتا ہے اور کرامت دنیائے حس سے باہر نکلنا چاہتی ہے۔ تا آنکہ کوئی غوث، قطب اور مجدد پیدا کیا جائے۔ چنانچہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بہ حیثیت ولی ومجدد تشریف لائیں گے نہ کہ بہ حیثیت نبی کے۔ کرامت کا اعلان وتذکرہ درحقیقت کرامت کی رسوائی ہے۔ اور پھر کرامت کسی دعویٰ کی دلیل بھی نہیں بنائی جاسکتی۔ اس پر فخر کرنا اور اس کو کسی ولی کی عظمت کا معیار قرار دینا عجوبت کی علامت ہے۔ ولی کی عظمت اور کرامت کا معیار دراصل اس کی تعلیم ہے اس کا اخلاق ہے اور اس کا تقویٰ ہے جس کی بناء کتاب اور اسوۂ حسنہ پر ہوتی ہے۔

تشریف آوری کے بعد اجمیر میں حضرت والا کی چند کرامتیں بیان کی گئی ہیں اور ان کو عجوبیت وباطل پرستی کی وجہ سے انبیاء کے معجزات سے بھی تطبیق دی گئی ہے اور وہ چند کرامتیں یہ ہیں:

ا۔ساربانوں کی گستاخی پر اونٹوں کو سزا کہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

۲۔روزانہ گائے کا گوشت اور مچھلیاں کھانے پر راجہ کا پجاری جب معترض ہوا تو اسے رعب وجلال سے مسلمان بنالیا۔

۳۔اناساگر کا پانی خشک کردیا۔

۴۔جے پال جوگی نے ہوا میں پرواز کر کے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا تو اپنی نعلین شریف کو ہوا میں اڑا کر اسکے سر پر مسلط کردیا اور اس کی ضربوں کی وجہ سے اسے نیچے اترنا پڑا۔

یہ جملہ کرامتیں حضرت والا کی شان جمالی کے خلاف ہیں اور شان جلالی کا اظہار کرتی ہیں۔ سیاق وسباق اور اصول وعادت کو مدنظر رکھا جائے تو یہ کل داستانیں حقیقت سے دور نظر آتی ہیں۔ ہندو قوم پنڈتوں اور رشیوں کا ہر حال میں ادب کرنے کی عادی ہے۔ لہٰذا ساربانوں سے غلطی کا سرزد ہونا خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ تو اور بھی مہمل بات ہے کہ

ان اخلاق اور عجز والوں نے خفیف سی سخت کلامی پر سوء مزاجی کا اظہار کیا ہو۔ اونٹ جہاں بندھا کرتے تھے وہاں اب اولیاء مسجد واقع ہے۔ اپنے نقطہ نظر سے اس جگہ کو قیام کے لئے مناسب نہ سمجھ کر حضرت والا کا قافلہ خود انا ساگر کے قریب چلا گیا ہوگا۔ اور یہ جگہ اب غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے چلہ کے نام سے مشہور ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت تندرست و توانا اونٹ فوجی بار برداری کے لئے ترائن کی جنگ کی خدمات کے متعلق مامور تھے اور کمزور و معذور اونٹ یہاں چھوڑ دیے گئے تھے۔ جب اتفاقیہ ان کی بیماری و کمزوری میں اضافہ ہوا تو عتاب سے بچنے کے لئے ساربانوں نے ان اللہ والوں سے رجوع کی ہوگی۔ اونٹ ان کی ہی دعا سے اچھے بھی ہوگئے۔ اب اس سیدھے اور صاف واقعہ کو اوہام پرستوں نے ہندوستانی رجحان کے مطابق اس طرح بیان کردیا جو مشہور ہے۔ اور یہ شہرت یقیناً کرامت کی توہین ہے چہ جائیکہ عظمت کی دلیل ہے۔ اس کے بجائے بیمار اونٹوں کا دعا کی وجہ سے اچھا ہونا زیادہ قابل وقعت ہے۔ چنانچہ قبولیت دعا کے اثرات کو دیکھ کر خلق کا ہجوم رہنے لگا اور صحبت سراپا رحمت سے مستفیض ہوکر محلہ اندرکوٹ کے راجپوت مسلمان ہوگئے۔ ان کی اولاد آج بھی موجود ہے۔

یہ روایت کہ روزانہ گائے کا گوشت اور مچھلیاں کھایا کرتے تھے۔ عقل کو لرزہ براندام کرنے کو کافی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کفر کس لئے بکا گیا۔ کہنے والے اور سننے والے ان حضرات کے معمولات و عادات سے کیا واقف نہیں تھے۔ جو ایسی بے سروپا بات گھڑ دی۔ یہ صاحبان تو دنوں کے بعد سوکھی روٹی کے ٹکڑوں سے افطار کرنے کے عادی تھے۔ پھر بھلا گوشت و مچھلی سے ان کو کیا علاقہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر باز پرس کی ضرورت ہوتی تو راجہ کا پجاری معمولی آدمی نہ تھا۔ وہ تحقیق و تفتیش حکام و عمال کی معرفت کرتا۔ اسے خود آنے کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ یقیناً مقبولیت کا حال سن کر بچشم خود ان حضرات کے اخلاق و آداب کے معائنہ و مشاہدہ کرنے آیا تھا۔ جب اپنی روحانیت سے ان کی روحانیت کو افضل و برتر پایا تو فرعون کے ساحروں کی طرح بے محابا پورے یقین کے ساتھ ایمان لے آیا۔

اس کا اسلامی نام سعدی رکھا گیا۔ اوہام پرستوں نے اسے شادی دیو کے نام سے مشہور کیا۔

جئے پال جوگی کے اسلام لانے کا بھی قصہ کچھ اسی قسم کا وقوع ہونا چاہئے۔ اس نے اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے اپنے کرتب ضرور دکھائے ہوں گے۔ جب اس کی شعبدہ بازی کی بے اثری نے صحیح نتیجہ پر پہنچا دیا کہ دیو بگریز داز اں قوم کہ قرآن خواند۔ تو اس نے سر نیاز قدموں پر رکھ دیا۔ اور ہندوانہ عقیدت کے مطابق حضرت والا کی نعلین اپنے سر پر رکھ لی۔ اس سے یہ سمجھنا نہیں چاہئے کہ نعلین کو ہوا میں اڑانے کی قوت نہیں تھی صحیح نہیں۔ اولیاء اور مقبولان بارگاہ کو اخلاق الٰہی سے متصف ہونے کے بعد اس قسم کی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ اپنی اس قدرت کو بے موقع استعمال نہیں کیا کرتے اور جوگی جے پال کی آسمان پروازی کبھی اس قابل نہ تھی کہ ایسی عظیم کرامت کا اظہار کیا جاتا۔ بہر حال ندامت اور احساس نقص نے جے پال جوگی کو یقین کی منزل میں پہنچا دیا۔ اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ راہ خدا میں جو اپنی جان فدا کرتے ہیں وہ مرا نہیں کرتے۔ انتقال کے بعد بھی ان سے زندگی کے حرکات وجود میں آتے ہیں۔ اس اصول پر عبداللہ بیابانی کو زندہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ بغیر موت کے مسلسل عمر جاوداں کے متعلق قرآن پاک حضرت خضر علیہ السلام تک کے لئے بھی خاموش ہے۔ حضرت ابن عربی کا بیان ہے کہ متعدد جہان پیدا کئے گے ہیں۔ ہر جہان اور ہر دنیا کا آدم وخضر جدا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ روحانی طور پر مختلف زبانوں کے باوا آدموں اور خضروں سے انہوں خود ملاقات کی ہے۔

جب حضرت والا اجمیر تشریف لائے تو شہاب الدین محمد غوری کی لڑائیوں کی وجہ سے اجمیر میں فوجیوں کی آمد ورفت کا سلسلہ حد سے زیادہ تھا۔ اس لئے پانی ضرورت سے زیادہ صرف میں آیا ہوگا اور ممکن ہے کہ موسمی اثرات کا بھی اس میں دخل ہو۔ کیونکہ موسم سرما تھا۔ لہٰذا اناساگر میں پانی کی قلت کی وجہ سے بستی کو تکلیف ہوگئی ہو تو بعید نہیں۔ اس موقع پر عبداللہ بیابانی کی درخواست پر حضرت والا نے دعا فرما دی یا اپنے بدھنے کا پانی اناساگر میں ڈال دیا تو پانی کی مقدار بڑھ گئی۔ یہ کرامت صحیح ہو سکتی ہے۔ اگر عجائب پرستی کرامتوں کی

فطرتی سادگی کو ذلیل رنگ میں پیش کر کے واہمہ کا شکار بنا دے تو یہ معیوب اور غلط ہے۔ قیاس و وہم کی بے سروپا داستانیں عظمت کی دلیل نہیں ہوا کرتیں۔ ہمارے یہاں اتقاء معیار عظمت ہے اور اتقاء عمل بالقرآن، پیروئ رسول ا۔ سلوک اولیاء سے حاصل ہوتا ہے کسی بزرگ کی بزگی اسی پیمانے سے ناپی جا سکتی ہے۔ ایک بزرگ پر اعتراض کیا گیا کہ تم سے کوئی کرامت ظاہر نہیں ہوتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس سے بڑھ کر اور کرامت کیا ہو سکتی ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ میری کوئی نماز کبھی قضاء نہیں ہوئی۔ حضرت والا کا کوئی عمل قرآن سے باہر نہیں تھا۔ پیروئ رسول کے سمجھنے کے لئے حضرت والا کے حالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی کوئی بات اتباع رسول سے خالی نہ تھی۔ حد یہ ہے کہ وضو کے وقت انگلیوں میں خلال کرنے کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اسی اتقاء کی دقیقہ رسی و فراست کو کرامت سے تعبیر کیا جایا کرتا ہے۔ اور یہ نتائج اپنے مقاصد کے حصول کے بعد جب گفتگو میں آتے ہیں تو لطف جاتا رہتا ہے۔ بازیچہ عقل بن جاتے ہیں اور ان کی بوقلمونی تحریر و تقریر کے احاطہ میں نہیں لائی جا سکتی۔

حضرت والا کی حیات طیبہ میں ایسے حالات بھی ہیں جو صحیح معنوں میں کرامات ہیں۔ لیکن اس کو کیا لکھا جائے اگر شپرہ چشم کو نہ دکھائی دیں اور عجائب پرستوں کو ان کی ہوا نہ لگے۔ مثال کے طور پر ایک بدیہی بات یہ ہے کہ اجمیر والے غوری کے مقابل اپنی کامیابی کے خواہشمند تھے۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ یہ دونوں مسلمان ہیں اس لئے اپنی آرزو و تمنا کو غوریوں کے خلاف عرض نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ہوا ایسا کہ اپنی بدحواسی و پریشانی کے سلسلہ میں درپردہ اس تمنا کو بھی ظاہر کر گئے۔ ان لوگوں کی حیرت و مسرت کی انتہا ہو گئی جب حضرت والا نے ان کی بہتری کی دعا کرنے کے لئے ہاتھ اٹھا دیے۔ بعد میں تراوڑی کی جنگ اول میں فتح کی خبر جب اجمیر میں آئی اور سب نے سن لیا کہ مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو یہاں حیرت نہیں عید ہو گئی۔ فتح کی خوشی میں نہیں بلکہ حضرت والا کی بے لوثی کی خوشی میں اور اس خوشی میں کہ اپنے غلاموں کی خاطر انہیں کس درجہ عزیز ہے۔ اس کے بعد وہاں والوں میں سے کوئی کیسے

سمجھتا کہ یہ قوم پرست ہیں، تعصب رکھتے ہیں، رنگ و زبان کی قید میں مبتلا ہیں، کلچر کے فدائی ہیں یا محمد غوری کے جاسوس ہیں۔ اس بات پر اجمیر کی آبادی ایمان لائی ہو یا نہ لائی ہو مگر غلام بن کر رہ گئی۔ انہوں نے غور کیا۔ وہ غور کرنے کے لئے مجبور تھے کہ نہ برہمنوں کی رام کہانیوں سے سکون حاصل ہوتا ہے نہ نجومیوں کی پیشن گوئیوں سے تسکین ملتی ہے۔ اور نہ پوجا پاٹ سے امید وہیم کی وحشت دور ہوتی ہے۔ لیکن یہ حضرت ہر تنگ نظری سے آزاد ہیں۔ انسانیت کی بھلائی ان کے مدنظر ہے۔ دوسروں کی تکلیف پر اپنا دل گھلاتے ہیں۔ اور معمولی طور پر سیدھی سی مختصر بات صاف کہہ دیتے ہیں، جس سے تسلی بھرپور ہو جاتی ہے۔ جب اس قسم کی روزانہ زندگی میں ہر شخص کو تسکین قلبی حاصل ہوئی تھی اور ایک کی دوسرے کو خبر نہ ہونے پائی تھی تو یہ لوگ جی جان سے کیوں نہ فدا ہو جاتے۔ اگر ہر شخص اپنی سرگزشت بیان کر دے تو ہزاروں صحیح کرامتوں کا دفتر جمع ہو جائے۔ لیکن وہمی عجائبات تو کہہ مکرینوں کی طرح ہوتے ہیں مگر حاصل وصول کچھ نہیں۔ اس احساس و تجربہ کے بعد عقیدت کی فراوانی نے تقلید و تعمیل پر انہیں آمادہ کیا۔ جب فیض صحبت سے مالا مال ہوئے تو خود بھی صدق مقال اور روشن ضمیر بن گئے اور نورانی کیفیات کے لطف اٹھانے لگے۔ اسی رجحان و عقیدت مندی کا تقاضا تھا کہ قیام کے لئے ایسی جگہ چلنے پر اصرار کیا گیا جو موجودہ قیام گاہ سے زیادہ بہتر زیادہ موزوں اور زیادہ محفوظ ہو۔ یہ زمین سعدی (شادی دیو) کی تھی جو اس نے نذر کر دی اور اس جگہ مستقل قیام کا انتظام و انصرام ہو گیا۔ اسی جگہ اب لنگر خانہ اور روضہ اقدس ہے اور اس میں اولیاء مسجد بھی شامل ہے۔

بھٹنڈہ کے قلعہ کا محاصرہ کرنے کے کچھ عرصے کے بعد جب پرتھوی راج اجمیر واپس آیا تو اجمیر کا نقشہ دگرگوں پایا۔ پرچہ نویسوں نے جن حالات سے اطلاع دی تھی۔ اس سے بھی زیادہ عجیب کیفیت دیکھی۔ مسلمان درویشوں کے قیام اور باشندگان وعمال کی وابستگی کا حال سن کر اس کے طوطے ہرن ہو گئے۔ بربنائے پیشن گوئی وہ مسلمانوں سے پہلے ہی مشکوک تھا۔ غوری کی لڑائیوں کی وجہ سے اس کی مسلمان دشمنی اور بھی تیز ہو گئی۔ مسلمان

درویشوں کو گرفتار کرنے یا خارج البلد کرنے میں اسے آن واحد کے لئے بھی تکلف نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر لوگوں کی عقیدت مندی و وابستگی نے اسے ڈرایا اور وہ سیاست سے کام لینے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے بدظنی پیدا کرنے کے لئے اعلان کیا کہ یہ لوگ شہاب الدین کے جاسوس ہیں۔ اگر عقیدت کمزور ہوتی تو راجہ کا نشتر کام کر دیتا۔ اس نے جاسوس مقرر کئے کہ درویشوں کی خامیاں معلوم ہوں۔ جب کسی طرح مراد حاصل نہیں ہوئی تو براہ راست دریافت کیا کہ شان نزول کیا ہے۔ جواب دیا گیا کہ تہذیب سکھانے آئے ہیں۔ انسانیت کو بلاؤں سے بچانا ہمارا کام ہے۔ اور اپنی تعلیم ہم آپ کی خدمت میں بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ راجہ دعوت کے مفہوم کو کیا سمجھتا۔ نشہ حکومت میں اس کا منشا تو کچھ اور تھا۔ اب اس نے ایک ملازم کے ذریعے ڈورے ڈالے۔ مقصد حاصل نہ ہونے پر اس نے مسلمان پر عتاب کیا۔ وہ مغلوب ملازم حضرت والا کی خدمت میں گیا کہ سفارش کر دی جائے۔ سفارش کر کے اس کی دلدہی کر دی گئی۔ سفارشی خط دیکھ کر راجہ جزبز ہوا اور غصہ میں برسر دربار علانیہ کہہ اٹھا کہ یہ فقیر مشکوک ہیں۔ ان کو یہاں سے ہٹا دینا چاہئے۔ شدہ شدہ یہ خبر حضور خواجہ صاحب تک پہنچ گئی۔ سن کر تامل فرمایا اور فرمایا کہ ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ گویا اس مسلمان کو ستانے کا یہ جواب تھا۔ اس فقرے کو حاضرین نے سنا، اجمیر والوں نے سنا، دربار والوں نے سنا اور خود پرتھوی راج نے سنا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ پیشین گوئی ہے اور نہ کوئی اس کا صحیح مفہوم سمجھنے پایا۔ اگر پرتھوی راج سمجھ لیتا تو قیامت ڈھا دیتا۔ پرتھوی راج والے سمجھ لیتے تو تکا بوٹی کر دیتے۔ اور حاضرین سمجھ لیتے تو سہم کر رہ جاتے۔ یہاں کے انداز اور اظہار کی جرأت نے سب کو سراسیمہ کر دیا اور عقلوں پر پردے پڑ گئے۔ یہ پیشن گوئی غلبہ روم کی پیشن گوئی کے اتباع میں تھی۔ جس کو عرب والے، روم والے اور ایران والے وجود میں آنے سے پہلے نہیں سمجھ سکے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

حضرت والا نے ایک مسلمان کی سفارش کی تھی جو مسموع نہیں ہوئی۔ اب پرتھوی راج کو حق ہوگیا کہ راہ و رسم پیدا کر کے قرب سلطانی کی طرف مائل کرے۔ اس نے ایک مسلمان کو

ایک سفارش کے ساتھ خدمت اقدس میں بھیجا کہ اس کو مرید کر لیا جائے۔ مصلحت وحقیقت جو کچھ بھی ہوا سے مرید کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس انکار کو پرتھوی راج نے اپنی ذلت سمجھا۔ ہر طرح جال میں پھنسانے کی کوشش جب بیکار ہو گئی تو اس انکار کو نافرمانی اور بغاوت کا مترادف سمجھ کر شہر بدر کر دینے کا حکم نافذ کر دیا۔ سرکاری حکام جب اس حکم کی تعمیل کے لئے جب حضرت والا کے پاس آئے تو متانت کے ساتھ جواب دیا کہ ''تین دن کی بات ہی کیا ہے، جانے والا خود ہی چلا جائے گا''۔ عمال نے واپس جا کر رپورٹ کی کہ تین دن کی مہلت مانگی ہے۔ پھر وہ فوراً واپس چلے جائیں گے۔ پرتھوی راج مطمئن ہو گیا کہ تین دن کے بعد پہلو سے کانٹا نکل جائے گا۔

اتفاق یہ ہوا کہ اس واقعہ کے دوسرے دن شہاب الدین محمد غوری کے سفیر قوام الملک رکن الدین حمزیٰ حجابت کے لئے اجمیر پہنچے اور تمام حالات بتا کر پیغام دیا کہ حضرت سلطان لشکر عظیم کے ساتھ ہندوستان آنے والے ہیں۔ خون خرابے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہتر ہے کہ بھٹنڈہ قلعہ سے دستبردار ہو کر صلح و دوستی کر لی جائے۔ ورنہ نتیجہ ظاہر ہے کہ جنگ ہوگی مقابلہ کی نوبت آئے گی اور پھر جو کچھ بھی حشر ہو۔ پرتھوی راج یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ پیغام حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا اور اس خیال سے کہ سفیر صاحب سے پہلے پہنچ جائے دوسرے ہی دن بیتابی و اضطراب کے ساتھ میدان جنگ کی طرف چل دیا۔ جہاں اس کی فوجیں قلعہ بھٹنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے پڑیں تھیں اور عنقریب سر کرنے والی تھیں۔

اب بھی اگر چشم بینا برملا اور زندہ کرامت دیکھنا چاہتی ہے تو اجمیر خود اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ وہ ایک تیرہ تار مقام تھا۔ اور اب دارالخیر اجمیر ہے۔ حضرت والا کے کمال خلوص و صداقت نے اسے مہبط نور بنا دیا۔ کہاں سنجر اور کہاں اجمیر۔ ہندوستان کو جب اپنا وطن ٹھہرایا تو وہ جنت نشان کہلایا۔ اس کی بلندی و عظمت نمونہ بن کر رہ گئی۔ نیت کی پاکی و صداقت کتنی قوی و مستحکم تھی کہ یہ فیض اب بھی جاری ہے۔ چشمہ کی طرح ابل رہا ہے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اجمیر کے در و دیوار اور زمین و آسمان انقلاب کا شکار

ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کی نورانیت پر حرف نہیں آ سکتا۔ وہ لازوال ہے۔ صداقت و خلوص کی گہرائیاں ایسی نمایاں کرامتیں ہیں جس سے منکر و مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے۔

بہر حال ۵۸۹ھ/ ۹۳۔ ۱۱۹۲ء میں فتح دہلی کے بعد اجمیر پہنچ کر فاتح ہند شہاب الدین محمد غوری، سلطان الہند خواجہ معین الدین حسن سنجری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت انور میں ادب و خلوص سے حاضر ہوا اور دیکھتے ہی پہچان لیا کہ غزنی والے خواب میں آس بندھانے والے اور بشارت میں فتح دینے والے بزرگ کون تھے۔ پہچاننا تھا کہ بے ساختہ قدموں پر گر پڑا اور سر رگڑتا رہا۔ اس کے بعد بیعت سے مشرف ہوا (1) اور عرض کیا:

غلام نرگس مست تو شہریارانند

1۔ افادیت حمید میں مذکور ہے کہ اس موقع پر حضرت سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے۔ اور انہوں نے اس وقت محمد غوری کے ساتھ راجہ جے چند کو بھی دیکھا تھا۔ یہ بیان کہ "صوفی صاحب موجود تھے"۔ اس لئے قبول نہیں کیا جا سکتا کہ وہ فخریہ فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ اخبار الاخیار (ص ۴۰) پر درج ہے۔ کہ اول مولودے کہ بعد از فتح دہلی در خانہ مسلمان آمدم۔

باب ۱۱

اوصاف واخلاق

آنانکہ وصف حسن توتفسیری کنند
خواب ندیدہ راہمہ تعبیری کنند

نرگس مست کا نام سنتے ہی آنکھوں کے سامنے آنکھیں پھرنے لگیں۔ حضرت والا کی آنکھیں عین دین تھیں اور چشمہ فیض ان بھرے ہوئے ساغروں کو دیکھ کر آنکھیں تھک جاتی تھیں مگر دل نہیں بھرتا تھا۔ یہ آنکھیں میکدۂ وحدت کا اشارہ کر کے آن واحد میں انقلاب پیدا کر دیتی تھیں۔ یہ رس بھری آنکھیں بولتی تھیں، رقص کرتی تھیں اور متوالا بنا دیتی تھیں۔ اہل دل متقاضی تھے، قربان نگاہ تو شوم بازنگاہ ہے۔ ان آنکھوں میں نیند کا گزر نہیں تھا۔ بنی مبارک عرش اعظم کا دم بھرتی تھیں۔ ہر سانس کے ساتھ آنکھوں میں بجلیاں کوندجاتی تھیں۔ بھویں تیغ اصفہانی بن کر انکے مے خانوں کی پاسبانی کرتی تھیں۔ کشادہ پیشانی میں دشت حیران کی وسعت تھی۔ لبہائے مبارک کی سنجیدگی تبسم کی جان تھی۔ مسکراتے نہیں تھے مگر مسکراتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بھرا بھرا چہرہ نور سے دمکتا تھا۔ ایسے جیسے کہ چاندنی کھیت کرتی ہے۔ روئے منور کی نورانی شعاعیں منجمد ہو کر ریش مبارک کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ طرۂ دستار وحدہ لاشریک نما تھا اور انوار الٰہی اپنی طرف کھینچتا تھا۔ چوڑے چکلے شانوں پر سر اقدس گنبد خضرا معلوم ہوتا تھا۔ قلب اطہر گنجینۂ اسرار تھا۔ چاک گریبان سوزش محبت کی لپیٹوں کی نشاندہی کرتا تھا۔ سینہ صافی کے اندر تموج کا تقاضا تھا کہ "خداوند جہاں کہیں درد محبت ہو اپنے معین الدین کو عطا فرما"۔ قد بالا اور جسم نحیف تھا۔ جسد پاک پر موزونیت قربان تھی۔ رزق مقسوم مساکین کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ کھانا اتنا پکتا تھا کہ کھانے والے ڈھونڈے نہیں ملتے تھے۔ مگر خود سوکھے ہوئے ٹکڑے پانی میں تر کر کے ساتویں دن

افطار کیا کرتے تھے۔ کم خوری و کم خوابی ضرب المثل بن کر شامل تعلیم ہوگئی تھی۔ پوشاک میں ایک کفنی نما چادر تھی۔ جب کہیں سے پھٹ جاتی تو بخیہ کر لی جاتی اور جب میلی ہو جاتی تو دھولی جاتی۔ صفائی اور پاکی دور سے جھلک مارتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ شان جمالی شان جلالی کو محیط کئے ہوئے تھی۔ غلبہ حال میں اس قدر مستغرق ہو جاتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا ہوتی تھی۔ شفقت و رحمت داخل فطرت تھی۔ ایک مرتبہ ایک شخص (غالباً راجہ کا بھیجا ہوا) خنجر چھپائے بُرے ارادے سے حاضر دربار ہوا۔ تپاک سے اسے اپنے برابر بٹھایا اور نہایت لطف سے رازداری کے طور پر فرمایا ''موقع غنیمت ہے اپنا کام کر ڈالو''۔ وہ دنگ ہو کر رہ گیا۔ آستین سے خنجر نکال کر سامنے رکھ دیا اور اقبال جرم کے بعد اصرار کیا کہ اس سے میرا کام تمام کر دیجئے۔ ارشاد کیا ''انتقام و سزا ہمارا شیوہ نہیں اور تم سے تو کوئی قصور سرزد نہیں ہوا''۔ یہ کہہ کر اتنی دعائیں دیں کہ اس کا کام بن گیا۔ خدمت میں رہنے لگا۔ کئی حج کئے اور زمین حرم میں پیوند خاک ہوا۔ (سیر الاقطاب)

مرید کثرت سے شفقت پر حیران رہا کرتے تھے۔ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام خطوط ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے کسی مہربان دوست نے دوست کو لکھے ہیں اور ان میں کسی قسم کے تکلف کی بو نہیں معلوم ہوتی۔ بیان کی صفائی و سادگی دل آویز ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ دل کی توجہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ آئندہ و رونده کی محبت و خلوص سے آؤ بھگت کرتے تھے۔ جب کسی کا انتقال ہو جاتا تو جنازے کے ساتھ جاتے، قبر پر بیٹھ کر مغفرت کی دعائیں مانگتے اور سب کے چلے جانے کے بعد سب سے آخر میں واپس آتے۔ (راحت القلوب)

حضرت والا حقیقت محمدی کے مظہر کامل تھے۔ ان کی فطرت پیغمبرانہ تھی، اخلاق کریمانہ سو کرامتوں کی ایک کرامت تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ جب کہ تمام عمر عشق الٰہی میں گزارنے کے بعد صاحب خلق عظیم ﷺ کی پیروی کو مقصد حیات سمجھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کا والہانہ انداز میں ذکر فرمایا کرتے تھے۔ حدیث نبوی ﷺ بیان کرتے ہوئے گریہ طاری ہو جاتا تھا اور بڑی حسرت سے درد بھرے لہجہ میں بے بسی کے طور پر کہا کرتے تھے کہ قیامت میں

اس شخص کا کیا حال ہوگا اور وہ کیا کرے گا جس کو عیاذاً باللہ حضور نبوی سے شرمندگی ہوگی۔ طریقہ گفتگو تاثیر سے لبریز تھا۔ سب کچھ کہتے مگر مختصر انداز میں۔ جامع و مانع تقریر سن کر سامعین دم بخود رہ جاتے۔ اور کسی کا ایسا سنگین دل تھا جو رقیق نہ ہوتا۔ یہی اوصاف تھے جن کی وجہ سے پیر و مرشد خواجہ عثمان ہرونی ذوق و شوق سے فخر فرمایا کرتے تھے:

''معین الدین خدا کا محبوب ہے اور مجھے اس کی مریدی پر ناز ہے''۔ (سیر العارفین)

رحمت و بخشش سے مستفیض ہونے والی پاک باطن مستورات اور دوسرے عقیدت مندوں نے رجب میں عرس مبارک کی یاد دہانی کرنے کے لئے ماہ جمادی الاخریٰ کا نام خواجمندین یعنی خواجہ معین الدین رکھ دیا ہے۔

حضرت والا سے پہلے اور بعد ایک دو نہیں بلکہ بہت سے مختلف خانوادوں کے بزرگ اور اولیاء ہندوستان میں تشریف لائے۔ اور ان سب نے اپنی روحانیت سے اس ملک کے کسی نہ کسی حصہ کو مستنیر و مستفیض فرمایا(1)۔ مگر مخصوص سعادت چشتیوں ہی کے نصیب میں تھی۔ حضرت والا نے اپنی فراست خداداد اور اپنے اخلاق کریمانہ سے وہ دستور ایجاد کیا جس سے ہندوستان میں فاتحین و مفتوحین میں یگانگت پیدا ہوگئی۔ غیریت جاتی رہی اور اسلام کی نورانیت آب و تاب سے چمکی۔ حضور عطائے رسول کی مثال، خورشید جہاں تاب کی طرح ہے کہ اپنے انوار سے ہندوستان کی کل فضا کو نورانیت سے بھر دیا۔ حضرت ہندالولی کی زندۂ جاوید اور مسلمہ مقبولیت اور مراجعیت آفتاب آمد دلیل آفتاب کی طرح ہے۔ اور ان کی جامعیت کو محصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی واسطے دیکھنے والے حیرت میں تھے اور

1۔ شیخ اسماعیل لاہوری (۴۰۰ھ/۱۰۰۵ء) میں لاہور تشریف لائے۔ پھر مسعود غزنوی کے عہد میں حضرت علی ہجویری (متوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) نے لاہور میں اشاعت اسلام کی۔ سب سے پہلے سلسلہ چشتیہ ہندوستان میں جاری ہوا۔ بہ عہد قباچہ سلسلہ سہروردیہ کا اجرا حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے ملتان سے کیا۔ قادریہ و نقشبندیہ سلسلے بہت آخر میں آئے۔ سولہویں صدی کے آغاز میں حضرت سید محمد غوث گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مغربی پنجاب میں سلسلہ قادریہ شروع کیا۔ ان کا وصال بمقام اوچھ ۱۵۱۷ء میں ہوا۔ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اکبر کے عہد میں سلسلہ نقشبندیہ کی اشاعت فرمائی۔

سمجھنے والے ششدر ہیں کہ

نہ درون سینہ گنجی نہ برون سینہ آئی
ہمہ جلوۂ خدائی ہمہ شان کبریائی

باب ۱۲

شادی وخانہ آبادی

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہو سنا کے ندا ند جام و سندان باختن

عمر ۵۶ سال

اڑھائی تین سال کے قیام اجمیر میں حضرت والا کے سلوک، اخلاق اور تعلیم نے مقبولیت ومحبوبیت کے کلمے پڑھوائے اور دور دور چرچے ہونے لگے۔ اپنی اپنی نگاہ کے مطابق ہندوستان والے بزرگی وعظمت دیکھ کر'' پرم ہنس'' اور'' دیوتا'' سمجھنے لگے۔ ان کے یہاں اس مرتبہ والے نہ شادی کرتے ہیں اور نہ شادی کی ان کو اجازت ہے۔ اس خیال اور نقطہ نظر کی تردید کرنے اور بیدانتی نفس کشی کو مہمل قرار دینے کے لئے عالم بالا سے ہدایت ہوئی۔ عمر کے تقریباً چھپن ستاون سال طے کر چکے تھے۔ اور اپنی زندگی تجرد میں گزار دی تھی۔ لہٰذا ایک شادی نہیں بلکہ دو شادیاں کر کے ثابت کر دکھایا کہ ہمارے یہاں نفس پر قابو پانے کی کامیاب کوشش کی جاتی ہے۔ مگر نفس کو مردہ نہیں بنایا جاتا۔

پہلی شادی ۵۹۰ھ/ ۹۴۔ ۱۱۹۳ء کے قرب وجوار میں ہوئی۔ اور دوسری شادی دہلی کے دونوں سفروں کے درمیان میں حیات دنیوی کے ختم ہونے کے سترہ اٹھارہ برس پیشتر کی (گویا بیاسی سال کی عمر میں بسال ۶۱۶ھ/ ۱۲۲۰ء)۔

حضرت والا کی ازدواجی وخانگی زندگی یقیناً مثال ونمونہ ہوتی لیکن کیا کیا جائے کہ اس کے متعلق کوئی تفصیل محفوظ نہیں۔ عقیدت مندی کی محوبت نے خانگی اور ذاتی حالات کو محو کر دیا۔ البتہ اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ حرم محترم خانقاہ والے حصہ میں اکبری مسجد کے قریب بود وباش رکھتے تھے۔ ایک روایت یوں بھی ہے۔ اگرچہ ضعیف ناقابل التفات اور قطعی غلط

ہے مگر ہے کہ حضرت والا نے نہ شادی کی اور نہ ان کی کوئی اولاد ہوئی۔

پہلی شادی کے متعلق تحقیقات وفرمودات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ۵۹۰ھ میں کوئی صاحب ملک خطاب تھے۔ وہ کسی مقام پٹیلی کے حاکم تھے۔ انہوں نے کسی راجہ سے جہاد کیا تھا اور اس راجہ کی لڑکی کو گرفتار کر کے لائے تھے۔ پھر بنائے عقیدت مندی اس عفیفہ کو انہوں نے حضرت والا کی نذر کیا۔ اور ان محترمہ بی بی صاحبہ کا اسلامی نام ''امۃ اللہ'' رکھا گیا۔ تارا گڑھ کو پٹیلی بھی کہتے تھے۔ مگر وہاں کوئی حاکم ملک خطاب نہیں تھا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مذکورہ پٹیلی کوئی اور مقام ہوگا۔

۵۹۰ھ میں ایک تو اجمیر میں بغاوت ہوئی اور دوسری جنگ بمقام راتھوڑ ہوئی تھی۔ جس میں شہاب الدین غوری نے بنارس کے راجہ جے چند کو شکست دی تھی۔ اس کے بعد مہوبہ دکالنجر فتح کیا تھا۔ کالنجر میں کثیر جماعت عورتوں اور مردوں کی گرفتار ہوئی تھی۔ دوسری بغاوت اجمیر میں ہیمراج کے اشارے سے ہوئی تھی۔ ہیمراج پرتھوی راج کا بھائی اور گولا کا چچا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ صاحبزادی جس کا نام امۃ اللہ رکھا گیا۔ ہیمراج کے خاندان سے ہو۔ اس روایت کو فرو کرنے کے بعد سید حسن خنک سوار کا تقرر داروغۂ اجمیر کی حیثیت سے ۵۹۱ھ میں ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ داروغہ ہونے سے پہلے ان کا لقب ملک خطاب ہو۔ لیکن اگر ۵۹۰ھ تاریخ اٹل نہیں ہے۔ اور جنبش کرسکتی ہے تو انھلواڑے کے راجہ کو ۵۹۳ھ میں زیر کیا تھا اور مہوبہ میں فتح حاصل کی تھی۔ اس صورت میں ان صاحبزادی کا انھلواڑے کے راجہ بھیم کے خاندان سے تعلق ہوسکتا ہے۔ قیاسات اصلیت کو نہ پاسکے مگر اصلیت اسی جگہ کہیں نہ کہیں ہے ضرور۔

دوسری شادی آخر عمر میں سید وجیہ الدین مشہدی داروغۂ اجمیر کی صاحبزادی بی بی عصمت اللہ سے کی تھی۔ اس شادی کے موقع پر بطور رضامندی یہ فقرہ منقول ہے کہ ''اگرچہ میں سن رسیدہ ہوگیا ہوں۔ مگر اشارہ نبوی کے مطابق مجھے یہ رشتہ قبول ہے''۔ اپنی اس دوسری شادی کے بعد ہی حضرت فخر الدین گردیزی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی بعمر ۷۶ سال شادی کرنے

پر مجبور کیا تھا۔ ان کی اولاد میں موجود خدامان درگاہ ہیں جو صاحبزادگان اور سیدزادگان کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

منجملہ عجائبات یہ ہے کہ کسی نے بھی حضرت والا کی کسی اہلیہ کی تاریخ وفات نہیں لکھی ہے۔ لہٰذا نہیں بتایا جاسکتا کہ دوسری شادی پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد ہوئی تھی یا ان کی حیات میں۔ پھر یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ کونسی اولاد کس اہلیہ کے بطن سے ہوئی۔ حالات و واقعات سے البتہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ اور بی بی حافظہ جمال رحمۃ اللہ علیہا پہلی بی بی صاحبہ کی اولاد ہیں۔ اور دوسری کے تنہا صاحبزادے خواجہ ضیاء الدین ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ بی بی حافظہ جمال رحمۃ اللہ علیہا کے متعلق ایک فضول سی روایت یہ بھی ہے کہ کسی راجہ کی صاحبزادی تھیں اور حضرت والا نے ان کو پال لیا تھا۔

بقول صاحب احسن السیر خواجہ فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ فرزند اکبر تھے۔ غالباً ۵۹۱ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے بود و باش موضع مانڈل میں اختیار کی۔ بزرگ عالی مرتبت اور صاحب مقام عالی تھے۔ عمر ستر سال کی قیاس کی جاتی ہے۔ اور سال وصال غالباً ۶۶۱ھ ہے۔ مزار شریف قصبہ سرادر میں ہے۔ تیسری شعبان کو عرس ہوا کرتا ہے۔ بعض ضعیف تذکرہ نویسوں کے مطابق بجائے کسی کاشت کار کے ان کے ہی لئے زمین کا فرمان حاصل کرنے کے لئے دوسری مرتبہ حضرت والا نے دہلی کا سفر کیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۴ یا ۲۵ سال تھی۔ یہ صاحب اولاد کثیر تھے۔

خواجہ حسام الدین کے متعلق مشہور ہے کہ ابدالوں میں سے تھے۔ ۴۵ سال کی عمر میں وصال ہوا۔ درگاہ میں لب جھالرہ مزار ہے۔ آپ کے سات صاحبزادے تھے۔ بی بی حافظہ جمال رحمۃ اللہ علیہا عابدہ زاہدہ تھیں۔ بچپن میں ہی قرآن پاک حفظ کرلیا تھا۔ مستورات میں تعلیم چشتیہ کی اشاعت فرمایا کرتی تھیں۔ سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری کے صاحبزادے شیخ رضی الدین عرف عبداللہ سے شادی ہوئی تھی۔ سلطان التارکین بقول خود

۵۸۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر ان کی عمر کے سترہویں سال میں شیخ رضی الدین کی پیدائش مان لی جائے اور شادی کے وقت شیخ رضی الدین کی عمر بھی سترہ برس کی تسلیم کر لی جائے تو بی بی جمال کا سن شریف بیس سال کے لگ بھگ ہونا چاہئے۔ اس حساب سے بی بی جمال کی پیدائش کا سال ۶۰۲ھ سے قبل مقرر کیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ اپنے بھائی فخر الدین سے دس گیارہ برس چھوٹی تھیں۔ لیکن بقول بعض اگر بی بی جمال دوسری اہلیہ کے بطن سے تھیں تو ان کی پیدائش ۶۱۷ھ کے قریب مانی جائے گی۔ اس صورت میں مستورات میں تعلیم و تلقین کرنے کی روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ بی بی حافظہ جمال کے دو صاحبزادے ہوئے اور عالم شیر خوارگی میں ہی داغ جدائی دے گئے۔ ان دونوں کے مزار بی بی صاحبہ کے مزار کے پاس ہیں اور بی بی جمال صاحبہ کی قبر حضرت والا کے بائیں جنوبی دیوار کے قریب زیارت گاہ خلائق ہے۔ عرس ۱۷ رجب کو ہوتا ہے۔ اور ۱۹ رجب کو لب چشمہ نور (جہاں آپ کا چلہ ہے) سالانہ میلہ ہوتا ہے۔ جو "نال" کے نام سے مشہور ہے۔

خواجہ ضیاء الدین ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ پچاس سال کی عمر میں وصال ہوا۔ مزار شریف لب جھالرہ احاطہ درگاہ میں ہے۔ عرس ۱۳ ذوالحجہ کو ہوا کرتا ہے۔ ان کے دو صاحبزادے خواجہ احمد رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ وحید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے اور خواجہ وحید حضرت بابا صاحب کے مرید بھی ہوئے تھے۔ اور یہ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے باعث فخر بات تھی۔

حضرت والا کی ازدواجی زندگی کے متعلق ایک روایت افادات حمید میں ہے۔ جس سے حالات کے علاوہ ایک زبردست نکتہ کا انکشاف ہوتا ہے۔ سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری تعلیم سے مزین ہو چکے ہونگے اور عمر شریف ۳۲ سال سے زیادہ کی ہو گئی ہو گی۔ گویا یہ روایت ۶۲۱ھ کے قریب کی ہونی چاہئے۔ لکھا ہے کہ ایک روز خواجہ بزرگ نے اپنی مجلس میں صوفی صاحب کو مخاطب کر کے ارشاد کیا: "جب تک میں متاہل نہیں ہوا تھا اور بال بچے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یہ حالت تھی کہ دل میں کسی بات کا خیال آیا اور حضرت حق

سبحانہ نے پوری فرمادی۔ لیکن اب بال بچوں کے قصوں میں پڑنے کے بعد یہ حالت نہیں رہی۔ دعا قبول ہوتی ہے مگر تاخیر کے ساتھ"۔ اس احساس اور اصول فطرت کو سن کر صوفی صاحب نے برجستہ تائید کی کہ مریم علیہا الصلوۃ والسلام کے متعلق قرآن میں ہے کہ جب تک عیسیٰ علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کو من عند اللہ رزق ملا کرتا تھا۔ لیکن جب وہ عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بن گئیں تو نوعیت بدل گئی۔ حکم ہوا۔ هُزِّيٓ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ (مریم: ۲۵) "کھجور کے درخت کو اپنی طرف ہلاؤ" تاکہ رزق حاصل ہو۔ یعنی وہ اسباب کی محتاج بنادی گئیں۔ اس حوالہ وسند کی برجستگی سے صوفی صاحب کے انتقال ذہنی، فراست اور ذوق قرآنی کا پتہ چلتا ہے۔ اگر اس سے انکا امتحان مقصود تھا تو وہ بے لاگ کامیاب ہوگئے۔ حضرت والا کے یہ الفاظ کہ اب بال بچوں کے قصوں میں پڑنے کے بعد حالت بدل گئی صاف بتارہے ہیں کہ بہ نفس نفیس خانگی فرائض وضروریات خود ادا کیا کرتے تھے۔ اور اس سے روحانی اشغال میں جو رخنہ پڑتا تھا وہ ناگوار تھا مگر ناجائز نہیں تھا۔ اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خانگی افکار مدارج کی ترقی کے بھی باعث تھے۔

ہمارے مفروضات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پہلی بی بی صاحبہ کے ارتحال کے بعد دوسری شادی ہوگئی۔ اور دوسری مناکحت کے بعد بی بی حافظہ جمال کی شادی ۶۲۲ھ میں کی ہوگی۔ اگر ۶۱۶ھ میں پہلی بی بی صاحبہ حیات ہوتیں تو اپنی دوسری شادی سے پہلے بی بی جمال کی شادی کی جاتی۔ انہیں مشکلات وافکار کو محسوس کر کے صوفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تذکرہ کیا ہوگا۔ اور حضرت والا کی پریشانیاں دور کرنے کی غرض سے ہوا ہے۔ صاحبزادے رضی الدین کو انہوں نے غلامی کے لئے پیش کیا ہوگا اس طرح دعا کی تاخیر سے قبول ہونے کے بھی معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

باب ۱۳

تعلیم چشتیہ اور خواجہ بزرگ

عشق رابوحنیفہ درس نہ کرد
شافعی را درو روایت نیست

عام طور پر بظاہر علم کے ذریعے ہیں قیاس و تجربہ۔ اگر کسی امر پر فلسفہ و سائنس آپس میں متفق نہ ہوں تو سائنس کے تجربوں کو فلسفہ کے قیاسات پر ترجیح دی جائے گی۔ الہام کے علاوہ مشاہدات سے افضل کوئی علم نہیں ہوسکتا۔ اسلام شہادت و رویئت کو معتبر سمجھتا ہے۔ اس سے شبہات دور ہوتے ہیں اور یقین کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ مسئلہ رویئت ہلال اسی حقیقت کی یاد دہانی ہر مہینہ کیا کرتا ہے۔ اب حصول علم کے بھی طریقے مختلف ہیں۔ کوئی حروف سے آشنا ہونے کے بعد لفظ یا اسم بنانا سیکھتا ہے اور کوئی لفظ یا اسم کو منقش کرنے کے بعد تجزیہ کے ذریعہ حروف سے آشنا ہوتا ہے۔ اگر طریقہ اول حروف مفردہ کی تعلیم کو علم سفینہ کہا جائے تو یہ منشیوں، دانشمندوں اور مولویوں کا طریقہ ہے۔ اور اگر طریق ثانی حروف مرکبہ کی تعلیم کو علم سینہ سے موسوم کیا جائے تو یہ اہل طریقت اور صوفیوں کا طریقہ ہے۔ ان دونوں طریقوں میں مدارج ہیں۔ اہل تصوف کے مدارج، سالک، سالک مجذوب، مجذوب، مجذوب سالک اور سالک میں سے ہوئے ہیں۔ علم سینہ کا تعلق مشاہدات سے ہے۔ یہاں گفت کے کئی معنی ہیں۔ مجاہدات بتوفیق الٰہی قلب کو منور کرتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو دماغ قلب کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔ اور عقل و نفس مطیع بن جاتے ہیں۔

عقائد و اعمال کے علاوہ ایمان ان کیفیات کا نام ہے جن سے مومن کا قلب مزین و رنگین ہوا کرتا ہے۔ علم مشاہدات کے لئے کوئی درسی کورس با قاعدہ مقرر نہیں ہے۔ بلکہ محض

وافتد دوانی، کی طرح ایک سکیم ہے جو محبت پر مبنی ہے۔ روح انسانی میں ایک لطیفہ نورانی ہے۔اس کی کشش خالق کی طرف ہوتی ہے۔بس اسی میلان وکشش کا نام محبت ہے۔اسی میلان وکشش کی وجہ سے اہل وجدان دولت یقین سے لذت پاتے ہیں۔محبت کا مقصد طمانیت قلب اور حصول یقین کے علاوہ اور کچھ نہیں۔قوت ویقین سے اسباب کی پرستاری اور عقل کی کجروی واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ محبت ویقین تعلیم صوفیہ کے دو حدود ہیں۔ ان حدود کے درمیان میں جو منزلیں ہیں ان کو احوال ومقامات کہتے ہیں۔

بے جانہ ہوگا اگر اس مقام پر احوال و مقامات کی قدرے وضاحت کر دی جائے۔ انسان کے جسم میں تین اعضائے رئیسہ ہیں: دماغ، قلب اور جگر۔ جملہ قوائے ادراکیہ کا محل دماغ ہے۔متخیلہ، واہمہ، متصرفہ و مدرکہ قوائے ادراکیہ کہلاتے ہیں۔غصہ، جرأت، بزدلی، سخاوت، کنجوسی، خوشنودی و ناراضگی وغیرہ صفات کا تعلق قلب سے ہوتا ہے۔ اور جگر ایسی چیزوں کی طلب کرتا ہے جن پر انسان کے جسم کی بقایا اس کی نوع بقا کا دارومدار ہو۔ان میں سے ہر عضو رئیس ایک دوسرے کی اعانت کا محتاج ہے۔حواس کی مدد بھی شامل حال ہوتی ہے۔نظریات کا انحصار بدیہات پر ہے اور یہ بدیہات کا وجود محسوسات پر موقوف ہے۔ جو افعال ان اعضائے رئیسہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ وہ یا افراط کی طرف مائل ہوتے ہیں یا تفریط کا پہلو رکھتے ہیں۔یا ان دونوں کے بین بین ہوتے ہیں۔عقل وقلب اور نفس کو ہی لطائف ثلثہ کہتے ہیں۔حکماء کے یہاں عقل کا نام نفس ملکیہ ہے۔قلب کو نفس سبعیہ اور نفس کو نفس بہیمیہ کے نام دیے گئے ہیں۔لطیفہ عقل اس چیز کا نام ہے جن سے حقائق و معارف کا ادراک ہوتا ہے۔اور جن کے ادراک سے حواس خمسہ قاصر رہتے ہیں۔یعنی عقل ان علوم کا مبدأ ہے جن کو انسان حواس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔یقین، شک، توہم، ہر واقعہ کے سبب کی جستجو، حصول منافع اور دفع مضار اسی لطیفہ عقل کے صفات وافعال ہیں۔ جب عقل میں بہیمیت غالب آجاتی ہے تو آدمی بے جا موشگافیاں کر کے ہندی کی چندی نکالنے لگتا ہے۔ اعتقادات حقہ کے متعلق شکوک وشبہات اس کے دل میں پیدا ہو جاتے ہیں۔اور وہ نظامات

فاصلہ کی درہمی و برہمی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب عقل پر کسی قدر خصائل ملکیہ کا تسلط ہوتا ہے تو عقل میں نورانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور آدمی حق کی تصدیق کرنے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے عقل نیک و بد کی ذمہ دار ہے اور آدمی کا دین اس کی عقل ہے۔ قلب کی مثال اس پر کی مانند ہے جو بیابان میں پڑا ہوا ہواؤں سے ادھر ادھر اپنا رخ بدلتا رہتا ہے۔ قلب تمام احوال کا منبع ہے۔ عزیمت ارادہ واختیار اسی سے صادر ہوتے ہیں۔

جب بغض، بزدلی و بہادری، رضا و سخط، وفاداری و تلون، جود وسخا و بخل، حب جاہ اور خوف ورجا اس کے صفات وافعال ہیں۔ جب قلب پر بہیمیت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس پر قبض و بسط بہائم کی طرح ہو جاتا ہے۔ مقصد پورا ہوا تو خوش، نہیں ہوا تو بیزار یا پھر وہم کا شکار۔ جب قلب حالت خواب یا بیداری میں القائے شیطانی کو قبول کرنے لگتا ہے تو ایسے صاحب قلب کو شیطان بصورت انسان کہا جاتا ہے۔ لیکن قلب پر جب ملکیت کے خصائل غالب آ جاتے ہیں تو ایسا قلب انسانی قلب سے موسوم ہوتا ہے۔ پھر ایسے صاحب قلب کا خوف و رجا اور اس کی محبت ونفرت سچے اور پاکیزہ عقائد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس انسان اور اس کے قلب میں حائل ہوتا ہے۔

نفس کا کام خواہش و آرزو ہے۔ پھر اس کے اعضاء شہوانی اس کی تصدیق یا تکذیب کرتے ہیں۔ نفس کا اقتضاء ناگزیر امور سے ہے۔ جن کے بغیر ہیکل انسانی کا قائم رہنا محال و ناممکن ہے۔ بعض لوگ نفس پر پورا تسلط حاصل کر لیتے ہیں اور لذات نفسانی کو ترک کر دیتے ہیں۔ بعض نفس کے بندے بن کر خواہشات کو پورا کرنے میں بدترین ذلتیں گوارا کرتے ہیں۔

اس طرح انسان نفس پرست بن کر بے غیرتی میں نام اچھالتا ہے۔ ورنہ ضبط نفس اور طہارت وتقویٰ میں نام پیدا کرتا ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی عقل، قلب ونفس پر غالب ہوتی ہے اور ان کے ارادے شرع کے تابع ہوتے ہیں۔ ایسوں کا شمار ملائکہ کے زمرے میں کیا جاتا ہے۔ اور ایسوں کو ہی مرد مومن کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ رسم ورواج کے

پابند ہو کر نام و نمود چاہتے ہیں اور خواہشات نفسانی سے دست بردار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اصحاب مروت وارباب ہمم کہلاتے ہیں۔ لیکن ایسا کوئی شخص نہیں پایا جاتا جس کی کوئی بھی دو قوتیں تیسری قوت پر غالب ہوں۔ اور وہ دونوں قوتیں آپس میں برابر ہوں۔

ان لطائف ثلثہ پر حضرات صوفیہ نے دو لطیفوں ''روح اور سر'' کا اضافہ کیا ہے۔ اور وہ ان ہی دونوں پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ ان کی تحقیق ہے کہ قلب کے دو رخ ہیں۔ ایک جسم مادی کی طرف اور دوسرا عالم تجرد ملائکہ وارواح کی جانب۔ اسی طرح عقل کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک عالم اسفل کی سمت اور دوسرا عالم فوقانی کی طرف اور اس کا نام سر ہے۔ روح اور سر کی صفات بھی مختلف ہیں۔ قلب کی صفت ہے اضطراب آفریں شوق اور روح کا وصف انس وانجذاب ہے۔ روح کے قبض میں کبھی بسط کی آمیزش نہیں ہوتی اور اس کی الفت میں قلق وتاسف نہیں ہوتا۔ اس کے احوال عالیہ بمنزل انفاس کے ہوتے ہیں۔ ان کا ظہور بغیر تکلیف کے ہوتا ہے۔ اور ملکیت کے خواص اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ یہ احوال و خواص عارضی و زوال پذیر نہیں ہوتے۔ عقل کے دوسرے رخ ''سر'' کی خصوصیت ان حقائق کا مشاہدہ کرنا ہے جو عالم ظاہری کے ادراک سے بلند ہیں۔ پاکیزگی کی منتہائے کمال حاصل کرنے کے بعد عقل منور ہو کر علوم عالم غیب (از قسم رؤیا وفراست کشف) قبول کرنے کی اہل ہو جاتی ہے۔ جب انسان کی طبیعت فضائل بہیمیہ کی طرف مائل ہو تو اسے نفس امارہ کہتے ہیں۔ جب طبیعت بہیمیت وملکیت میں معلق ہو کر تصفیہ نہ کر سکے تو وہ نفس لوامہ ہے۔ اور جب نفس پابند شرع اور رسول وخدا کا مطیع ہو جائے اور بغاوت نہ کرے تو نفس مطمئنہ بن جاتا ہے۔ ہماری شرع متین صورت نوعیہ رکھتی ہے۔ اس لئے اس نے خصوصیات فردیہ سے قطع نظر کو جائز رکھا ہے۔ دیگر مذاہب میں ان امور کے متعلق ہدایات کی گئی ہیں۔ چنانچہ ویدنت میں خصوصیات فردیہ کی تشریح مل سکتی ہے۔

بہر حال جب آدمی ذکر الٰہی میں رطب اللسان ہوتا ہے تو اس کے قوائے فکریہ مختلف تفکرات میں تگ ودو کرنے لگتے ہیں اور اس کے اعضاء وجوارح آداب شرع سے مستفیض

ہو کر تخلقوا باخلاق اللّٰہ کی جدوجہد کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ جب استعداد کے مطابق ان لطائف ثلثہ پر عبودیت کا رنگ فائق ہو جاتا ہے اور یہ صفات مستقل ہو کر ملکات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو ان کو مقامات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن صفات ملکیہ کے ظہور میں استقرار نہ ہو تو ان کو احوال یا اوقات کہتے ہیں۔ احوال میں دوام و قیام کی صفت نہیں ہوا کرتی یا یوں سمجھنا چاہئے کہ سالک کے واردات و کیفیات جو زائل ہو جائیں وہ احوال ہیں اور جو ٹھہر جائیں وہ مقامات ہیں۔ جملہ مقامات مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعہ طے کیے جاتے ہیں۔ مجاہدات سے مشاہدات حاصل ہوتے ہیں۔ مومن رحمت کا امیدوار بنتا ہے اور عذاب سے ڈرتا ہے(1)۔ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے صبر لازمی ہے(2)۔ خوف و رجا کا ساقط ہو جانا توکل کی علامت ہے اور یہی اصل توحید ہے(3)۔ خوف کرنے والے دل سے ریا مٹا دی جاتی ہے، اخلاص بڑھایا جاتا ہے اور شک کے بجائے یقین پیدا کیا جاتا ہے۔ امید کرنے والے دل سے اختیار فنا کیا جاتا ہے اور تسلی عطا کی جاتی ہے(4)۔ جب خطرات مٹ جاتے ہیں اور مشغلے چھوٹ جاتے ہیں تو آئینہ باطن پر حق جل شانہ اپنا پرتو ڈالتا ہے(5)۔ قلب کی حالت صاف اور اس نورانیت کامل ہو جانے کے بعد قلب روح کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اس میں بغیر انقباض کے انبساط رہنے لگتی ہے اور اضطراب و بے چینی کے بغیر اطمینان و سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح گویا تمام ملکی خصوصیات اس کی عادت و طبیعت بن جاتی ہیں۔ پھر جب قلب کی نورانیت و جلا میں اور زیادہ ترقی ہو جاتی ہے۔ تو حالت نفس کو ''سر'' کہتے ہیں۔ اس حالت میں وہ مختلف طریقوں سے خواب، فراست، کشف اور غیبی آواز وغیرہ کے ذریعہ ان علوم کا ادراک کرتا ہے۔ جس کا فیضان عالم غیب سے ہوتا ہے۔ لیکن جب قلب کا میلان ان موجودات کی طرف ہو جاتا ہے۔ جو زمان و مکان سے مستغنی ہیں۔ تو حالت نفس کو خفی کہا جاتا ہے۔ بہر حال مقامات کی

1۔ سورۃ بنی اسرائیل 2 سورۃ رعد 3۔ سورۃ یونس
4۔ سورۃ رعد 5۔ سورۃ ابراہیم

سرگزشت کے اثرات وکیفیات سالک کے مزاج، طبیعت اور ضمیر کے مطابق ہوا کرتی ہیں۔لہٰذا یہ احوال محض کسی تگ ودو اور جدوجہد کا نتیجہ نہیں کہے جا سکتے اور نہ ان پر کسی قسم کا کسی کو اختیار ہوتا ہے۔ان کا تعلق محض فضل الٰہی پر ہوتا ہے۔حضرات سراج قشیری اور غزالی جیسے مقتدر کاملین نے اپنی اپنی تصانیف میں مقامات اور احوال کی تفصیلیں لکھی ہیں۔توبہ و تقویٰ، فقر و فاقہ، صبر و توکل و رضا، شکر، ہیبت، انس، تفرید، اخلاص، توحید، محاسبہ یعنی حیا، ارادہ(1)، آثار محبت، زہد و ورع یہ سب منجملہ مقامات ہیں۔طلب و آرزو، فکر و ذکر، تصور و مراقبہ، امید و بیم، غلبہ و سکر، توبہ و حیا، غیبت، نفس، غیرت، خوف و رجا، قبض و بسط ۔ یہ سب احوال کے تحت میں شمار کیے جاتے ہیں۔

محبت میں خلوص اس وقت ہوتا ہے۔جب نفس پاک اور مہذب بن جاتا ہے۔یہ پاکی اور تہذیب ان اعمال کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو لطیفہ نورانی کی خواہش کے اتباع میں ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے حجابات دور ہو جاتے ہیں۔ اس عمل طہارت و تہذیب کو صوفیوں کے یہاں نفس کشی سے تعبیر کیا گیا ہے۔حجابات دور کرنے والی نفس کشی محض فنائے مجاز ہوتی ہے نہ کہ حقیقی و قطعی۔ درحقیقت قرب الٰہی حاصل کرنے کا نام فنا ہے نہ کہ ظلمت و ادبار کی وجہ سے دنیا کو ترک کر دینا۔شرعی اصطلاح میں صوفیوں کے ان احکامات محبت کو اوامر اور اس مخالفت نفس کو نواہی سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔خلوص کی معراج یہ ہے کہ عقبیٰ بھی محو ہو جائے۔یہی شیوۂ تسلیم و رضا ہے۔محبت میں شوق و آرزو خضر راہ بنا کرتے ہیں۔ اس راہ میں خوف و ہراس کا گزر نہیں ہوتا۔شادی و غم میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔اس کیفیت میں دعا کی بھی ضرورت نہیں رہتی اور احوال سے بے نیازی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔راہ محبت میں مشاہدات کے متعلق بھی کوئی قاعدہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنے ضمیر و مزاج کے مطابق محظوظ ہوا کرتا ہے۔مشاہدات مختلف وانفرادی ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کے عرفان کے مدارج بھی مختلف ہیں۔چونکہ عرفان ذاتی تجربہ پر مبنی ہوتا ہے اس لئے نہ مثال بن سکتا ہے

1۔ارادہ کا نتیجہ محبت ہے اور حقیقت محبت یہ ہے کہ یقین کی لذت عقل پر غالب آ جائے اور قلب نفس کو زیر کرے۔

اور نہ اس کی تقلید کی جا سکتی ہے۔ اندریں حالات عقل مستعار کام کی نہیں ہوتی۔ ذاتی تجربہ سے انسان اپنی حقیقت تک پہنچا کرتا ہے اور اپنے آپ کو پہچان لینا اپنے رب کی پہچان ہے۔ قدرت کی بے نیازی کا تماشا ہی عین مقصد ہے۔

صوفیوں کی فنا، بدھ کی نروان اور افلاطون کی نیستی میں اگرچہ بظاہر مماثلت پائی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ان سب میں فرق ہے اور بڑا اختلاف ہے۔ فنا اور بقا اگرچہ متضاد کیفیات کے نام ہیں۔ لیکن فنا درحقیقت وہی ہے جو احساس پیدا کر کے بقا سے آشنا کر دے اور کمال تک پہنچا دے۔ نروان اور نیستی برملا جمود کی مبلغ ہیں اور ان کے یہاں غفلت و بے حسی کو بقا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر محبت کی خاصیت تراش و خراش ہے۔ لہٰذا صوفیوں کی فنا حرکت و جنبش رکھتی ہے۔ بندۂ تسلیم اگرچہ ذاتی طور پر نہ قادر ہوتا ہے اور نہ طالب اختیار مگر تراش و خراش کی وجہ سے اس میں مختاری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی تخلقوا باخلاق اللہ سے آراستہ پیراستہ ہو کر مختار حقیقی کا پردہ بن جاتا ہے۔ عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔ اگرچہ مشرکانہ اصول ہے مگر یہ صحیح ہے کہ وہم و خیال ہی صحیح طور پر مستقل ہو کر وجود اختیار کر لینے کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اسی وہمی و خیالی وجود کو تخلقوا باخلاق اللہ کی جدوجہد اخلاق الٰہی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس طرح گویا اصل کی خوبو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ حصول صفات عارضی و فانی ہوتا ہے نہ کہ مستقل۔ اور اس حصول میں ترقی کی کوئی حد نہیں ہے۔ لہٰذا کسی حد پر کیفیت کو مقید کرنا امکان سے باہر اور بندگی کی کوتاہی ہے۔ انسان کی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یکسوئی کے حصول کے بعد اس کی پوشیدہ و خوابیدہ قوتیں فعالیت کا رنگ اختیار کر لیں۔ فنائیت کی ابتدا مراقبہ کے استغراق سے شروع ہوتی ہے۔ وجد کی کیفیت میں ہی وحدت الوجود کا عالم نظر آنے لگتا ہے (1)۔ چشتیوں کی وحدانیت و فنائیت میں سماع سے ترقی و تسکین ہوتی ہے۔ حضرت شاہ

1۔ محبی پروفیسر محمد حبیب صاحب نے "تاریخ چشت" کے تعارف میں وحدت الوجود کی عالمگیر حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے علماء یورپ و چین کی تعلیم سے استدلال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وحدت الوجود ایسے (بقیہ آگے)

ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ صحیح و صالح زندگی عبادت ہے۔ ایمان و عمل سے ارادہ عقل اور وجدان کے ہم وزن ہو جانے پر ایمان باللہ حاصل ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد عمل کے ذریعے آفاق و انفس کی علمی تحقیق اور علمی تسخیر میں کچھ اختلاف ہو تو وہ نہ معیوب ہے اور نہ لائق طنز بلکہ یہ اختلاف رحمت ہے اور جلوۂ قدرت کی بے نہایتی اور لامحدودیت کی دلیل ہے۔

(بقیہ گزشتہ) شعور اعلیٰ کا تصور پیش کرتا ہے جس کے دو مظاہر ہیں۔ یعنی انسان اور خارجی دنیا۔ انسان کی اخلاقی زندگی اس شعور اعلیٰ سے ماخوذ ہے۔ لیکن اخلاقی زندگی بغیر انقلابی جذبہ کے بے معنی ہے۔ قرون وسطیٰ کے صوفیہ اگرچہ کامیابی حاصل نہ کر سکے مگر ان کی نو عدد خصوصیات گنا کر اس نتیجہ پر پروفیسر صاحب پہنچے کہ صوفیہ کی تعلیم میں انقلابی جذبہ کا وجود موجود ہے۔ لہٰذا اصول وحدت الوجود کے ذریعہ ناکارہ ضوابط کو فنا کر کے عوام کی مادی و ثقافتی بہبود کے لئے بے لوث خدمت کرنے کے لئے ایک نئے معاشرے کی تشکیل کی جائے''۔

مسرت ہے کہ سائنس اور فلسفہ کے ذریعے وحدت الوجود کی اہمیت محسوس کی گئی۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ارشاد ہوا علمی وحدت الوجود کے متعلق ہے۔ صوفیوں کی وحدت الوجود حقیقت میں کشفی کیفیت ہے۔ لوگوں نے خواہ مخواہ اسے علمی مسئلہ بنالیا ہے۔ بہرحال اس کے ذریعہ سے نئے معاشرے کی تشکیل کرنا ہی ضروری ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر نئے معاشرے کی بنیاد مغربی افکار پر ہے جو زمان و مکان پر منحصر ہیں۔ اگر اس پر وحدت الوجود کا رنگ چڑھایا جائے گا تو اس کی شکل مختلف اقسام کے ازم ism یا مجلس متحدہ اقوام کی طرح ہوگی۔

دماغ ہر چند رسائی کرے مگر قلبی نورانیت کے بغیر وحدت الوجود کے اصول سے کبھی بھی مستفیض نہیں ہوا جا سکتا۔ خود مسلمانوں نے جب اس نورانیت کو کھو دیا تو وحدت الوجود سے وہ بھی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ جب یہ نہیں تو امن کی تمنا بھی پا در ہوا بات ہے۔ کمیونزم باوجود دشمن مذہب ہونے کے جس وحدت الوجود کا قائل ہے۔ وہ صحیح تعلیم کے اثرات کا مٹا ہوا سا خاکہ ہے۔ وحدت الوجود کی اشاعت روس میں آغا بلقا خان شاہ قپچاق نے اپنے عہد میں کی تھی۔ بلقا چنگیز خاں کا پوتا تھا۔ جس نے مغلوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ اور جس نے ہلاکو کے علی الرغم مصر سے دوستی کی تھی۔ مغلیہ حکومت جب روس میں فنا کر دی گئی تو بھی اس کے اسلامی اثرات اتنے باقی رہے کہ پیٹر اعظم روس میں مذہب عیسوی کی اشاعت میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ وحدت الوجود کی عالمگیر حیثیت کو کتنا ہی محسوس کیا جائے مگر یہ کارگر نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ مختلف اقوام کی بنیاد فکر خود غرضی و نفسیات سے پاک و صاف نہ کر دی جائے۔ مختلف اقوام اپنے اپنے طور پر وحدت الوجود کی قائل ہیں۔ مگر اس عالم کو یا اس عارضی دنیا کو مایا اور باطل سمجھتے ہیں۔ لہٰذا بنے کیونکر کہ ہے ہر کام الٹا۔ مختصر یہ کہ ایسی وحدت الوجود ہر لحاظ سے بیکار ہے جو زمان و مکان کی محتاج ہو۔

اسلام کے بڑے شعائر چار بتائے گئے ہیں۔ جملہ صوفیہ وعلماء ان چاروں شعائر کا ادب کرتے ہیں۔ (۱) قرآن۔ (۲) کعبہ۔ (۳) نبی کریم ﷺ اور (۴) نماز۔ قرآن ظاہری و باطنی دونوں طرح علم وعمل کی ترغیب دے کر ایمان کی تقویت کا باعث ہے۔ بقیہ شعائر قرآنی احکامات کی وضاحت کرتے ہیں۔ دینی و دنیوی اعمال کے، مہمات ومعاملات کا بطور عنوان اور باب کے قرآن پاک میں ذکر ہے۔ ان سب کی تفصیلات رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حیات طیبہ اور اسوۂ حسنہ میں پائی جاتی ہیں۔ عالم محسوس کے پیچھے جو غیب کے عوالم ہیں ان کا علم صرف اتباع رسول ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ رسول کو وحی اور علم نبوت دونوں حاصل تھے۔ قرآن پاک میں صفات، آیات، احکام وقصص، کفار سے احتجاج اور جنت و نار کے ساتھ موعظت کا ذکر ہے۔ صفات سے نعمائے الٰہی کا مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ آیات احکام سے ایماء ومنشا اخذ کیا جاتا ہے اور مسائل استنباط کئے جاتے ہیں۔ قصص سے عذاب وثواب کے معنی روشن ہوتے ہیں۔ اور موعظت کے ذریعے رقت قلب اور خوف ورجا کا حس بیدار کیا جاتا ہے۔ قرآن کے معنی سمجھنا سمجھنے والے کی استعداد پر منحصر ہے۔ لیکن عمل کا انحصار محض نیت پر ہوا کرتا ہے۔ دل کا ارادہ عمل کی روح ہے۔ لہٰذا عمل کو اس ارادہ کی صورت وشبیہ کہا جا سکتا ہے۔ تہذیب نفس کے لئے نیت کی درستی ضروری ہے۔ اور اس کے حصول کا بہترین ذریعہ اسلام ہے۔ شریعت اعمال ظاہری سے نیت کی درستی کا انتظام کرتی ہے۔ اور طریقت باطنی احساسات کو صحیح کر کے نیت کو درست بناتی ہے۔ حرام و حلال دو حدود ہیں۔ جن میں چون وچرا کو دخل نہیں۔ لیکن متشابہات کے متعلق رائے قائم کرنا ہر کہ ومہ کا کام نہیں بلکہ یہ خواص کا حصہ ہے۔

جب قرآن کے معنوں پر غور کیا گیا تو اشراقیین نے اپنے نقطہ نظر سے باطنی معنی لئے۔ صوفیہ نے قرآن کا مفہوم سمجھ کر حدیث احسان (1) کو اپنا لائحہ عمل بنایا اور فقہاء نے ظاہری

1۔ حدیث احسان یہ ہے کہ عبادت کے وقت یا یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے یا یہ سمجھو کہ اللہ جل شانہ کو تم دیکھ رہے ہو۔ اور یہ اس لئے ہے کہ عبادت میں اللہ کی بزرگی وبرتری اور غنا کا تصور اور اپنی عاجزی واحتیاج کا احساس ہو سکے۔

معنوں سے استدلال کیا۔فقہاء نے اشراقیوں سے اختلاف کیالیکن صوفیوں سے قرآن و حدیث کے معنی سمجھے ہیں۔ امام احمد حنبل رضی اللہ عنہ تعلیم صوفیہ پر معترض تھے مگر حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔اور حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ وابوحمزہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ علماء باطن کو علماء ظاہر پر فوقیت حاصل ہے۔حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے علم ہم سے سیکھا۔لیکن جب اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ علم دیا جو ہمیں حاصل نہیں۔ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ،حضرت امام مالک رضی اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔عالم ومحدث تھے۔انہوں نے ہی سب سے پہلے تعلیم صوفیہ کو مدون کیا اور تبلیغ فرمائی۔ابن تیمیہ اور ابن قیم اگرچہ سخت قسم کے ہیں اور انہوں نے تصوف سے انکار بھی کیا ہے مگر وحدت الوجود کے متعلق حضرت امام غزالی کے مؤید ہیں اور وحدت الوجود کی کمال کے ساتھ تائید وتصدیق کرتے ہیں۔

تعلیم صوفیہ نہ علم ہے نہ رسم بلکہ سیدھی سی اخلاقی بات ہے۔کہنے میں کچھ نہیں مگر عمل میں سب کچھ یہ تعلیم بجائے عقل ومجاہدے کے فراست و وجدان سے سمجھی جاتی ہے اور وجدان بغیر عشق ومحبت کے حاصل نہیں ہوا کرتا۔بہ ظاہر عقل وعشق کو ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا ہے۔لیکن عقل ہی ترقی کرکے عشق بن جاتی ہے جو فراست وایمان کا سبب ہے۔ اب اگر عقل ترقی معکوس کرکے تنزل کی طرف مائل ہو تو اس کو گمراہی شیطنت اور کفر سے موسوم کیا جائے گا۔اللہ جل شانہ نے عقل ہی کو سب سے پہلے پیدا کیا ہے اور اسی کے ذریعہ اپنی مختلف وبے شمار شانوں کا اظہار کیا ہے۔قدیم واولین بزرگوں یعنی حضرت ابراہیم ادہم، سفیان ثوری، داؤد طائی، ابوالہاشم، رابعہ بصری، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، بشر بن حارث، احمد بن خزرادیہ، محاسبی، ذوالنون مصری اور سری سقطی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت عطار اور حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہما نے لکھا ہے کہ یہ صاحبان محبت الٰہی میں فنا ہو کر یا اپنے اپنے انفرادی تجربوں پر عمل کرکے عاقبت سے بے

نیاز تھے۔ اور اطمینان کی دولت سے مالا مال تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، انس بن مالک
حذیفہ، ابوذر غفاری، مغیرہ بن شعبہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضوان اللہ عنہم اجمعین میں
ہمہ اوست کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بایزید بسطامی، جنید بغدادی، شبلی، منصور بن حلاج،
عراقی اور اوحد الدین کرمانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین میں اس وجدانی کیفیت کا اظہار پہلے
والوں سے زیادہ نمایاں تھا۔ منجملہ دیگر اسباب میں یہ زیادتی احوال کی شدت وفراوانی کی
وجہ سے تھی۔ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فنا کو اپنا لائحہ عمل بنایا۔ شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ
نے توکل پر زیادہ زور دیا۔ مصری رحمۃ اللہ علیہ اور ابن کرام رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں معرفت
اصل اصول ٹھہری۔ بہر حال مختلف معیار رکھنے کے باوجود یہ جملہ صوفی رہبانیت کے مبلغین
کی طرح نفس کو قتل کرنے کی تعلیم نہیں دیتے۔ بلکہ صرف مہذب بنانے کی تاکید کرتے
ہیں۔ رہبانیت کا اصل مقصد تو یہی تھا کہ خدا کی رضامندی تلاش کی جائے۔ مگر یہ لوگ اپنی
اپج اور جدت کی وجہ سے اصل مقصد سے دور ہوگئے۔ فنا سے مدعا نیستی نہیں ہے۔ بلکہ
احساس پیدا کر کے بقا میں کمال حاصل کرنا ہے۔ مخالفت نفس کا صحیح مقصد بھی یہی ہے کہ
موافقت حق حاصل کی جائے اور نفس امارہ کو نفس مطمئنہ بنایا جائے۔ حضور رحمۃ للعالمین
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر تدبر کیا جائے تو صاف واضح ہوگا کہ وہ یاس ربا اور آس آفرین ہے اور اس
میں اس قسم کی مخالفت نفس کو جائز رکھا گیا ہے۔ مکہ کے جہالت آمیز اصولوں کی اصلاح کی
خاطر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکلیفوں اور ذلتوں کو جس طرح برداشت کیا وہ مخالفت نفس کی ہی
مثال ہے۔ مدنی زندگی کو جب عزت وفراغت حاصل ہوئی تو جہاد کا حکم دیا گیا۔ یہ بھی
مخالفت نفس کی ایک صورت تھی۔ خلافت راشدہ کے اختتام پر اختلاف رائے کی وجہ سے
فتنوں کی کثرت نے جب معنی آفرینیوں اور نکتہ چینیوں سے کام لینا شروع کیا تو مخالفت
نفس قتل وغارت کی صورت میں مسلط کردی گئی۔ خلفاء مابعد میں جب دولت کے اثرات
اور منطق وفلسفہ کی گمراہیوں کو ثواب سمجھ لیا گیا تو مخالفت نفس کا مفہوم فتنۂ چنگیزی نے پورا
کیا۔ پھر اسی دور ابتلاء میں مخالفت نفس گوشہ نشینی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ بہر حال مختلف

زمانوں اور مختلف حالات کے تحت جو کچھ بھی مسلمانوں کی اصلاح کے لئے ہوا۔ اس کو مخالفت نفس ہی سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ شکلیں بدلتی رہیں مگر جہاد کا مقصد اور مخالفت نفس کا اصول خود اپنے اختیار سے یا جبر سے نئی نئی طرح جاری و باقی رہا ہے۔ اب اگر کوئی دریافت کرے کہ موجودہ دور میں اصلاح یا مخالفت کی صورت کیا ہونا چاہئے تو غالباً یہ جواب غلط نہ ہوگا کہ موجودہ لیڈری کے عہد میں خود اپنے اختیار سے قرب سلطانی سے پرہیز کرنا اور بغیر جاہ طلبی و تفرقے کے خلوص کے ساتھ اجتماعی زندگی کی تحصیل مخالفت نفس کی ایک صورت ہے۔ ورنہ جبری طور پر۔

خدا شرے برانگیزد کہ خیر مادراں باشد

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاندان چشتیہ کے متعلق نہایت جامع و مانع اشارہ کیا کہ نفس کی مخالفت چشتیوں میں عبادت کی جان ہے۔ اور عام رسم و راہ کی پابندیوں میں پھنسے رہنا ان کے یہاں کفر ہے۔ چشتی نفس کو صنم اکبر سمجھتے ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ لوگ عام روش پر قدم بہ قدم چلنے کی بجائے جھومتے ہوئے جستیں لگا لگا کر منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہر جست میں کئی کئی سیڑھیاں پھلانگ جانا ان کے لئے معمولی بات ہے۔ جوش محبت ان جستوں کا سبب ہوا کرتا ہے۔ محبت اور مخالفت نفس چشتی تعلیم کے دو جزو اعظم ہیں۔ محبت وصل چاہتی ہے۔ مخالفت نفس اس کی دشمن ہے۔ مگر شوق ان کو بغیر ایں وآں کے بے تکان اڑائے لئے چلا جاتا ہے۔ نہ حد ان کی پیچھے نہ حد سامنے گویا سفر ان کا آغاز وانجام ہے(1)۔ محبت اور مخالفت نفس کے دو متحارب و متضاد اجزاء سے دستور العمل بنانا چشتیوں کی بالا امتیاز خصوصیت ہے۔ ذوق و شوق کی جستجو میں مقام سے گر جانے کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ مگر مرشد کی توجہ نگرانی و ذمہ داری قید زمان و مکان سے مستغنی ہوتی ہے۔ چشتی جذب محبت ہی سے مخالفت نفس کا کام لیتے ہیں۔ اور محبت ہی کے

1۔ کاش ڈاکٹر اقبال، چشتی مشرب کو مجاہدات، مشاہدات کے ذریعہ سمجھتے تو ان کی تعلیم وخودی و بے خودی، تبصرہ نگاروں کا مشغلہ نہ بنتی بلکہ موثر ہوتی۔

ذریعہ نفس کو مہذب بنالیتے ہیں۔ان کے یہاں تخریب وتعمیر محبت ہی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔اور سو(۱۰۰) کی ایک بات یہ ہے کہ سوز محبت ہی تصفیہ وتزکیہ کا کام کیا کرتا ہے۔

مراقبے وظیفے، چلہ کشی، ریاضت ومجاہدہ اور ذکر وفکر یہ سب تزکیہ نفس ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔لیکن چشتی ان سب کا کام سوز محبت سے لیتے ہیں۔ہر تڑپ اور ہر کسک تصفیہ کا کام کرتی ہے۔قلب اس لئے صاف کیا جاتا ہے کہ انوار الٰہی قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔تزکیہ کسی قسم کا ہی کیوں نہ ہو۔اندرونی قوتوں کو بیدار کیا کرتا ہے۔اور اس بیداری کی پختگی واستواری یقین کی منزل میں پہنچادیتی ہے۔محبت کا فرض یہ بھی ہے کہ دستور فطرت اور مرضی الٰہی کا راستہ دکھائے۔اندرونی قوتوں کو بیداری کے بعد ہزاروں خطروں کے مقام سامنے آتے ہیں۔ان سب سے بچ جانا مردانگی کا کام ہے اور کامیابی کی صورت ہے۔یہاں کا الجھا ہوا بڑی مشکل سے سلجھا کرتا ہے۔تصور شیخ اسی مقام پر دستگیری کرتا ہے۔اور یہ یکسوئی خیال وسوسوں سے بچنے کے لئے مجرب ہے۔اسی منزل میں جمال ہمنشیں دامن کردکی تصدیق ہوا کرتی ہے۔اور یہی جمال ہمنشیں وجود مطلق کے دربار میں رسائی کرادیتا ہے۔

محبت ہمہ اوست، کی کیفیات میں مبتلا کر کے حقیقت حیرت وتسلیم کا راستہ دکھاتی ہے۔ تزکیہ اور اس کے نتائج کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں۔لیکن آسان ہیں۔مگر دستور فطرت اور مرضی الٰہی کو پالینا بہت ہی کٹھن ہے۔یہی وہ منزل ہے جہاں خطرات سے رسہ کشی ہوتی ہے۔یہاں آدمی راستہ پر بھی پڑ جاتا ہے اور بھٹک بھی جاتا ہے۔تنگ نظری اور نفسیاتی و شیطانی وساوس اس منزل میں پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا کرتے ہیں۔چشتی اس منزل کو محبت کی مدد سے طے کرتے ہیں۔

عاشق روِیش نمی بیند کے نسبت مویش نمی خواہد خلاص

یہاں عقل مستحسن اپنے کرشمے دکھاتی ہے اور عقل مذموم روپوش ہو کر سرنگوں ہو جاتی ہے۔ظن وتخمین رہزن ٹھہرتے ہیں۔اسباب کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔علتیں فضول ٹھہرتی ہیں۔اور اس کیفیت وحالت میں ہوس چھپ چھپ کر سینہ میں پناہ لیتی ہے۔اس قسم کی چہ

کنم میں اپنی مرضی کھو کر جو مرضی الٰہی کو عالم غیب سے پالے وہی کامیاب و سرخرو ہے۔ اور یہی کامیابی صوفیوں کی جملہ تعلیمات کا ماحصل ہے۔ دین کا حقیقی مقصد بھی یہی ہے کہ خدا کی مرضی کو خدا کی خالص مرضی کی شکل میں حاصل کیا جائے۔ لیکن بعض لوگ احساس وعلم کی چند چھپی ہوئی طاقتوں کے ابھارنے ہی کو دین و مذہب سمجھ کر گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہی عقل ظاہر کی کارستانی ہے۔

چشتی مخالفت نفس کو خواہ وہ کسی شکل میں ہو اصل اصول سمجھتے ہیں۔ لیکن علت غائی اور مقصد آخر نہیں مانتے۔ مخالفت نفس ان کے یہاں حصول مقصد کا واحد ذریعہ ہے۔ اور بس، اہل فلسفہ اور نئے محققین سمجھتے ہیں کہ چشتیوں کی نفی ویدانت اور فلسفہ یونانی سے ماخوذ ہے۔ بلخ میں اسلام سے پہلے بدھ مذہب نروان کی اشاعت کر چکا تھا۔ اور سلطان الطائفہ حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ یہ شبہہ اور دلیل کتنی ہی معقول ہو لیکن صحیح نہیں۔ بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔ ویدانتی نفی کے نتائج آج بھی نمایاں ہیں۔ یہ لوگ مخالفت نفس کے سلسلہ میں حوائج ضروری سے بھی دستبردار ہو جاتے ہیں۔ اور فطرت کی مخالفت کرنے کو ہنر سمجھتے ہیں۔ افلاطونی نفی بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ ویدانیتوں کے دام مارگی، اگھور پنتھی اور مانتک ودیا کے عامل اپنی لغویات کے خود گواہ ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مجاہدات سے جب کسی قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے تو اس کا ضبط کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ظاہر کرنے یا ضبط کرنے پر جمود نمودار ہو جاتا ہے۔ ضبط سے سابقہ پڑتے ہی وہ کھو جاتے ہیں۔ اور اظہار کی حالت میں وہ اپنی نمائش کو قابل فخر پیشہ بنا لیتے ہیں۔ جب اس طرح جمود سے ترقی مسدود ہو جاتی ہے تو آخر کار وہ قوت ہی جاتی رہتی ہے۔ صوفیوں میں اظہار کرامت کی اسی وجہ سے ممانعت ہے۔ اظہار کی خفیف الحرکاتی کی وجہ سے فکر پرواز کی کمزوری فلسفہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور زائل شدہ کیفیت کے متعلق کٹ حجتیاں کی جانے لگتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ فلسفہ کی بناء کچھ اسی قسم کی درماندگی ہو۔

''اُپ نے شد'' اور ''پوران'' ویدس مقدس کے اجراء اور تفسیریں ہیں۔ مگر یہ اپنی اصل

سے مختلف ہوگئی ہیں۔ کیونکہ ذاتی قیاس اس میں شامل ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ دونوں جادوگری اور فلسفہ کے گودام بن گئی ہیں۔ ''پورانوں'' میں وسعت خیال کے مطابق ایسی ایسی بے تکی کہانیاں بیان کی گئی ہیں کہ عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور کرامت انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان کے معتقدین کی عجائب وغرائب پرستی ان بے سر و پا داستانوں کو روحانیت سے تعبیر کرتی ہیں۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ روحانیت اور فلسفہ میں ازلی دشمنی ہے۔ دونوں کا اجتماع ممکن ہی نہیں اس کے علاوہ فلسفہ والوں کی عملی زندگی اور تعلیم میں یگانگت اور ہم آہنگی نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے فلسفی اور یہ لوگ سکون قلب اور اطمینان سے محروم ہوتے ہیں۔ یقین کی ان کو ہوا بھی نہیں لگتی۔ ان کی زندگیاں تذبذب اور شکوک سے بھری ہوئی ہیں۔ جن کی وجہ سے تاویل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مثل ہوتی ہے۔ ہندوستان کی زبردستی انفعال اور نت نئی پالیسیوں کا راز اسی حقیقت میں بند ہے۔ بازی گر شعبدہ پر شعبدہ دکھاتا ہے تاکہ خفت کا راز نہ کھلنے پائے۔

اہل فلسفہ اور نئی تعلیم کے ماہرین اپنی قابلیت کی فراوانی یا اپنی غیر محسوس ناواقفیت کی بناء پر کچھ ہی رائے قائم کریں۔ مگر مخالفت نفس کے متعلق چشتی علانیہ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ (نازعات) سے حکم ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم کی بنیاد اسی حکم پر ہے اور وہ اسی نقطہ نگاہ سے گردوپیش پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ لہٰذا ان کے مشاہدات وتصورات اور تخیلات اور انکے اظہار کے طریقے ہرچند کسی سے مشابہ معلوم ہوں قطعی مختلف المعنی ہوتے ہیں۔ مثلاً عام طور پر ملک الموت کا تصور بھیانک اور ڈراؤنا سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اس کا نام سنتے ہی کانپنے لگتے ہیں۔ مگر چشتی اس کو زینہ پل اور حرف مشدد سمجھتے ہیں۔ وہی دوست کو دوست تک پہنچاتا ہے۔ اور جب یہ ہے تو یہ ہستی ان کو عزیز ہوگئی اور وہ ہمیشہ اس کی تلاش و فکر میں رہتے ہیں اور اس کی آرزو کیا کرتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے جب قرآن پر تدبر کیا گیا تو نئے نئے معنی روشن ہوئے یعنی رات تسکین کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور ذکر الٰہی باعث تسکین ہے۔ لہٰذا بجائے نیند کے ان کے یہاں مصرف شب ذکر الٰہی ہوگیا۔ راہ تسلیم میں

آرزو گناہ ہے۔ لہٰذا اسم و رسم کو بھی شرک میں داخل کر دیا گیا۔ بہر حال چشتی محبت کی آگ میں جلتے ہیں اور اسی آتش محبت سے زندگی حاصل کرتے ہیں ان کی محبت کو دستوار العمل قرآن سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن جملہ الہامی کتابوں کا ناسخ ہے اور ہر قسم کی تحریفوں و ترمیموں سے محفوظ ہے۔ لہٰذا قرآن سے بہتر ذریعہ توحید پر جمع کرنے کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قلب سلیم کو اس سے بہتر مرضی الٰہی کا معیار کہیں نہیں مل سکتا۔ قرآن پاک سے مرضی الٰہی سمجھنے کے لئے قدرے علم کی یقینی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سمجھ اس وقت تک نہیں آتی۔ جب تک کہ قرآن پاک خود معلم نہ بنے۔ اس کے جلال و جمال کا اثر قاری پر منضبط نہ ہو۔ اور آیتیں خود متوجہ کر کے اپنے مطالب کو منکشف نہ کریں۔ قرآن پاک کو معلم بنانے کے لئے اور اس کے مطالب پر غور و فکر کرنے کے لئے خلوت و سماع کی ضرورت ہے۔ دوسروں سے سن کر غور و خوض کرنے میں زیادہ مدد ملتی ہے(1)۔ انہیں رموز حقیقت کی وجہ سے حضرات چشتیہ نے تلاوت قرآن، سماع قرآن اور حفظ قرآن کو اپنے یہاں لازمی قرار دیا ہے۔ وہ طوطے کی طرح رٹنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں تا کہ قرآن کا ایک ایک حرف روح میں پیوست ہو جائے اور روح کلام الٰہی کی روحانیت میں رنگ جائے۔ قرآن کے الفاظ معانی پر دلالت کرتے ہیں اور معانی کو علم الٰہی میں کلام نفسی کی صورت میں اللہ کی صفات ذاتیہ میں سے ایک صفت بننے کا فخر ہے۔ لہٰذا وہ الفاظ صفات الٰہیہ میں سے کسی ایک صفت کو قاری و تالی کی قوت مدرکہ کے قریب کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ صفت قاری و تالی کی صفت بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تلاوت کرنے والے کو ذکر کرنے کا بھی ثواب ملتا ہے۔ قرآن کی تشریح و تفسیر حدیث رسول اور اسوۂ حسنہ میں موجود ہے۔ چنانچہ محبت جب قرآن سے لے کر رہنمائی کرتی ہے تو سرعت برق کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچا دیتی ہے۔ چشتیہ کے تدبر فی القرآن اور اصول محبت کی آمیزش سے جو ذوق وجود میں آتا ہے وہ امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس نرالے اور انوکھے پن کی وجہ سے چشتی قران کو سینہ سے لگاتے ہیں اور ہر وقت حرز جان

1۔ اسی مفہوم کی ایک واضح حدیث رسول بھی ہے۔

بنائے رہتے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اپنی اس خاندانی تعلیم کا کمال کے ساتھ اتباع کیا ہے بلکہ اپنی فراست سے اس میں مفید اضافے بھی کئے ہیں۔ ایسے اضافے جو ان کے مرشد کی تعلیم کی بہترین طریقوں سے مکمل و مؤثر وضاحت کر سکیں اور جس سے ہندوستان کا ذرہ ذرہ چمک اٹھے۔ یہی فراست ان کی برتری و فوقیت کا باعث ہے اور ان کے بزرگوں کے لئے قابل ناز ہے۔ حضرت والا کا لقب عطاء رسول ہے۔ حقیقت محمدی کے مظہر کامل ہونے کی وجہ سے اسلام کے وہ مکمل نمونے ہیں۔ شریعت، اسوۂ حسنہ اور اخلاق اصفیاء ان کی نظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوئے۔ تعلیم چشتیہ اسلام کا عطر تھی۔ حضرت والا نے عطر کا عطر نکال کر اس کو دو آتشہ بنا دیا۔ باطن کی اصلاح مقصود تھی وہ باطن سے کی۔ ظاہر اگرچہ تابع مہمل ہے اس کو بھی سدھارنے کی راہیں نکالیں۔

مخالفت نفس عام طور پر اصلاح کی منفی صورت ہے۔ حضرت والا نے مثبت شکل بھی ایجاد کی۔ نفس کی موافقت کر کے تمام آسانیاں بہم پہنچادیں تاکہ بہتات کی وجہ سے وہ اپنی خواہشات و انعامات سے متنفر و بیزار ہو جائے۔ تکمیل خواہشات کے اس اصول میں گمراہی سے حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لی (1)۔ یعنی مرید کے ایسی پھانس چبھادی کہ جس کی کھٹک سے نہ لطف اندوز ہو اور نہ گمراہ۔ اسی کشمکش میں مبتلا کر کے گاہے ہنسا دیا اسے گاہے رلا دیا۔ ان کے یہاں مرید اس طرح کسا جاتا ہے کہ زندگی نہ سوتے کٹتی ہے نہ روتے کٹتی ہے۔ یہی ناگفتنی کیفیت پختہ ہو کر یقین کی منزل میں پہنچا دیتی ہے اور اصلیت و حقیقت بے پردہ سامنے آجاتی ہے۔ اس طرح جس طرح حبس کے بعد گرمی کی شدت ابر کرم کو کھینچ لاتی ہے۔

1۔ اس طرز کا اتباع حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر و بیشتر کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرید نے کہا کہ تمام احکام کی تعمیل کروں گا مگر شراب ترک نہیں کر سکتا۔ ارشاد ہوا کہ اچھا۔ مگر ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ ہماری موجودگی میں نہ پینا۔ اس قرارداد کے بعد جب شغل مے کے لئے جام سبو حاضر کئے تو دیکھا کہ برزخ سے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تبسم فرما رہے ہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ شغل نہ کر سکے اور متعدد کوششوں کی ناکامیوں کے بعد توبہ کر لی۔

دیگر سلاسل کے مقابلہ میں چشتیوں کے یہاں اوراد و عملیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اب اگر اذکار کے علاوہ جو وظائف حضرت والا سے منسوب ہیں تو ان کی صحت مشکوک ہے۔ اور لوگوں سے دوسروں کی دیکھا دیکھی شامل کر لئے ہیں۔ ان کی توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ لوگوں کی تسکین کے لئے نقشبندیوں اور قادریوں سے مستعار لے کر اجازت دے دی ہو گی۔ اور اگر تحقیق کی جائے تو مراقبہ کے آسن وغیرہ ان سلاسل نے جوگیوں سے مستعار لئے ہیں۔ کیونکہ ہر فائدہ مند شے مومن کا مال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت والا کے یہاں عملیات و وظائف کا کام دل کی گرمی اور روح کی بیتابی سے لیا جاتا ہے۔ اور ان فرائض کی ادائیگی آہ سوزاں کے سپرد کر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم چشتیہ عام طور پر تشریح سے بے نیاز سمجھی جاتی ہے۔ ان کے یہاں کوئی درسی کتاب نہیں ہے بلکہ مشغلہ محبت ہی اصل شے ہے۔ حضرت والا کی یہ بھی نمایاں خصوصیت ہے کہ مرید کو سند دینے کے بعد دوسرے خاندانوں کے بزرگوں کی خدمت میں بھیج دیتے ہیں تاکہ بزرگ سمجھیں کہ مرید کس طرح کاڑھا گیا ہے۔ اور مرید موازنہ کر سکے کہ اس کی تعلیم کیسی ہوئی۔ یہ دستور باہمی ربط وضوابط کے علاوہ روحانیت کی پاکیزگی و وسیع النظری کی بھی دلیل ہے۔ اس طرح مختلف سلاسل میں یگانگت بڑھتی ہے اور علم سفینہ رکھنے والوں کی طرح کٹ حجتی اور اختلاف کی آگ نہیں بھڑکتی۔

حضرت والا کے دربار سے وہ بھی مستفیض ہوئے جو ظاہر کو طے کر کے باطن کو اور باطن سے کچھ حاصل کر کے ظاہر کو سنبھالا۔ وہ بھی مستحق کرامت ٹھہرے جو درستی باطن کے بعد ظاہر سے بے نیاز رہے۔ اور وہ بھی سرخرو ہوئے جنہوں نے ظاہر کی خوبیاں حاصل کر کے باطن پر توجہ نہیں کی۔ وہ بھی سرفراز ہوئے جو ظاہر و باطن سے ناواقف تھے مگر اخلاق کریمانہ کا اتباع کرتے تھے اور ان کو بھی مدارج ملے جو کسی نہ کسی طرح مخالفت بھی رکھتے تھے۔ متقی و پارسا کو حصہ ملنا تو عام بات تھی۔ لیکن یہاں خاطی و عاصی بھی ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ یہاں آدمیت و انسانیت کو سبق پڑھائے جاتے تھے اور راہ مستقیم پر قائم کیا جاتا تھا۔ حضرت والا نے کبھی کسی سے بیگانگی نہیں برتی۔ حسن اخلاق سے مسخر کر کے اپنے اصول ذہن نشین کر

دینا ان کا دستور تھا۔ مستفیض ہونے والوں میں صرف اپنا ہی سلسلہ نہیں ہے بلکہ بلا امتیاز ہر سلسلے اور ہر فرقے پر ایک ہی سی رحمت و شفقت رکھی۔ عقیدت مند اور غیر عقیدت مند دونوں نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اطمینان حاصل کیا۔

بھارت کی ذات پات دنیا بھر کی فرقہ بندیوں اور تقسیموں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں کے معتقدات بھی مختلف ہیں۔ یہاں کا علم بجائے عملی بنانے کے غیر عملی اور چرب زبان بنا دیتا ہے۔ بڑے سے بڑے عالم و فاضل "چھتری" جاہل سے جاہل برہمن کے سامنے ہیچ ہے۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہندو مذہب کے کسی رکن یا تمام اصولوں کی خلاف ورزی بھی ہندو کو غیر ہندو نہیں گردانتی۔ وہ خارج از مذہب کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتا۔ حضرت والا نے یہاں کے مزاج سے واقف ہو کر یہاں کے اصولوں کی عجیب شان سے اصلاح کی۔ صراط مستقیم دکھلائی اور عمل کی جانب مائل کیا۔ ہندو قوم اپنے خواص کے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ان کی غلامی کو توڑ کر ان کی عقیدت مندی کو بروئے کار لائے۔ حس کو بیدار کر کے عملی حیات، مساوات اور سکون قلب سے ان سب کو آشنا کیا۔ اونچ نیچ کو ختم کر کے اخوت کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ بغض، منافقت اور شک و حسد کا تخم سوخت کر دیا۔ ان کی موروثی پھوٹ کی ہر ادا کو خلوص و محبت میں تبدیل کر دیا۔ ہر فرد و بشر کے رجحان و مزاج کے مطابق اس کی اصلاح کی اور راہ عمل پر گامزن کیا۔ اور ان کی داستان سرائی کو ختم کر دیا۔ فرض کفایہ کے اصول پر تدابیر نافعہ کے ذریعہ انتظام معاش اور انتظامی حالت کو درست کیا۔ ذات پات کا قصہ ختم ہوتے ہی برہمنیت مغلوب ہو کر رہ گئی۔ فروعی اور بیکار توہمات سے توبہ کی گئی۔ دل بہلاؤ کے کرتبوں کو ترک کیا گیا۔ تذبذب سے نجات حاصل کر کے سب بے سمجھ یقین کے راستے پر چل کھڑے ہوئے۔ دل کی کلی کھل گئی۔ خودی باشعور ہو گئی۔ بعد تربیت قلوب اس قابل ہو گئے کہ محبت سے خود تڑپیں اور دوسروں کو تسکین دیں۔ ان کی جدو جہد، خود غرضی، تنگ نظری اور لغویات سے پاک و خالص ہو گئی۔ یہ انقلاب ہنستے کھیلتے باتوں باتوں میں کیا گیا۔ شادی ڈیو اور جے پال جوگی کو راہ راست پر لا

کر روحانیت کو شعبدہ بازی سے علیحدہ کر کے دکھا دیا۔ قلوب میں ایسی چٹکی لی کہ درد بھرپور ہو مگر اف منہ سے نہ نکلنے پائے۔ سب نے سمجھ لیا کہ نتائج منجانب اللہ ہوتے ہیں۔ نیت کی درستی عمل کو بارآور کرتی ہے۔ مخالفت نفس کا مفہوم سمجھ لیا گیا کہ در محفل یکرنگی جز یار نمی گنجد۔ یار کا کلام اور یار کا دیدار مقصد حیات ہے۔ حضرت والا نے تخریب میں تعمیر کی شکل دکھا دی۔ عین بیزاریوں میں طمانیت پیدا کر کے یقین کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

اذعان و یقین کا سرچشمہ قرآن ہے۔ لہٰذا قرآن پر عمل کرنے کے لئے قرآن کا یاد رکھنا اور حفظ کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اعمال میں ظاہری و باطنی دونوں طرح اتباع سنت پر زور دیا۔ صوفیہ شریعت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد طریقت میں قدم رکھتے ہیں۔ چشتیوں میں کامل کی تعریف یہ ہے کہ "عالم سکر و صحو میں قدم شریعت سے باہر نہ ہو" یہی بات نقشبندیوں نے یوں ظاہر کی ہے کہ "حال تابع شریعت ہے اور شریعت تابع احوال نہیں ہے"۔ چنانچہ اسی لحاظ سے اور اسی معیار سے حضرت والا کے چمن کے دونوں تختوں اور حسنوں کو جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کسی حال میں بھی شریعت کو برائے بیت بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور یہ افواہ کہ چشتی شریعت سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ قطعی بے حقیقت اور مہمل ہے۔ شمالی ہند کے تختۂ دہلی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ متعین کئے گئے تھے اور جنوبی ہند کا تختہ میوار حضرت سلطان التارکین حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد تھا۔ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذوق اس واقعہ سے ثابت ہے کہ آخر عمر میں مکمل طور پر قرآن حفظ کیا تھا۔ اور جب تک حفظ نہیں کر لیا قرآن پاک سے حوالہ نہیں دیا۔ ان کے خلیفہ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح اپنے ذوق قرآنی اور پیروی رسول کو چمکایا وہ مخفی نہیں ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کو خلافت عطا کرتے وقت قرآن حفظ کرنے کی وصیت فرمائی۔ انہی ارشاد گرامی کے ساتھ کہ برو د ملک ہند بگیر"۔ حضرت محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حافظ و مطیع سنت خلفاء اطراف ہند میں بھیج کر وصیت کی تعمیل کر دکھائی اور قرآن کی تبلیغ کر کے واقعی ملک ہند کو فتح کر لیا۔

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ صاحب کلیری جذب (1) تھے۔ مگر قرآن کا ادب ان کو اس قدر ملحوظ تھا کہ حالت جذب میں جب وہ اس طرح کھڑے ہو گئے کہ بیٹھنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو حضرت بابا صاحب نے اپنے رفیق و مرید حضرت شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کو بٹھا لینے پر متعین کیا۔ کیونکہ وہی ان کے ہمراہ کلیر بھیجے گئے تھے۔ وہ خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے ان کے قریب پہنچے اور جلال قرآنی کے سامنے جلال صابری سر بسجود ہو گیا یا جمال قرآنی جلال صابری پر غالب آ گیا تو وہ کھڑے سے بیٹھ گئے۔ جذب دور ہو گیا اور جو خطرہ پیدا ہوا تھا وہ جاتا رہا۔ حالت جذب دور ہونے پر حضرت شمس الدین پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی خلافت عطا فرمائی اور یہ قاعدے میں تھی۔ حضرت چراغ دہلوی کے مذاق و معیار کا گواہ ان کا قول ہے کہ ''دلیل از

1۔ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تفصیل نہیں ملتی۔ اس لئے کہ انکی ساری عمر جذب میں ہی گزری۔ ظاہر بین حضرات اسی وجہ سے انکے وجود اور ان کی ولایت کے متعلق مشکوک نظر آتے ہیں۔ لیکن انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے تھے۔ اور اپنے یہاں تربیت دے کر ان کو سند خلافت دے دی۔ ان کی تیزی و مجذوبیت کو دیکھ کر حضرت قطب جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف سند پر مہر لگانے سے انکار کر دیا بلکہ سند کو چاک کر دیا۔ یہ ماجرا سن کر حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ''پارہ کردہ جمال راہ۔ فرید نتواں دوخت یہ ان کی شان بزرگانہ تھی جو الیا کہا۔ ورنہ فی الواقعی یہ مفہوم نہ تھا۔ اس واقعہ کا اصلی سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ مجذوب کو خلافت کی سند نہیں دی جایا کرتی اور مہر نہ لگا کر جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ امتحان میں پورے اترے۔ اور وہ اگر تصدیق کر دیتے تو ناکام ٹھہرتے۔ ورنہ ان کی مجال نہ تھی کہ مرشد کی عطا کردہ سند کو چاک کرنے کی گستاخی کے مرتکب ہوتے۔ لیکن بہر حال ''نتواں دوخت کے اپنی شفقت و کمالیت سے ان کو خلافت کی سند مرحمت فرما کر حضرت صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کو بذریعہ شمس الدین پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اجرا کیا اور خلافت نامہ کو سی کر دکھایا۔ ان معاندین کو اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔ میں بذات خود نتواں دوخت والے فقرے کو محض یار لوگوں کی شاعری سمجھتا ہوں۔ اور یہ قول حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شان کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا ارشاد گرامی اس مشکوک قول کی تردید کر رہا ہے کہ علم سینہ من بہ شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی رحمۃ اللہ علیہ رسید و علم دل من بہ شیخ علاء الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ فائز گردید۔ سیر الاقطاب پر ایک جگہ یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ'' صابر زندگانی خوش خواہی گذرانید'' اور ظاہر ہے کہ اس نام کا کوئی دوسرا مرید بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نہیں تھا۔

کتاب وحدیث باید''۔ ان کے خلیفہ حضرت سید محمد حسینی نے بھی اقبال کیا ہے کہ ''فتح کار من بیش از تلاوت قرآن سماع بود''۔ تلاوت قرآن اور سماع کو حرف عطف سے موڑ کر فقرے کو بلیغ بنا دیا ہے۔ سماع سے مطلب سماع قرآن اور غناء دونوں لئے جاسکتے ہیں۔ اب رہا دوسرا میواڑی حصہ تو اس میں بھی یہی خصوصیت نمایاں ہے۔ حضرت صوفی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کے مذاق قرآنی کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ ان کے عرفانی سلوک میں تفسیر مدارک کی تلاوت شامل تھی۔ خواجہ حسن ناگوری رحمۃ اللہ علیہ نے ''نورالنبی'' نامی تفسیر تیس ۳۰ جلدوں میں لکھی تھی۔ اور حضرت شیخ احمد مجد رحمۃ اللہ علیہ بعد عصر تفسیر مدارک میان اہل مجلس بیان فرمودی۔ ان کے اس ذوق وشوق کے اثرات کی تشریح یہ ہے کہ شادی آباد مانڈو کے فرمانروا حضرت ناگوری سے اعتقاد رکھتے تھے۔ وہاں کا سلطان غیاث الدین خلجی خواجہ حسین ناگوری سے مستفیض تھا۔ اس کے متعلق فرشتہ نے لکھا ہے: ''ہزار کنیزک حافظ قرآن درحرم داشت'' ان مثالوں سے ثابت ہے کہ چشتی قرآن کو سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ دین وایمان ان کا قرآن تھا۔ قرآن کی اشاعت کرتے تھے اور قرآن کے خلاف کچھ نہیں کرتے تھے۔ اندریں حالات چشتیوں پر خلاف شرع ہونے کا الزام نگاہ احوال کا کرشمہ ہے یا چند غیر متعلق بدنام کنندہ نکونامے چند کا وطیرہ۔

اب اگر کوئی ترجیح کی نیت سے یا مصلحتاً بھی کہے کہ حضرت والا کی تعلیم نعوذ باللہ اسلامی تعلیم سے کچھ فرق وجدائی رکھتی ہے تو ایسا وہم چشتی تعلیم کی فوقیت نہیں بلکہ ذلت وکفر ہے۔ اسلام علانیہ کفر وشرک کا دشمن ہے۔ چشتی تعلیم اسلام کی تعلیم کے اتباع کو فخر سمجھتی ہے اسلام قاطع کفر وشرک ہے۔ لیکن ساتھ ہی کافر ومشرک کا سچا ہمدرد بھی ہے۔ چشتی بھی دیگر سلاسل کی طرح کافر ومشرک سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اس ہمدردی کا مقصد گرتے ہوؤں کو سنبھالنا اور کافر ومشرک کو راہ راست پر لانا ہوتا ہے۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے نہایت بلند آہنگی سے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ خود اس کا نمونہ پیش کیا ہے۔ چونکہ حضرت والا کے سپرد ہندوستان کی اصلاح تھی اور ان کا سابقہ قوم لایعلمون سے تھا۔ اس لئے انہوں نے قرآنی

تعلیم کو حسن وخوبی کے ساتھ دل نشین کر کے یہاں والوں کو عالم وکامل بنادیا۔ ہندوستان کی نادانیوں پر جی جلایا۔ جانفشانی کے ساتھ ہمدردی کی۔ اخلاق ومحبت سے قلوب کو مسخر کیا۔ اور کفر وشرک کی بیخ کنی کی۔ حضرت والا کی مسلمہ مقبولیت ومرجعیت ان کے اس کمال کی گواہ ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اس وصف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ کافر ومشرک کے بدن سے کفر وشرک کا لباس اتار دینا اصل مقصد تھا اور ہے۔ دوسرے مذاہب اپنے منکروں سے نفرت کرنے کے عادی ہیں اور اپنے مخالفین کو ہر طرح سے فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تبلیغ محض مصلحت، حیلے، جبر اور کلچر پر مبنی ہے۔ حضرت والا نے اسلامی اصول کے مطابق کسی شخص کی بھی مخالفت کبھی جائز نہیں رکھی اور ہر شخص کو برائیوں اور گمراہیوں سے شفقت کے ساتھ بچانے کی کوشش کی۔ انہوں نے تبرّیٰ کفر کا کیا اور کافر ومشرک کے ساتھ تولاّ سے کام لیا۔ کفر وشرک از قسم مہلک بیماری ہے۔ مریض کو بچانے کے لئے مرض کا دفیعہ کیا جاتا ہے۔ کوئی تہذیب وعقل اس بات کی روادار نہیں ہو سکتی کہ مرض سے نجات پانے کے لئے مریض کو ختم کر دیا جائے۔ مریض اگر علاج سے بے پرواہی کرتا ہے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ خود موت کے منہ میں جانا چاہتا ہے۔ مگر حکیم وطبیب ہمیشہ مرض کو کھو کر مریض کو اچھا کرنا چاہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح نفس امارہ بھی محبت کے ذریعہ نفس مطمئنہ بنا لیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی کج فہم یہ کہے کہ طبیب نے مرض سے ساز کر کے مسیحائی دکھائی تو یہ کس قدر مضحکہ خیز، جہالت آمیز تدبیر معکوس ہے۔

بہرحال ہندوستان کے ماحول میں قرآنی تعلیم کو اخلاق محمدی کے ساتھ دلکش انداز میں پیش کرنا حضرت والا کی فراست اجتہاد کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ حضرت والا سے پہلے ہندوستان میں متعدد منتخب روزگار اولیاء کرام تشریف لائے اور انہوں نے قابل داد کمال کے ساتھ اسی اصول پر تبلیغ اسلام فرمائی۔ لیکن حضرت سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کسی خاص حصہ ملک کو نہیں بلکہ کل ہندوستان اور اس کے مضافات کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ نور اسلام کو آب وتاب کے ساتھ پھیلایا۔ اور اپنے صلاح وتقویٰ کے ذریعہ اخلاص عمل کی تبلیغ

فرمائی۔اس طرح نہ صرف اپنے خاندان وسلسلہ کا نام روشن کیا بلکہ بعد میں آنے والے تمام خاندانوں اور سلاسل کے لئے میدان تیار کردیا۔ اور آسانیاں بہم پہنچادیں۔اس حقیقت سے ان کی نورانیت کی وسعت و بلندی کا پتہ چلتا ہے۔اور یہی نہیں بلکہ حضرت والا نے اپنے فیض صحبت سے اپنے ذوق قرآنی کا یہاں والوں کواس درجہ حامل بنادیا کہ

آنجا کہ بود نعرہَ فریاد مشرکان
اکنوں خروش نعرہَ اللہ اکبر است

باب ۱۴

اجمیر سے دہلی کے سفر

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

کہا جاتا ہے کہ حضرت غریب نواز قدس سرہٗ العزیز نے پہلی مرتبہ اجمیر سے دہلی کا سفر یوں کیا تھا کہ ان کی خراسان سے واپسی کی غلط افواہ پر خواجہ قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بغداد سے روانہ ہوئے۔ ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ٹھہرے اور جب دہلی پہنچے تو خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ دہلی سے اجمیر جا چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے مرشد کی خدمت میں اجمیر حاضر ہونے کی درخواست بھیجی۔ جس کا جواب ملا کہ "ولایت دہلی تمہیں دی جا چکی ہے۔ قرب روحانی تمہیں حاصل ہے۔ بعد مکانی کی پروانہ کرو۔ آئندہ ہم خود ہی دہلی آئیں گے۔ بس یہی وعدہ دہلی کے سفر اول کی وجہ ہے۔

اس روایت کا ہر ہر ٹکڑا تشریح و ثبوت کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ اس روایت کے کسی حصہ پر بھی تذکرہ نویسوں کا اتفاق نہیں ہے۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ باوجود تذکرہ نویسوں کے مختلف رنگ میں بیان کرنے کے تاریخی طور پر یہ روایت از سر تا پا قطعی غلط ہے۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ حضرت والا اجمیر سے خراسان گئے بھی تھے یا نہیں۔ اور اگر گئے تھے تو کب اور کیوں۔ ان دونوں باتوں کا کوئی معقول جواب کسی جگہ نہیں ملتا۔ تاریخ فرشتہ میں صرف واپسی کا ذکر ہے اور اسی بنیاد پر سفر خراسان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ وجہ سفر کسی نے بھی کچھ نہیں بتائی ہے۔ اس سفر خراسان کو اس لئے بھی معتبر نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ واپسی خراسان بھی خود مشکوک ہے۔ واپسی خراسان کا تعین مغلوں کے محاصرہ ملتان سے کچھ دن قبل کیا گیا ہے۔ محاصرہ ملتان سے قبل خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ

جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ بغداد سے آکر حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مقیم ہوئے تھے۔ اور محاصرہ کے وقت مغلوں کے حملہ سے نجات پانے کے لئے والئ ملتان قباچہ کو قطب صاحب نے تیر مرحمت کیا تھا۔ مغلوں کے محاصرہ کی یہ تاریخ نہ صرف حضرت والا کی واپسی خراسان کا تعین کرتی ہے بلکہ واقعات ماسبق و مابعد کی تاریخوں کا بھی سنگ بنیاد ہے۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۵۷۷ پر ملتان کے محاصرہ کا ذکر ہے۔ مگر تاریخ درج نہیں ہے۔ منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے مغلوں کے اس محاصرہ کی تاریخ ۶۱۱ھ بتائی ہے۔ اگر یہ تاریخ عبارت میں نہ لکھی ہوتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ ہند سے لکھنے میں کاتب سے غلطی ہوئی ہے۔ لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ مغلوں نے سب سے پہلے بسر کردگی چنگیز خاں ہندوستان کے شہر لاہور پر موسم گرما ۶۲۱ھ/ ۱۲۲۵ء میں حملہ کیا تھا۔ اور قرا قرم واپس چلا گیا تھا۔ ۶۱۱ھ/ ۱۲۱۵ء میں یا اس سے پہلے مغلوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی اور نہ وہ کسی نوعیت سے کوئی شہرت رکھتے تھے۔ چنگیز نے ۶۲۱ھ میں بھی دریائے انڈس پار نہیں کیا چہ جائیکہ ملتان کا محاصرہ کیا ہو۔ تاریخ یہ بھی نہیں بتاتی کہ مغلوں نے نہ سہی کسی اور نے ملتان کا محاصرہ ۶۱۱ھ میں کیا تھا۔ ملا بدایونی کی اس غلطی کی اصلاح شاید ایک بدایونی ہی کے مقدر میں تھی۔ بہر حال محقق یہ ہے کہ لاہور سے چنگیز خاں کے چلے جانے کے بعد پہلی مرتبہ ملتان پر حملہ چنگیز خاں کے لڑکے تولی خاں نے ۶۲۱ھ میں کیا تھا اور اس کی شہادت طبقات ناصری اور دیگر مستند تواریخ سے مل سکتی ہے۔ یہی تولی خاں ہلاکو خاں کا باپ تھا۔

۶۱۱ھ/ ۱۲۱۵ء میں نوخیز اور ہونہار چنگیز خاں قسمت آزمائی کے طور پر سلطنت چین سے ٹکر لے رہا تھا۔ اسی زمانہ میں خلیفہ ناصر نے خوارزم شاہ سے اپنی دشمنی نکالنے کے لئے چنگیز خاں کو خوارزم پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ مگر وہ چین میں مصروف ہونے کی وجہ سے اپنے ہمسایہ اور محافظ خوارزم سے لڑ کر دردسر نہیں خریدنا چاہتا تھا۔ لہٰذا خلیفہ ناصر کی یہ دعوت مسترد کر دی گئی۔ فتح چین کے بعد مغلوں اور چنگیز خاں سے دنیا آشنا ہوئی۔ یورپ اور ایشیا میں اس کی ہیبت چھا گئی۔ ۶۱۳ھ میں چنگیز خاں نے خوارزم سے تجارتی معاہدہ کر

کے دوستی کی بنیاد ڈالی۔ مگر شاہ محمد خوارزمی نے کیا دی سے نہ صرف بدعہدی کی بلکہ معاملہ کو روبراہ کرنے کی بجائے مغلوں کے سفیروں کی بدترین توہین کی۔ اس بدتمیزی پر چنگیز خاں نے ۶۱۶ھ/ ۱۲۲۰ء میں حملہ کیا اور بخارا فتح کرنے کے بعد جلال الدین منکبرتی کا تعاقب کرتے ہوئے خود چنگیز ہندوستان آیا اور لاہور میں خون کی ندیاں بہا کر ۶۲۱ھ میں واپس چلا گیا۔ سلطان جلال الدین نے حیرت انگیز طور پر بچ کر چنگیز خاں کے خلاف سلطان شمس الدین التمش سے مدد چاہی۔ لیکن انکاری جواب پا کر وہ ملتان پر چڑھ دوڑا۔ لیکن تولی خاں کے تعاقب کی خبر سن کر وہ ملتان سے مکران کی طرف چلا گیا اور تولی خاں نے ملتان کا چالیس روز محاصرہ کیا۔ ملتان میں جلال الدین کے فتنہ کے وقت خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ جلال الدین تبریزی کے قیام کی کوئی شہادت نہیں پائی جاتی۔ البتہ چند روز بعد محاصرہ تولی خاں کے وقت دونوں صاحبان کی موجودگی حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بتائی جاتی ہے۔ اور تولی خاں کے خلاف مدافعت کے لئے قباچہ کو حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تیر عطا کرنے کی روایت بیان کی گئی ہے۔ جس کے بعد یہ دونوں حضرات ملتان سے چلے آئے تھے۔ مگر ان دونوں حضرات کی معیت و قیام کا ثبوت ۶۲۱ھ کے متعلق ہے نہ کہ اس سے پہلے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ یہ حضرات ۶۲۱ھ بغداد سے نہیں آئے تھے۔ اور اگر اس وقت کوئی بغداد سے آنے پر ضد کرے تو تاریخی دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہے۔

بالفرض محال مغلوں کے حملہ لاہور کو ۶۱۱ھ میں محض استدلال کے لئے مان بھی لیا جائے تو مغل بجلی کی طرح ملتان آ کر نہیں گرے تھے۔ بلکہ منزل بہ منزل بلخ، مرو، نیشاپور، غزنی، ہرات اور لاہور میں قیامت ڈھاتے ہوئے آئے تھے۔ گویا لاہور آنے سے پہلے خراسان کو تاخت و تاراج کر چکے تھے۔ اندریں حالات حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کا سفر خراسان ۶۱۱ھ سے پہلے اور واپسی خراسان سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ لیکن تحقیق و تدفین کی غرض سے ۶۱۱ھ میں خراسان و افغانستان کے حالات بھی دیکھنے کی ضرورت

ہے۔خراسان کو ۶۰۷ / ۱۲۱۱ء میں شاہ محمد خوارزمی نے فتح کیا تھا۔اور ٹھیک ۶۱۱ ھ میں اس نے کابل وغزنی فتح کر کے غور وہرات کے بادشاہوں کو نکال دیا تھا۔اسی زمانہ میں یلدوز یہیں سے شکست کھا کر لاہور آیا تھا۔اور ۶۱۲ ھ میں سرحدی علاقہ کے متعلق اس نے التمش سے جنگ کی تھی۔یہ حالات خراسان میں بھی حضرت والا کے سفر اور واپسی خراسان کی علانیہ تردید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۶۱۳ھ/ ۱۲۱۷ء میں اپنی انتہائی حماقت سے ارذل ترین الزام لگا کر شاہ محمد خوارزمی نے حضرت مجد الدین رحمۃ اللہ علیہ کو غرق دریا کر دیا تھا اور اپنی دنیا و عاقبت کی خرابی پر مہر لگالی تھی۔اسی واسطے تازیانہ الٰہی یعنی چنگیز خاں سے اسے منہ کی کھانی پڑی تھی۔حضرت مجد الدین رحمۃ اللہ علیہ،حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔اور فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے پیر تھے۔اگرچہ عطار رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ سے بھی خلافت حاصل تھی۔اس کے علاوہ آخری دلیل یہ ہے کہ ۶۱۱ ھ میں حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ ملتان میں کبھی ہرگز نہیں آئے تھے۔پھر یہ حضرات ان کے مہمان کیسے ہوئے۔

حضرت والا کے اس سفر خراسان کو ۶۱۰ھ/ ۱۲۱۴ء میں صحیح ثابت کرنے کے ثبوت میں صاحب معین العارفین نے جس زوردار منطق سے کام لیا ہے۔وہ بذات خود ایک لطیفہ ہے۔اور تاریخ دانی پر حرف آخر ہے۔انہوں نے حضرت سید حسن خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کو شہید کرنے کی کوشش فرمائی اور حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی شرکت سے ان کے جنازے کو محروم کر دکھایا ہے۔اس بناء پر حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ ۶۱۰ ھ میں اجمیر سے باہر خراسان گئے ہوئے تھے۔اور حضرت خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ شہادت ان کی تحقیق کے مطابق ۶۱۰ ھ/ ۱۲۱۴ء ہے۔ارشاد فرماتے ہیں کہ قطب الدین ایبک کے مرنے کی افواہ پر اجمیر کے راجپوتوں نے ۶۱۰ ھ میں بغاوت کی اور خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ کو شہید کر دیا۔حضرت سید حسن خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت، افادات حمید اور دیگر تذکروں کے لحاظ سے ۵۹۶ ھ میں ہوئی۔اور بعض کے یہاں ۵۹۸ ھ درج ہے۔اب اگر

معین العارفین نے ان کی تاریخ شہادت ۶۱۰ھ میں لکھی ہے تو یہ بغیر جادو کے زور کے نہیں ہوسکتی۔ تمام تاریخیں متفق ہیں کہ قطب الدین ایبک کی وفات ۶۰۷ھ میں ہوئی تھی۔ مگر صاحب معین العارفین ثابت کرتے ہیں قطب الدین ایبک کی وفات نہیں بلکہ وفات کی افواہ ۶۱۰ھ میں پھیلی تھی۔ بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ است تاریخ وسال برطرف مگر یہ امر خود محتاج ثبوت ہے کہ قطب الدین ایبک کے مرنے کی افواہ پر بغاوت اجمیر میں ہوئی اور سید حسن خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت واقع ہوئی۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ شہاب الدین غوری کو اندخود پر ترکوں نے مقید کرلیا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ سلطان شہاب الدین مارا گیا۔ اسی افواہ پر ۶۰۱ھ/ ۱۲۰۵ء میں کھوکھروں نے ملتان پر قبضہ کرلیا اور لاہور پر تاخت کی۔ پھر اسی سال کے آخر میں جہلم وچناب کے درمیان نائب سلطنت اور گورنر بدایوں التمش کی مدد سے سلطان شہاب الدین نے خود کھوکھروں کا قلع قمع کیا۔ اب قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سلطان محمد غوری کے مرنے کی افواہ پر پنجاب میں کھوکھروں ہی نے نہیں بلکہ اجمیر میں راجپوتوں نے بھی بغاوت کی اور اسی بغاوت میں حضرت خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ شہید ہوئے۔ لہٰذا ان کی تاریخ شہادت ۶۰۱ھ کے آخر میں ہونا چاہئے۔ اس طرح ۵۹۶ھ اور ۵۹۸ھ کو سال شہادت کہنا زیادہ غلط نہیں لیکن ۶۱۰ھ تو صریحاً غلط ہے اگر ۶۰۱ھ ہی ان کا سال شہادت ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت خنگ سوار رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کو حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی شرکت کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ غرض یہ بین ہے کہ ۶۱۰ھ میں حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے سفر خراسان کا معین العارفینی استدلال مہمل ہے۔

بہر حال مغلوں کے حملہ ومحاصرہ کی صحیح وغلط دونوں تاریخوں کے لحاظ سے ۶۲۱ھ/ ۱۲۲۵ء یا ۶۱۱ھ/ ۱۲۱۵ء میں حضرت والا کے سفر خراسان یا وہاں سے واپسی کا امکان ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ سب داستان اور رویٔت خراسان کے سفر کی بے ثبوت ہے۔ اور صاحب معین العارفین کی جدت کے مطابق حضرت والا کا چوتھی مرتبہ اجمیر میں تشریف لانا

بھی مفروضہ دوم وسوم ورود اجمیر کی طرح قطعی بے سروپا ہے۔

اب جب کہ سفر خراسان کا وجود نہیں پایا جاتا اور خراسان سے واپسی بے سروپا ٹھہرتی ہے تو اس بے معنی افواہ پر خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بغداد سے ہندوستان کے لیے چل کھڑا ہونا بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ علاوہ بریں یہ سوال بجائے خود قابل غور ہے کہ اس زمانے میں خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بغداد میں تھے بھی یا نہیں۔ حضرت والا کا جواب جو درخواست حاضری پر دیا گیا تھا۔ یہ نہیں بتا تا کہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہیں باہر سے آئے تھے۔ بلکہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں سکونت پذیر تھے۔ ولایت دہلی ان کو پہلے ہی مرحمت ہوچکی تھی اور وہ اپنا کام کررہے تھے۔

یہ جز بھی تحقیق طلب ہے کہ حضرت خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ بغداد سے کبھی آئے تھے یا نہیں۔ جن تذکرہ نویسوں نے حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے دوبارہ ہندوستان آنے کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً سیر العارفین، سیر الاقطاب اور فوائد الفواد حصہ سوم، حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوسعید تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ حضرت شہاب الدین سہروردی کے طالب تھے۔ اور حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مستفیض ہوئے تھے۔ اب واقعہ یہ ہے کہ حضرت شیخ الشیوخ سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت عطا کر کے ان کو وطن مالوف ملتان جانے کا حکم دیا۔ اس موقع پر مذکور ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کے ساتھ جانے کی شیخ الشیوخ سے اجازت مانگی۔ اس سفر اور معیت کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ بغداد سے روانہ ہوکر یہ دونوں بزرگ جب نیشاپور پہنچے تو دونوں میں اختلاف ہوگیا۔ جس کے بعد حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ وہیں رہ گئے اور حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ تنہا ملتان تشریف لے آئے۔ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ نیشاپور میں حضرت فریدالدین

عطار (1) سے ملاقات کے بعد شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ ان کے اس قدر معترف و مداح ہوئے کہ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مرشد کی توہین کا شبہہ ہو گیا (2)۔ اسی فرضی افتراق کے بعد حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ خدا جانے کہاں کہاں سرگرداں رہے۔ مصر پہنچے اور عرصہ دراز کے بعد شیخ الشیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اب ہندوستان کا رخ کیا ہوگا۔ ہندوستان میں حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی ملاقات حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے التمش کے طلبیدہ محضر میں بمقام دہلی ہوئی ہے۔ جس میں باوجود اختلاف رکھنے کے حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ اور حضرت نجم الدین صغریٰ شیخ الاسلام کو خفت ہوئی تھی۔ بہر حال حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ جب کبھی بھی ہندوستان آئے ہوں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ آتے وقت ملتان میں حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں نہیں ٹھہرے تھے۔ ورنہ التمش کے محضر کے وقت ان سے اختلاف کی بات قابل ذکر نہ ہوتی۔ حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت بہت مشہور ہے اور خاص وقعت رکھتی ہے۔ یعنی جب وہ ملتان پہنچے تو ''قاضی بچہ دیوانہ'' سے ملے اور ان کو ایک انار مرحمت فرمایا۔ یہ اشارہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی زندگی کے متعلق ہے۔ وہ انار انہوں نے احباب میں تقسیم کر دیا۔ مگر ایک دانہ جو زمین پر گر پڑا تھا اس کے کھاتے ہی ان کا قلب بدل گیا۔ اور کتاب نافع پڑھنے کے زمانے میں جب خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان پر توجہ فرمائی تو انہوں نے اس انار کے دانہ کی نورانیت کے متعلق حضرت خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تذکرہ کیا تھا۔ جواب میں ارشاد یہ ہوا کہ کل انار میں وہی ایک دانہ نورانیت سے معمور تھا (3)۔ غرض اس روایت سے ظاہر ہے کہ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ قطب

1۔ حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ ۵۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ان کا وصال ۶۲۲ھ سے ۶۲۶ھ تک کسی سال میں ہوا۔ گویا ان کی عمر سو سال سے زیادہ ہوئی۔ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے وقت ان کی عمر ۹۸ سال کی ہوگی۔

2۔ سیر العارفین، فوائد الفواد، تاریخ فرشتہ، بزم صوفیہ۔

3۔ اسی وجہ سے حضرت چشت کے یہاں پورا انار کھائے جانے کا دستور ہے۔ تا کہ نورانیت والا دانہ (بقیہ آگے)

صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قبل ملتان پہنچے تھے۔ اس موقع کی یہ روایت بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کو جب ملتان کی مسجد میں خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قیام کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے مسجد میں جا کر ان کی جوتیوں کا رخ دہلی کی سمت کر دیا۔ گویا مفہوم یہ ہوا کہ ملتان میں نہ ٹھہریے اور دہلی کی راہ لیجئے۔ مولانا جمالی سہروردی نے اپنی کتاب سیر العارفین میں اس کو یوں لکھا ہے کہ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد میں جا کر خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے یہاں ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ لیکن حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ یہ کہہ کر کہ یہاں ولایت تمہاری ہے دہلی کو روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ تشریف آوری کی تاریخ کا تعین حضرت بابا صاحب کی عمر شریف سے کیا جا سکتا ہے۔ کتاب نافع پڑھنے کے زمانے میں ان کی عمر ۱۵، ۱۸ یا ۲۲ سال کی بتائی جاتی ہے۔ اس حساب سے ۵۸۲ھ، ۵۸۷ھ، یا ۵۸۹ھ کا زمانہ متعین ہوتا ہے۔ اب ۵۸۲ھ کا سال اس لئے غلط ہے کہ اس سال ہندوستان میں نہ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تھے اور نہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ بلکہ یہ حضرات ۵۸۷ھ میں تشریف لائے ہیں۔ لیکن اس موقع پر نہ حضرت بابا صاحب کا ملنا اور نہ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا دعوت دینا کسی طرح ثابت ہوتا ہے۔ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ ۵۸۷ھ میں یا خورد سال(1) تھے یا عالم طفلی میں تعلیم پا رہے تھے۔ لہٰذا اس واقعہ کے لئے یہ سال بھی ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ ممکن ہے کہ ۵۸۷ھ اور ۵۸۹ھ کے درمیان میں شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ''قاضی بچہ دیوانہ'' کو انار دینے کے بعد خراسان کو واپس چلے گئے ہوں اور اس کے بعد دوبارہ ہندوستان آئے ہوں۔ لہٰذا یہ روایت کہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں آئے تھے اور راستہ میں حضرت بہاء الدین زکریا کے یہاں ٹھہرے تھے وغیرہ وغیرہ مشکوک ہی نہیں بلکہ قطعی غلط ہے۔ جب سلطان شمس الدین التمش نے حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا دہلی میں استقبال کیا

(بقیہ گزشتہ) مل سکے۔ لیکن رسول علیہ الصلوٰۃ التسلیم کی ایک حدیث ہے کہ ہر انار میں ایک قطرہ جنت کے پانی کا ضرور ہوتا ہے اور اسی قطرے کے لئے چشتی انار کھانا ضروری سمجھتے ہیں۔

1۔ حضرت زکریا کی عمر اس سال میں گیارہ سال کی ہونی چاہئے۔

ہے تو خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بربیان طبقات ناصری وفتوح السلاطین دہلی میں پہلے سے موجود تھے۔

اب رہا اصلی سوال کہ بغداد سے خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کب تشریف لائے تو اس کے متعلق تین روایتیں ہیں:

ا۔اپنے پیر و مرشد کے ساتھ آئے۔

۲۔جب خواجہ بزرگ ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے تو خواجہ قطب صاحب دوسرے راستہ سے روانہ ہوئے اور حضرت والا کے تشریف لے آنے کے بعد ملتان ٹھہرتے ہوئے دہلی پہنچے۔

۳۔شیخ جلال الدین کی معیت میں آئے۔فرشتہ راوی ہے کہ ملتان تک دونوں ہمسفر تھے اور حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مقیم ہوئے تھے۔اس کے بعد حضرت تبریزی غزنی چلے گئے اور خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلی چلے آئے۔

گویا اس طرح اختلاف روایت کو دور کرنے کی ناکام کوشش اس طرح کی گئی ہے کہ پہلی مرتبہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر و مرشد کے ساتھ ایک ہی راستے سے آئے تھے۔پھر وہ اپنی والدہ صاحبہ سے ملنے چلے گئے اور دوبارہ شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں آئے اور ملتان میں حضرت زکریا کے یہاں قیام کیا۔یہ عطف اور یہ عذر کہ والدہ صاحبہ سے ملنے چلے گئے تھے برائے بیت اور چیستان ہے۔اگر وہ حیات ہوتیں تو ان کی خدمت کے لئے ان کو چھوڑ دیا جاتا۔اور خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اپنے ساتھ کبھی نہ لاتے۔شریعت وطریقت کا حکم کچھ اس طرح کا ہے۔لہٰذا قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سفر اوش کی یہ داستان بھی من گھڑت ہے۔سفر کا امکان ثابت نہیں ہوتا۔واپسی کا سراغ نہیں ملتا۔اس لئے کیوں نہ سمجھا جائے کہ اپنے پیر و مرشد کی طرح حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کی معیت میں ہندوستان آنے کے بعد ہندوستان سے باہر کبھی نہیں گئے۔

جب اس طرح تمہیدی روایت کی سست بنیادی ثابت ہوگئی تو اس کا آخری جز بھی محل نظر ہے کہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اجمیر حاضر ہونے کی درخواست کیوں بھیجی۔ اس کا سبب شوق زیارت نہیں ہوسکتا۔ اس کے متعلق قیاس کرنے میں تاریخ سے مدد مل سکتی ہے۔ یعنی سال بھر کے اندر ایک جانشین آرام شاہ جب تخت سے معزول کردیا گیا تو دلیل العارفین کے مطابق حضرت والا کی پیشن گوئی پوری ہوگئی۔ یعنی ۶۰۸ھ میں دہلی کی سلطنت شمس الدین کو مل گئی(1)۔ تخت نشین ہونے کے ساتویں دن التمش نے خواجہ قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی(2)۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی سلطان قطب الدین ایبک کے تمام صوبوں نے بغاوتیں شروع کردیں۔ شمس الدین کا یوں تو پورا عہد مصیبتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر ابتدائی دور میں قیامت کا سامنا تھا۔ چنانچہ ان ابتدائی بغاوتوں کی وجہ سے اپنے مرید التمش کی پریشانیاں دیکھ کر دہلی کے صاحب ولایت حضرت خواجہ قطب رحمۃ اللہ علیہ کو فکر لاحق ہونا ضروری ہے۔ خاصان خدا مشیت وقدرت کو نہیں بدل سکتے۔ لیکن ان کی فراست اور مزاجدانی اس کی اجازت دیتی ہے کہ مشیت کی تعمیل میں بوجوہ احسن آسانیاں بہم پہنچادیں۔ اس غرض ومقصد کے لئے حضرت سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ سے حاضر ہونے کی درخواست چاہی تھی کہ التمش کے معاملات اور دہلی کی مشکلات کے متعلق مشورہ کریں۔ اس درخواست کی تاریخ کا تعین بغاوتوں کے وقت ۶۰۸ھ میں بے تکلف کیا جاسکتا ہے۔ اس درخواست کا جواب یہ ملا تھا کہ بعد مکانی بے معنی ہے۔ قرب روحانی تمہیں حاصل ہے۔ البتہ ملنے کے لئے ہم خود آئیں گے۔ مفہوم یہ ہوا کہ ہم تمہاری فکروں سے آگاہ ہیں۔ حقیقت خود

1۔ فوائد الفواد میں ہے کہ پیشن گوئی حضرت اوحد الدین کرمانی رحمۃ اللہ علیہ یا شیخ الشیوخ رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ فرشتہ راوی ہے کہ بمقام بخارا، انگور خریدنے کے لئے جب التمش کے آقا نے ان کو بھیجا تو دام گر گئے۔ اس کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوئی تو ایک اللہ والے نے انگور خرید کردیے اور یہ نصیحت کی جب سلطنت ملے تو فقراء اور اہل خیر سے نیکی کرنا۔ اس کے بعد فرشتہ کا یہ بھی بیان ہے کہ اپنی مجلس سماع میں التمش کی خدمت گزاری دیکھ کر قاضی حمید الدین ناگوری سہروردی نے دعائے خیر بادشاہت کی دی تھی۔ واللہ اعلم۔

2۔ تذکرۃ الواصلین مرتبہ خان بہادر محمد رضی الدین صاحب بدایونی مرحوم۔

بخود سمجھ میں آجائے گی اور اس کے بعد ہم خود آ کر مطمئن کر دیں گے۔ جب صورت اس قسم کی ہو تو حضرت والا کے پہلے سفر دہلی کی توجیہ و تشریح جو کی گئی ہے۔ وہ سب بے ثبوت ہے۔ اس قسم کے بے بنیاد قیاسات توہمات کا دروازہ کھول دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ حسب وعدہ کچھ عرصہ کے بعد حضرت والا بہ نفس نفیس دہلی تشریف لائے تھے۔

ابتدائی بغاوتوں کے سلسلہ میں یہ روایت اہم ہے کہ ۶۱۴ھ میں شکست کھانے اور معافی طلب کرنے سے پہلے جب قباچہ نے خلجیوں پر سختی کرتے ہوئے بغاوت کی تیاریاں شروع کی تھیں تو ملتان کے قاضی شرف الدین اصفہانی اور پیر طریقت حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اپنے طور پر خطوط بھیج کر التمش کو اطلاع دی تھی۔ مگر اثناء راہ یہ خطوط پکڑے گئے اور ان صاحبان سے باز پرس کی گئی۔ قاضی صاحب کے سکوت پر ان کو قتل کر دیا گیا اور حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی جرأت اقبال اور ملامت کرنے پر قباچہ مرعوب ہو گیا۔ پھر اس نے عزت واحترام کے ساتھ انہیں بخیر وخوبی رخصت کر دیا(1)۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ خلافت پا کر ملتان آئے ہوئے حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کو کافی مدت گزر گئی تھی اور انہوں نے ملتان اور دہلی کی حکومتوں میں کافی اثر اور رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ گویا ملتان میں ۶۱۴ھ سے بہت پہلے سکونت پذیر ہو گئے تھے(2)۔

خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اگر سمع خراشی کی معافی طلب کر کے عہد شمسی کے موٹے موٹے واقعات کا خاکہ پیش کر دیا جائے۔ اور اس سے زیر غور حالات پر رائے قائم کرنے میں ممکن ہے کہ خاصی مدد مل سکے۔

۱۔۸۔۶۰۷ھ/ ۱۲۱۱ء میں التمش تخت نشین ہوا۔ جامداروں نے ساز باز کر کے امرائے معزی وقطبی نے بغاوت کی۔ سب سے پہلے التمش نے ان کو نواح دہلی میں شکست

1۔ فوائدلفواد، سیر العارفین، فرشتہ جلد دوم، آب کوثر، بزم صوفیہ۔

2۔ انوار غوثیہ کے حوالے سے مولانا نور احمد صاحب فریدی نے حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ حضرت بغداد سے خلافت حاصل کر کے ۶۱۴ھ میں روانہ ہوئے تھے اور ۶۱۵ھ میں ملتان تشریف لائے تھے۔ واللہ اعلم۔

دی۔ پھر دہلی، بدایوں، اودھ، بنارس اور سوالک کو مطیع کیا۔

۲۔ ۶۱۱ھ/ ۱۲۱۵ء میں ترائن میں شکست دیکر یلدوز کو اسیر کیا۔ اور بدایوں میں قید رکھا۔ ۶۱۴ھ میں قتل کیا(1)۔

۳۔ ۶۱۴ھ میں لاہور، سرہند، کہرام میں قباچہ کے خلاف حملہ کیا۔

۴۔ ۶۱۵ھ میں غزنی کے خلجیوں کی مدد کے لئے قباچہ پر حملہ کیا اور اس کو زیر کر کے معاف اور بحال کیا۔

۵۔ ۶۱۹ھ/ ۱۲۲۳ء میں لکھنوتی (بنگال) پر فوج کشی کی اور اپنے صاحبزادے ناصر الدین محمود کو حاکم مقرر کیا۔ اور بنگال میں حضرت جلال تبریزی سے ملاقات کی۔ ناصر الدین محمود نے عیوض کو قتل کر کے لکھنوتی پر قبضہ کیا۔ پھر ۶۲۳ھ میں کامروپ پر حملہ کیا۔ اس کے ڈیڑھ برس بعد ۶۲۵ھ میں ناصر الدین محمود کا انتقال ہوا۔

۶۔ ۶۲۱ھ/ ۱۲۲۵ء میں جلال الدین منکبرتی نے لاہور آ کر چنگیز کے خلاف التمش سے مدد مانگی۔ سلطان نے مدد دینے سے انکار کیا۔ پھر التمش نے لاہور پر فوج بھیجی جب کہ جلال الدین ملتان کی طرف چلا گیا تھا اور تولی خاں نے ملتان تک اس کا تعاقب کیا۔

۷۔ تولی خاں نے ملتان کا محاصرہ ۶۲۱ھ میں چالیس روز کیا اور اس محاصرہ سے کچھ پہلے التمش نے نندنہ فتح کر لیا تھا۔

۸۔ ۶۲۳ھ میں خلجیوں کی طرف داری میں اوچھ اور ملتان پر حملہ کیا۔ قباچہ بھاگ کر بھکر پہنچا۔ وہاں سے اس نے اپنے صاحبزادے علاء الدین بہرام شاہ کو بغرض صلح التمش کی

1۔ عام طور پر یلدوز کا مزار جامع مسجد بدایوں کے عقب میں بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ مزار کسی شاہزادہ بلخ کا ہے جو شیخ تاجا کے مدرسے میں بعہد اکبر تعلیم کی غرض سے آیا تھا۔ اور اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ مصنف طبقات ناصری کا بیان ہے کہ بدایوں میں یلدوز کا مزار اس نے خود دیکھا تھا۔ لیکن مزار کی جائے وقوع اس نے نہیں لکھی ہے۔ ہمارا خاندانی تذکرہ نواب فرید کے روضہ کے مغرب میں چھوٹے سے مقبرہ کے اندر یلدوز کا مزار بتایا جاتا ہے۔ یہ مقبرہ آبادی شیخوپور سے پہلے کا ہے۔ اور اس مقبرے کی جائے وقوع کو بیرون شہر ہونا چاہئے نہ کہ اندرون شہر بدایوں۔ اب یہ مقبرہ ۱۹۵۵ء کے سیلاب و بارش میں سر بسجود ہو گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

خدمت میں بھیجا۔ مگر جب اوچھ فتح ہونے کی خبر قباچہ نے سنی تو بھکر سے بھاگتے میں ۶۲۳ھ/ ۱۲۲۷ء میں کشتی الٹ جانے سے غرق ہوا۔ ۶۲۴ھ میں التمش بمقام اجمیر غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر ملا۔

۹۔ ۶۲۵ھ میں دہلی آکر جشن کیا(1)۔ اسی سال خلافت عباسی سے خلعت ملا۔ اس کے بعد ناصر الدین محمود کے انتقال اور بالکا کی بغاوت کی خبر آئی۔

۱۰۔ ۲۷۔۶۲۶ھ میں التمش لکھنوتی پہنچا بالکا کو قید کیا اور علاء الدین جانی کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔

۱۱۔ ۶۲۸ھ میں التمش نے راجستان کی طرف کوچ کر کے قلعہ رنتھبور فتح کیا۔

۱۲۔ اور اسی سال سوالک میں قلعہ مندد فتح کیا(2)۔ ۱۲۲۹ء یا ۱۲۲۸ء۔ ۶۲۸ھ میں اجمیر شریف کا سفر کیا۔

۱۳۔ ۶۲۸ھ میں گوالیار کو روانہ ہوا۔ گیارہ ماہ بعد قلعہ گوالیار کی تسخیر کی۔

۱۴۔ ۳۰/۶۲۹ھ میں بلاد مالوہ پر فوج کشی کی اور بھیلسا، اجین اور تبخانہ مہا کال فتح کیا۔

۱۵۔ بیانہ یا ملتان کی طرف کوچ کیا۔ اثنائے راہ بیمار ہو کر دہلی واپس آیا۔ پھر انیس ۱۹ دن بیمار رہ کر ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء کو وصال ہوا۔

1۔ اس موقع پر ناصری شاعر ایران نے قصیدہ پیش کیا اور بتوجہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ انعام کثیر پایا۔ مطلع ہے۔

اے فتنہ از مہیب تو زنہار خواستہ — تیغ تو مال و فیل ز کفار خواستہ

2۔ اسی موقع پر امیر روحانی بخاری نے قصیدہ لکھا تھا کہ

از بلاد سوالک شہنشہ اسلام — کشاد بارو گر قلعہ سپہرا آئیں

شہ مجاہد و غازی کہ دست تیغش را — رواں حیدر کراری کند تحسین

دہلی کا پہلا سفر اجمیر سے

اس سفر کے حالات جو تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

حسب وعدہ خواجہ قطب الدین صاحب سے ملنا۔ التمش کی پریشانیوں کو دور کرنا اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو انعام وخلعت عطا کرنا۔

اس سفر کے لئے حضرت والا کو کسی خاص اور مناسب وقت کا انتظار تھا۔ دہلی پہنچ کر خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں قیام فرمایا۔ تشریف آوری کی خبر سن کر دہلی میں عید ہوگئی۔ تمام مخلوق قدم بوسی وزیارت کے لئے امنڈ آئی۔ سلطان شمس الدین بھی حاضر خدمت ہوا۔ اس نے ہر چند چاہا کہ میزبانی کی سعادت حاصل کرے۔ مگر درخواست مسموع نہیں ہوئی۔ اس موقع پر حضرت والا نے حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق استفسار کیا۔ اور جب یہ بتایا گیا کہ چلہ میں معتکف ہیں تو فرمایا "قطب! تم واقعی بختیار ہو کہ اتنے بڑے شاہباز کو دام میں لائے۔ اسے اب کسی مجاہدے کی ضرورت نہیں، چلو چلہ توڑ دیں"۔

ہماری خاندانی روایت برخلاف جملہ تذکروں کے یہ ہے کہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سیاحی کے سلسلہ میں حضرت خواجہ عثمان ہرونی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ گویا حضرت ہرونی کے وصال سے پیشتر۔ کیونکہ ان کا وصال ۶۱۷ھ میں ہوا تھا۔ انہوں نے ہدایت کی تھی کہ ہندوستان پہنچ کر حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کریں۔ پھر حضرت غریب نواز نے خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دہلی بھیج دیا۔ نافع پڑھنے کے زمانے میں ملتان میں بیعت کی اس روایت صحت کو مشکوک کرتی ہے۔ اس کا تعین تقریباً ۵۸۸ھ میں ہوتا ہے۔ اور اس سے پہلے حضرت بابا صاحب کی سیاحت اور واپسی قابل قبول نہیں۔

بہر حال اب جب حضرت والا خود دہلی آئے تو حضرت بابا صاحب کو خلعت دیا۔ خلافت دلوائی اور خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بختیار کے لقب سے سرفراز فرمایا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب یہ دونوں آفتاب و مہتاب چلہ کی کوٹھری میں پہنچے تو ہماری خاندانی روایت کے مطابق باوجود ضعف کے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد کو پہلے مؤدبانہ تعظیم دی اور اس کے بعد شیخ کے شیخ کی تکریم کی۔ مرشد کی طرف سے تین مرتبہ تنبیہ ہونے پر بھی آداب کی اس ادائیگی میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ حفظ مراتب کی اس ادا پر بڑے خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متبسم ہوئے اور معنی خیز نگاہ کے ساتھ حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا: ''یہ کمالیت کا ثبوت ہے۔ آؤ اسے کچھ عطا کر دیں''۔ اس موقع پر ہمراہی میں قاضی حمید الدین ناگوری سہروردی، مولانا علی کرمانی، علاء الدین کرمانی، سید نورالدین غزنوی(1)، مولانا مبارک، شیخ نظام الدین ابوالمؤید(2)، مولانا شمس الدین ترک(3)، خواجہ محمود موئنہ دوز(4)، اور دیگر مشائخ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین موجود تھے۔ اس سب کی موجودگی میں دونوں حضرات نے بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے درمیان کھڑا کیا، جو کچھ عطا کرنا تھا کر دیا اور جناب باری تعالیٰ میں دعا کی کہ اے خداوند! فرید کو قبول فرما۔ ندا آئی کہ قبول کیا۔ یہ وحید عصر ہوگا۔ اس کے بعد حضرت والا نے خلعت عطا فرمایا اور خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے دستار، شال اور دیگر لوازمات خلافت اسی وقت مرحمت فرمائے(5)۔

1۔ شیخ نورالدین مبارک غزنوی سہروردی تھے۔ عالم و فاضل تھے اور التمش نے انہیں شیخ الاسلام بنایا تھا۔
(تاریخ فیروز شاہی)

2۔ شیخ جمال جن کا مزار کول (علی گڑھ) میں ہے ان کی اولاد سے تھے۔

3۔ شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت صابر صاحب کلیر رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ اور حضرت خواجہ قطب ایک اور صاحب سے مستفیض ہوئے تھے۔

4۔ خواجہ محمود موئنہ دوز قاضی حمید الدین ناگوری سہروردی کے مرید ہیں۔ قطب صاحب کے خاص احباب میں سے تھے۔ ان کا مزار دہلی میں بتایا جاتا ہے۔ روایت کے بموجب حضرت شاہ ولایت صاحب کی درگاہ بدایوں میں ہے۔ اور اس راستہ میں ہے جو گنبد سے نکل کر مرزا بادل بیگ رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ کی طرف جاتا ہے۔ واللہ اعلم

5۔ بعض صاحبان نے اس عطیہ خلافت کو بیعت سے موسوم کیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ بیجا نہ ہوگا اگر حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنی تحقیق کے مطابق واقفیت کے لئے چند تاریخیں درج کر دوں۔ (بقیہ آگے)

خوشا وقتے وخرم روزگارے

(بقیہ گزشتہ) تا کہ مختلف مغالطوں کی صحت ہو جائے۔

پیدائش بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۵۶۹ ھ بحوالہ جواہر فریدی اخبار الاخیار سفینۃ الاولیاء وغیرہ۔ بیعت بمقام مسجد ملتان ۵۸۹ ھ بہ سند اخبار الاخیار، سفینۃ الاولیاء و سیر الاولیاء کو سب سے پہلے حضرت جلال الدین تبریزی نے انار دیا تھا۔

عطیہ خلافت ۶۱۲ ھ/۱۲۱۶ء جب کہ پہلی مرتبہ خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ اجمیر سے دہلی آئے تھے۔

درود پاک پتن شریف ۶۳۴ ھ/۱۲۳۸ء کے بعد۔ بعد وصال خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلی وہانسی میں قیام کرتے ہوئے پہنچے۔ بیعت محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۶۵۵ ھ بمقام پاک پتن شریف حضرت صابر صاحب کو ان سے پہلے مرید کر چکے تھے۔ اور خلافت دے چکے تھے۔

وصال بابا صاحب عام خیال یہ ہے کہ ۶۶۴ ھ میں وصال ہوا۔ مگر منتخب التواریخ کے مطابق یہ ہے کہ وصال اس سال ہوا جس سال ترکستان کے سفیر ناصر الدین محمود کے دربار ۶۵۶ ھ میں آئے تھے۔ یہ بھی شہرت ہے کہ حضرت کے وصال سے دو برس پہلے کشو خاں اور حضرت زکریا کا وصال ہوا تھا۔ جس کی تاریخ یہ ہے۔ زہے عشق ربانی یکے زخمی دگر خوں شد۔ گویا ۶۵۸ ھ میں ان دونوں کا وصال ہوا۔ لیکن حضرت محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ راوی ہیں کہ زکریا کے تین برس بعد بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تھا۔ یعنی ۶۶۱ ھ میں اور یہی سال زیادہ معتبر ہے۔ اس طرح عمر شریف ۹۳ سال کی ہوتی ہے۔

دہلی کا دوسرا سفر اجمیر سے

جملہ تذکرہ نویس متفق ہیں کہ حضرت والا نے سفر اول اور سفر دوم کے درمیان عقد ثانی کیا تھا۔ لیکن ان تینوں میں سے کوئی واقعہ کسی واقعہ کی تاریخ مقرر کرنے میں مدد نہیں دیتا۔ اس لئے کہ ہر واقعہ بذات خود اپنی تاریخ کا محتاج ہے۔ سفر دوم کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ صاحبزادے صاحب کی کھیتی کو واگزاشت کرانے یا کسی دوسرے کاشتکار کو کھیتی کا فرمان دلوانے کے لئے دہلی تشریف لائے تھے۔ لیکن فرمان ملنے کی روایت ایک صاحب کے متعلق ہے اور دوسرے صاحب کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی شخصیت کو دو ناموں سے منسوب کیا گیا ہے۔ تذکرہ نویس صاحبزادے صاحب کا نام لیتے ہیں۔ مگر حضرت والا کی روایت محض ایک کاشتکار کا ذکر کرتی ہے۔ لہٰذا صاحبزادے کی بجائے کسی کاشتکار کی ہی سفارش زیادہ صحیح ہوسکتی ہے۔ تشریف لانے کی یہی وجہ بیان کی گئی ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات کے لئے ہر چند کہ وہ کار خیر ہوا تنا دور دراز سفر کسی نوعیت سے جی کو نہیں لگتا۔ ہوسکتا ہے کہ حصول فرمان کا قصہ محض ظاہری مصلحت ہو اور اصل مقصد کا لوازمہ در پردہ ہو۔ اس دوسرے سفر کی نمایاں خصوصیت خواجہ قطب الدین صاحب اور شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے اختلاف کو دور کرنے کی کوشش ہے۔ کیا وجہ کہ اس کو ہی سفر کا اصل مقصد نہ سمجھا جائے۔ اپنی تشریف آوری کی اس مرتبہ خواجہ قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع نہیں دی گئی تھی اور اچانک تشریف لے آئے تھے۔ اور اس کے متعلق خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے استفسار بھی کیا تھا۔ اس شبہ کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ اس مرتبہ قیام کے متعلق بھی کچھ نہیں کھلتا کہ کہاں کیا۔ البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہر وقت حاضر رہے اور شیخ الاسلام باوجود پیر بھائی ہونے کے ملنے تک کو نہیں آئے۔ یہ تقابل علیحدہ قیام کا مفہوم ظاہر کرتا ہے۔ اگر خواجہ قطب

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں قیام ہوتا تو شیخ الاسلام کے نہ آنے پر حیرت ہوئی۔ جب شیخ الاسلام نہیں آئے تو حضرت والا خود انکے یہاں گئے اور اختلاف کے متعلق گفتگو کی۔ سادہ مزاج تذکرہ نویسوں نے اس ملاقات کا حال لکھا ہے۔ اس کی تصدیق نہ واقعات سے ہوتی ہے نہ اس کو عقل سلیم قابل قبول سمجھتی ہے۔ بہر حال نتیجہ گفتگو یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ شیخ الاسلام قائل ہو گئے اور انہوں نے یہ شکایت کی کہ لوگ مجھ سے زیادہ قطب صاحب کو کیوں عزیز رکھتے ہیں۔ کیا واقعی یہی شکایت تھی۔ کس قدر طفلانہ اور رکیک شکایت ہے۔ حضرت والا نے ان کی خوشی کی خاطر قطب صاحب کو اپنے ہمراہ لے جانے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن بعد میں لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر انہیں دہلی ہی چھوڑ گئے۔ یہ بہلانے والی بات کہ ساتھ لے جائیں گے۔ پھر یہ مجبوری کی حکایت کہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی چھوڑ گئے تناقض کی دلیل ہے۔ اور حضرت والا کی شان کے خلاف بھی ہے۔ اب اگر سنجیدگی سے اس کل واقعہ پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کے متعلق شیخ الاسلام نے حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی نہیں مانی اور نہیں سنی اور کیوں مانتے، آخر وہ بھی تو خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ مزید برآں شیخ الاسلام تھے اور اپنے علم درائے پر بھروسہ رکھتے تھے۔ جب تصفیہ نہ ہوسکا تو اپنی طرف سے اختلاف کا قصہ پاک کرنے کو خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں سے لے جانے کا وعدہ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے خیال میں تصور جمایا اور اسی تصور کی بنا پر ساتھ لئے جاتے تھے کہ لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو واپس کر دیا۔ اگر وعدہ کر لیتے تو کبھی بھی واپس نہ کرتے۔ اب سوال یہ ہے کہ اختلاف کیا واقعی ذاتی مقبولیت کے متعلق تھا یا اور کسی خاص اور اہم بات پر اختلاف تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف اس تعلیم کی اشاعت کے متعلق تھا جو خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا کرتے تھے۔ اور یہ تعلیم خود خواجہ بزرگ کی تھی۔ یعنی بالفاظ دیگر اختلاف خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔

بہر حال جب حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ اپنی بات پر قائم رہے تو حضرت

بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی استقامت وصداقت نے سفارش کی کہ ان کو میدان سے نہ ہٹایا جائے۔ لہٰذا لوگوں کا اصرار کہ ان کو ساتھ نہ لے جایا جائے، ظاہری پردہ بن گیا۔ چنانچہ ان کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ "اہل شہر پریشان و بے قرار ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اتنے لوگوں کے دلوں کو تمہاری آتش جدائی سے کباب کروں۔ میں نے یہ شہر تمہاری حمایت میں چھوڑا"۔ یہ رخصتی الفاظ اور خصوصاً یہ کہ یہ شہر تمہاری حمایت میں چھوڑا ہے، اعلان کر رہے ہیں کہ تمہاری روش پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہاری تعلیم وتبلیغ مقبول ہے اور تم اس کی برابر دعوت دیتے رہو۔ اس رخصتی پیغام میں کسی حرف اور اشارے سے پتہ نہیں چلتا کہ نجم الدین صغریٰ کی شکایت کا لحاظ رکھنا اور ان کے اعتراض کو دور کرنے کی کوشش کر کے ان کے سامنے سر جھکا دینا۔ یہی رخصتی ہدایت واضح کر رہی ہے کہ نتیجہ گفتگو وہ نہیں نکلا جو تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے۔ بالفرض اگر اس اختلاف کے متعلق مفاہمت ہو گئی تو آگے چل کر مستقبل قریب میں شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ الاسلام جھگڑا نہ کرتے۔ اس نزاع کے وجوہات جو لکھے گئے ہیں وہ رکیک، ذلیل، اور انسانیت سوز ہیں۔ حیرت ہے کہ لوگ ان مقدس ہستیوں کے متعلق اس قسم کی خرافات سننے کے روادار کیسے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تذکرہ نویس ایسی باتیں لکھتے ہوئے اپنی علمیت وعقل کہاں فروخت کر دیتے ہیں۔ آخر نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ عالم، فاضل، حدیث وفقہ کے ماہر، مجاہدات کئے ہوئے اور خواجہ عثمان ہرونی کے خلیفہ تھے۔ ان سے ایسی مہمل باتیں کیسے منسوب کی جاسکتی ہیں اور ان پر منطبق کیسے ہوسکتی ہیں۔ ان کے اعتراضات علمی ومعیاری ہونے چاہئے تھے۔ اور ضرور معیاری ہوں گے جن تک ان کی رسائی نہ ہوسکی۔ دلیل العارفین میں اگرچہ ان اختلافات کی تشریح نہیں کی گئی ہے مگر کسی قسم کی گندگی کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ اختلاف واعتراضات کا قیاس کرتے وقت ان بزرگوں کے مدارج، علم، ذوق اور اخلاق کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ داستانیں جو مشہور ہیں، وہ یقینی بے بنیاد ہیں خواہ کسی بزرگ ہستی سے ہی منسلک ومنسوب ہوں۔ اختلاف کے متعلق قیاس یہی کہہ سکتا ہے کہ شیخ الاسلام کو خواجہ

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طریق تبلیغ پر اعتراض ہوگا۔ یہ اعتراض اس لئے ہوسکتا ہے کہ حضرت والا کے طریق تبلیغ کی جدتوں کو وہ بدعت سمجھتے ہیں یا پھر حضرت خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سماع کی محفلوں کے متعلق ہوگا۔ اس لئے کہ ان کے مرشد حضرت ہرونی رحمۃ اللہ علیہ سماع کے زیادہ دلدادہ نہیں تھے اور نہ خواجہ غریب نواز نے ہندوستان میں اپنے شوق وسماع کو علانیہ ظاہر کیا۔ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں سب سے پہلے سماع کی ابتدا قاضی حمید الدین ناگوری سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی (1)۔ اور سماع کی بہتاب پر شیخ الاسلام کو اعتراض ہوا ہوگا۔ اسی قسم کے اختلاف کو دور کرنے کو حضرت والا دوسری مرتبہ دہلی آئے تھے اور اس کے لئے تشریف لانا ضروری بھی تھا۔ غالباً اسی واسطے فریقین کو اپنی آمد کی اطلاع بھی نہیں کی اور قیام بھی علیحدہ کیا تاکہ فریقین کو طرفداری کا شبہہ نہ ہونے پائے۔

---

(1) اخبار الاخیار و فتوح السلاطین۔

شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا نزاع شیخ الاسلام سے

تاریخ فرشتہ، بزم صوفیہ اور سیر العارفین ناقل ہیں کہ شیخ جمال الدین بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انکار پر حضرت نجم الدین صغریٰ کو شیخ الاسلامی کے عہدہ پر فائز کیا گیا تھا۔ مگر طبقات ناصری میں صاف درج ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود نے ۱۳ رجب ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء کو جمال الدین بسطامی کو یہ عہدہ دیا تھا اور شیخ الاسلام جمال الدین بسطامی کا انتقال ۶۵۷ھ میں ہوا تھا۔ اب یوں سمجھنا چاہئے کہ عہد شمسی میں کسی اور شیخ الاسلام کے انتقال کے بعد نجم الدین صغریٰ شیخ الاسلام بنائے گئے تھے۔ تذکرہ نویس عہد شمسی میں جمال الدین بسطامی کا نام لے کر اپنی لغویت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی بتاتی ہے کہ جب پہلی مرتبہ حضرت والا دہلی آئے ہیں۔ اس وقت نور الدین مبارک غزنوی سہروردی شیخ الاسلام تھے۔ لہٰذا ان ہی کے جانشین نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ ہوئے۔ اس کے یہ بھی معنی ہوئے کہ جب حضرت والا پہلی مرتبہ دہلی آئے ہیں تو نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں موجود نہیں تھے ورنہ ملاقات ضرور ہوتی۔ لہٰذا وہ اس کے بعد ہندوستان آئے ہوں گے۔ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ الاسلامی قبول کرنے کے لئے سلطان کا کہنا اور ان کا قبول نہ کرنا بھی فرضی ہے۔ اور محض زیب داستان کے لئے ہے۔ بات صرف اتنی ہو سکتی ہے کہ حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے نجم الدین کی صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام بنا دیے گئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ نجم الدین صغریٰ تشریف آوری پر خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد کی رعایت سے ان کا ادب بھی کیا ہوگا اور ان کی سفارش بھی کی ہوگی۔

شیخ الاسلام بن جانے کے بعد خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا اختلاف ہوا ہے۔ اور پھر اس اختلاف کے کچھ عرصہ بعد شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ دہلی آئے تو ان سے بھی شیخ الاسلام کا نزاع ہو گیا۔ حضرت محبوب الٰہی سے صرف اتنا منقول ہے کہ شیخ تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ الاسلامی کے دوران دہلی آئے تھے (1)۔ لیکن برخلاف اس کے صاحب معین العارفین نے مزید واقفیت پہنچائی ہے کہ شیخ تبریزی اس وقت دہلی آئے تھے جب کہ دہلی سے سفر دوم کے بعد حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اجمیر جا چکے تھے (2)۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ شیخ تبریزی جب کبھی بھی اور جہاں سے بھی دہلی آئے تو سلطان التمش نے ان کا اعلیٰ پیمانہ پر استقبال کیا۔ استقبالیہ جماعت میں حضرت والا اور خواجہ قطب رحمۃ اللہ علیہما کے اسمائے گرامی شامل نہیں ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں آئے تھے۔ لیکن استقبال کے بعد والے واقعات میں بتایا گیا ہے کہ دہلی آنے پر شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دیرینہ اور پرخلوص دوستی کی تجدید ہوئی تھی (3)۔ اور تذکرۃ الواصلین میں حضرت محبوب الٰہی صاحب کی روایت ہے کہ دہلی پہنچنے کے دوسرے دن حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے ان کے گھر گئے تھے۔ استقبالیہ جماعت میں شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کا اسم گرامی اس تفصیل کے ساتھ درج ہے کہ تعظیم و تکریم دیکھ کر وہ شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ سے جلنے لگے (استغفر اللہ) اور اسی وقت سے انہوں نے آڑے ترچھے اور نامعقول اعتراضوں کی بوچھاڑ کر کے سلطان کو برگشتہ کرنا چاہا۔ اس پر سلطان نے محضر طلب کیا۔ اور محضر کی صدارت کے لئے حضرت

1۔ بزم صوفیہ (ص ۹۷) لیکن بقول صاحب آب کوثر حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے بدایوں اور بنگال پہنچے تھے۔ وصال ان کا ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء میں ہوا۔ مزار سلہٹ میں ہے۔

2۔ معین الارواح (ص ۱۷۵ سطر ۴، ۵)۔

3۔ فوائد الفواد حصہ چہارم۔

بہاء الدین زکریا کا اسم گرامی اس لئے پیش کیا کہ ان کو حضرت جلال الدین تبریزی سے اختلاف کا حال معلوم تھا اور سمجھتے تھے کہ اس اختلاف کی وجہ سے وہ ان کی تائید نہیں کریں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ اختلاف کے باوجود حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے فیصلہ حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں صادر فرمایا۔ جس سے نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کو خفت ہوئی۔ شیخ الاسلامی سے برطرف کئے گئے اور ان کی جگہ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام بنائے گئے اور یہ عہدہ ان کے خاندان میں عرصہ تک رہا(1) اور شیخ الاسلامی پھر سہروردی خاندان میں پہنچ گئی۔ اس محضر کے دوسرے دن یہ کہتے ہوئے کہ سونا بن کر آیا تھا۔ چاندی بن کر دہلی سے جا رہا ہوں(2)۔ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ بنگال کے سفر پر روانہ ہوگئے(3)۔ اثنا راہ میں کچھ عرصہ بدایوں میں اقامت فرمائی(4)۔ قیام ان کا محلہ دہلیز میں ہوا تھا۔ اس قیام کے ابتدائی حصہ میں دریائے سوتھ کے کنارے روحانی طور پر انہیں معلوم ہوا کہ دہلی میں نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ انہوں نے اسی وقت اسی جگہ جنازے کی غائبانہ نماز پڑھی(5)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بغض وعناد کچھ نہ تھا۔ اور یہ کہ معزولی کے فوراً بعد ہی نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تھا۔ مگر تذکرۃ العابدین نے ان کا وصال ۶۲۲ھ میں لکھا ہے۔ محلہ دہلیز اور محلہ چاہ میر کے درمیان انہوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ جو حاجی مولوی ابوالحسن قادری صاحب کے مکان کے سامنے اب تک موجود ہے اور وہ مکان جس میں قیام فرمایا تھا۔ محل کے نام سے تبدیل شدہ حالت میں

1۔ سیر العارفین، فوائد السالکین، آب کوثر، بزم صوفیہ۔ حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا سن وصال منتخب التواریخ میں ۶۵۸ھ درج ہے۔ بعض نے ۶۶۲ھ اور ۶۶۶ھ بھی لکھا ہے۔ مگر ۶۶۱ھ معتبر ہے۔

2۔ فوائد الفواد حصہ چہارم۔

3۔ فوائد السالکین، خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۲۸۱۔

4۔ آب کوثر (ص ۵۱) مگر ان کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ دہلی سے قبل بدایوں آئے تھے۔ ممکن ہے کہ دہلی سے قبل اور بعد دونوں مرتبہ بدایوں آئے ہوں۔

5۔ فوائد السالکین۔ فوائد الفواد حصہ چہارم۔

اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ روایت بھی بصیرت افروز ہو سکتی ہے کہ محلہ دہلیز میں جب خواجہ علی مولانا بزرگ کو داخل اسلام کرنے کے بعد انہوں نے اپنی خلافت دی تو حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے (1)۔

اب ہماری دسترس میں تین تاریخیں ہیں۔ ایک ۶۰۸ھ جبکہ التمش کو تخت ملا۔ اور جب کہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اجمیر حاضری کے لئے درخواست بھیجی۔ دوسری تاریخ محاصرۂ ملتان کی ہے۔ یہ دو طرح کی ہے۔ مفروضہ ۶۱۱ھ اور واقعی ۶۲۱ھ اور تیسری تاریخ حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی ہے جو خود مفروضہ ہے۔ اور جس سے حضرت والا کے سفر دہلی کا قیاس کیا گیا ہے۔ ان تینوں تاریخوں کی درمیانی مدت میں حسب ذیل واقعات ظہور میں آئے جو مختلف تذکروں میں درج ہیں یعنی:

۱۔ خواجہ قطب صاحب نے حاضریٔ اجمیر کیلئے درخواست بھیجی (۶۰۸ھ/ ۱۲۱۲ء)

۲۔ حضرت بہاءالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ بغداد سے ملتان آئے پھر مغلوں نے محاصرہ ملتان کیا (۶۱۱ھ و ۶۲۱ھ)۔

۳۔ حضرت والا نے پہلی مرتبہ سفر دہلی اختیار فرمایا۔

۴۔ حضرت والا نے اپنے پہلے سفر دہلی سے واپس جا کر اجمیر میں عقد ثانی کیا۔

۵۔ حضرت نجم الدین صغریٰ شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔

۶۔ حضرت والا نے سفر دہلی بار دوم کیا جب کہ کاشت کار کو فرمان معافی سلطان سے دلوایا اور شیخ الاسلام نجم الدین سے اختلاف کے متعلق گفتگو کی۔

۷۔ خواجہ عثمان ہرونی دہلی تشریف لائے۔ غریب نواز سے رسالہ گنج اسرار لکھوایا اور دونوں صاحبان کا قیام دہلی میں تین برس رہا۔

۸۔ حضرت والا کے دہلی سے چلے جانے کے بعد جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا

1۔ تذکرۃ الواصلین، اخبار الاخیار، فوائد الفواد اور اسرار الاولیاء حضرت سلطان العارفین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ جب وہ مولانا نورالدین سے ناراض ہو گئے تھے تو بمقام بدایوں حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود سلطان العارفین رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا قصور معاف کرایا۔

سلطان نے استقبال کیا۔

۹۔حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف محضر کی طلبی ہوئی۔

۱۰۔ بعد محضر حضرت نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ برطرف کردیے گئے اور حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی جگہ شیخ الاسلام مقرر کیا گیا۔

۱۱۔حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ محضر کے بعد دوسرے دن دہلی سے روانہ ہوئے اور قیام بدایوں کے دوران حضرت نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کی غائبانہ نماز پڑھی ۶۲۲ھ۔

مگر ان تینوں حاصل شدہ تاریخوں سے ان مذکورہ بالا درمیانی واقعات کی تاریخ کے تعین کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ ۶۰۸ھ محض ایک حد ہے جو علیحدہ معلوم ہو جاتی ہے۔ مغلوں نے محاصرۂ ملتان ۶۱۱ھ میں کبھی ہرگز نہیں کیا۔ اس لئے اس تاریخ پر ان جملہ واقعات کا انحصار قطعی غلط اور فضول ہے۔ حصول خلافت کے بعد حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا بغداد سے ملتان آنا ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء کے قرب وجوار میں معتبر ہو سکتا ہے۔ اور ۶۱۴ھ میں کسی طرح بھی صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ ۶۲۱ھ میں چنگیز کے لڑکے تولی خاں نے چنگیز کے لاہور چلے جانے کے بعد ملتان کا محاصرہ کیا تھا۔ اس سال میں ابھی مندرجہ بالا واقعات کا وقوع صحیح نہیں ٹھہرتا۔ گویا اس طرح یہ طے شدہ امر ہے کہ خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری رسالہ گنج اسرار کی تصنیف اور تین برس قیام دہلی یک قلم خبط ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ خواجہ ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال مکہ معظمہ میں ۶۱۷ھ میں ہوا تھا۔ اگر محاصرہ ملتان کی صحیح تاریخ ۶۲۱ھ/ ۱۲۲۵ء کو بنیاد سمجھا جائے تو حضرت والا کے دونوں سفر دہلی مع اپنے جملہ واقعات کے اپنی جگہ سے اڑ کر ہوا میں اس طرح سے غائب ہوئے جاتے ہیں کہ ان کی واپسی کی امید اور وقوع کا تصور امکان سے باہر ہو جاتا ہے۔

اب اگر تیسری تاریخ ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۶ء کو جو شیخ نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی بتائی گئی ہے مگر بنیاد بنا کر الٹی گنگا بہائی جائے اور پیچھے کو دیکھا جائے تو

حضرت والا کا سفر دہلی بار اول ۶۱۹ھ میں قرار پاتا ہے اور اس سے بھی نتائج صحیح نہیں نکلتے۔ واقعات متعلقہ کا تعین اگر ۶۲۱ھ/ ۶۲۲ھ کے درمیان میں کیا جائے تو یہ خلاف عقل ہے۔ لہٰذا یہ جملہ اشکال کسی نہ کسی نوعیت سے ضعیف اور لغو ٹھہرتے ہیں۔

حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ان دونوں صاحبان کا قیام پذیر ہونا ۶۲۱ھ میں محاصرۂ ملتان کے وقت ممکن اور صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ واقعہ محضر کے بعد شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی سوء مزاجی دور ہو چکی تھی(1)۔

1۔ نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی تاریخ صاحب معین العارفین نے ۶۲۲ھ تسلیم کی ہے۔ لیکن یہ سال وصال بھی دوسرے بزرگان دین کے سال وصال کی طرح فرضی دقیاسی ہے۔ آب کوثر میں ۶۲۲ھ کو حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے منسوب کیا گیا ہے اور بعض لوگوں نے حضرت تبریزی کا وصال ۶۴۲ھ میں بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ کتابت کی غلطی کی وجہ سے ۶۲۲ھ کو ۶۴۲ھ سمجھ لیا گیا ہو۔

مگر ابن بطوطہ بتاتا ہے کہ حضرت تبریزی کا وصال ۷۵۰ھ میں ہوا اور وہ ہلاکو خاں کی تباہی کے وقت وہاں موجود تھے۔ تباہی بغداد ۶۵۳ھ میں ہوئی تھی۔ کامروپ سے چل کر شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ پر ۷۴۸ھ میں ابن بطوطہ حاضر خدمت ہوا تھا۔ انہوں نے اسے اپنی پوستین مرحمت فرمائی تھی۔ جس کے متعلق پہلے سے معتقدین کو اطاع دے چکے تھے کہ یہ پوستین برہان الدین ساغرج کی ہے اور ایک مغربی سیاح کی معرفت بمقام چین بھجوائی جائے گی۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ گائے کے دودھ پر بسر اوقات فرمایا کرتے تھے۔ اور دسویں روز حضرت شیخ افطار فرمایا کرتے تھے۔ ۷۴۹ھ میں جب ابن بطوطہ چین پہنچا تو وہ پوستین شاہ کو پسند آ گیا۔ پھر ۷۵۰ھ میں ابن بطوطہ خاں بلیق یعنی سکپین جا کر برہان الدین ساغرج سے ملا تو ان کو وہی پوستین پہنے دیکھا تو سخت حیرت ہوئی۔ برہان الدین نے یہ بتا کر کہ شیخ جلال الدین تبریزی نے بہت پہلے کامروپ سے خط کے ذریعے اطلاع دی تھی کہ ایک مغربی سیاح کی معرفت تمہاری پوستین بھیج دی جائے گی۔ حیرت کو دور کر دیا اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جمعہ کی نماز شیخ جلال الدین خانہ کعبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ اور اس روز اپنی قیام گاہ سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ اور یہ کہ ابھی حال ہی میں ان کا وصال ہو گیا ہے۔ برہان الدین واعظ تھے۔ سلطان محمد تغلق کے دربار میں ان سے ابن بطوطہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر وہ اسی زمانے میں دہلی سے چین روانہ ہوئے تھے۔ اب اگر شیخ جلال تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ابن بطوطہ کے مطابق ۷۵۰ھ میں تسلیم کر لیا جائے تو تمام تذکرہ نویس غلط ثابت ہو جائیں گے۔ ابن بطوطہ نے ان کی عمر ڈیڑھ سو برس لکھی ہے۔ یعنی ان کی پیدائش ۶۰۰ھ میں ہوئی ہوگی۔ اور یہ ہر لحاظ سے ناقابل تسلیم ہے۔ تباہی بغداد میں حضرت تبریزی کی موجودگی ناممکنات سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جب تک حضرت والا کے پہلے اور دوسرے سفر دہلی کی تاریخ کسی طرح طے نہ ہو جائے ان جملہ واقعات کی گتھی حل نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہے کہ عقد ثانی کا تعین حضرت والا کے وصال کی تاریخ سے کیا جائے۔ لیکن تاریخ وصال خود متزلزل ہے۔ بہر حال وصال سے سات، سترہ اور ستائیس برس(1) پہلے عقد ثانی کی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کے نزدیک سال وصال ۶۲۷ھ/۱۲۳۱ء معتبر ہے(2)۔ وہ عقد ثانی کو ۶۲۰ھ/ ۱۲۲۴ء میں فرض کرتے ہیں۔ جب کہ یورش چنگیزی کی وجہ سے مغربی ایشیا اور ہندوستان میں کھلبلی مچی ہوئی تھی اور نجم الدین صغریٰ کے سال وصال ۶۲۲ھ سے وہ تائید کرتے ہیں۔ لیکن جو حضرت والا کا وصال ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۷ء میں مانتے ہیں وہ سترہ برس پیشتر ۶۱۶ھ/ ۱۲۲۰ء میں عقد ثانی تسلیم کرتے ہیں۔ جب کہ خوارزم سے ناراض ہو کر اترار پر چنگیز خاں نے حملہ کی ابتدا کی تھی۔ اب اگر عقد ثانی کی تاریخ ۶۲۰ھ میں مانی جائے تو سب سے چھوٹے اور آخری صاحبزادے خواجہ ضیاء الدین ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کی عمر وصال کے وقت پانچ چھ برس کی ہونی چاہئے۔ لیکن کسی طرح پتہ نہیں چلتا کہ ان کی تعلیم و پرورش کس کے ہاتھوں اور کس طرح

(بقیہ فٹ نوٹ) ہے۔ ابن بطوطہ کا سفر میں اس نے عرصہ دراز کے بعد جتنے حالات یاد تھے لکھوائے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کامروپ کے قریب خانقاہ میں ابن بطوطہ کی ملاقات حضرت جلال الدین تبریزی کے کسی خلیفہ سے ہوئی ہوگی اور ان ہی سے شیخ کے حالات سنے ہونگے۔ اور انہوں نے ہی پوستین اس کے ذریعے بھیجی ہوگی۔ سلہٹ کے گنج شہیداں میں شاہ جلال مجرد خلیفہ احمد کبیر سہروردی اور ان کے سات سو مجاہدین کے مزارات پائے جاتے ہیں۔ ممکن ہے شاہ جلال مجرد سے ہی ابن بطوطہ کا سابقہ پڑا ہو۔ واللہ اعلم۔ ابن بطوطہ نے کامروپ، سونار گاؤں، ساتگاؤں، مالدہ اور غور کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا نقشوں کی تطبیق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ جلال تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ اس مقام پر ہے جہاں سلہٹ واقع ہے۔ اور پہلے اس کا نام پنڈوا تھا۔ مغرب کی جانب گنگا کے شمالی کنارے پر بہت فاصلہ پر کھنڈر اور مالدا میں واقع ہیں اور یہ دونوں مقام دریائے برہم پتر کے جنوب میں بہت دور ہیں۔ لہٰذا حضرت جلال تبریزی کا مزار یقیناً سلہٹ میں ہونا چاہئے تھا۔ اب نہیں معلوم انقلابات نے اس کی کیا صورت کردی ہے۔

1۔ مونس الارواح مرتبہ جہاں آرا بیگم۔

2۔ معین العارفین میں یہی سال فرض کیا گیا ہے۔

ہوئی۔ مختصر یہ کہ عقد ثانی کی ۶۱۶ھ والی تاریخ کے حساب سے ان کے صاحبزادے صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر حضرت والا کے وصال کے وقت سولہ برس ثابت ہوتی ہے۔ اور یہی زیادہ قرین عقل ہے۔ کیونکہ وہ اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں تعلیم سے مزین ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے تھے۔ غرض ان دونوں مفروضہ حسابوں اور قیاسوں کے مطابق سفر دہلی بار دوم کی تاریخ ۶۲۱ھ/ ۱۲۲۵ء ٹھہرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

ان سب قیاسوں کے علاوہ ان دونوں سفروں کو تاریخ شمسی کی روشنی میں بھی پرکھنا ضروری ہے۔ التمش اپنے ابتدائی عہد میں بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف و مشغول رہا ہے۔ سب سے پہلے بمقام ترائن ۶۱۱ھ میں حاکم غزنی یلدوز کو گرفتار کرنے کے بعد اسے قدرے سکون حاصل ہوا۔ حضرت والا شاید اسی فرصت کے منتظر تھے۔ گویا خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی درخواست کے جواب میں وعدہ کے مطابق ۶۱۲ھ/ ۱۲۱۹ء کے وسط میں اجمیر سے دہلی پہلی مرتبہ آئے۔ لہٰذا بربناء مستقل سفر دہلی بار اول کا تعین ۶۱۲ھ کے وسط میں ہی صحیح ہو سکتا ہے۔

دہلی کے سفر دوم کے لئے بھی سلطان شمس الدین کے فرصت کے ایام تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ حاکم ملتان قباچہ کو ۶۱۳ھ میں زیر و بحال کرنے کے بعد سلطان کی خلش دور ہوئی اور اس کے بعد ۶۲۱ھ تک فرصت رہی۔ اسی عرصہ میں سفر دوئم کا امکان قوی معلوم ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ حضرت والا کا وصال ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۷ء میں ہوا۔ سترہ برس پیشتر عقد ثانی فرمایا۔ لہٰذا عقد ثانی کا سال ۶۱۶ھ/ ۱۲۲۰ء ہوا۔ اور چونکہ دہلی کے دونوں سفروں کے درمیان عقد ثانی کیا ہے۔ لہٰذا سفر دہلی بار دوم کا تعین صحت کے ساتھ اواخر ۶۱۶ھ میں یا اوائل ۶۱۷ھ میں ہونا چاہئے۔

حضرت والا کے اس سفر دوم ۶۱۶ھ سے پہلے نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام بنائے گئے تھے۔ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا اختلاف اس تقرر کے کچھ بعد ہوا ہوگا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام مسجد اعز الدین

میں تھا جہاں بدرالدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو خرقہ عطا کیا تھا۔ اسی زمانے میں شیخ الاسلام سابق نورالدین مبارک غزنوی سہروردی کا انتقال اور نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا تقرر ہوا تھا۔ اختلاف کو سنگین بننے میں دیر لگی ہوگی۔ جس کو طے کرنے کے لئے حضرت والا اواخر ۶۱۶ھ میں دہلی تشریف لائے۔ گویا حضرت والا کی تشریف آوری سے سال ڈیڑھ سال پہلے نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا شیخ الاسلامی پر تقرر ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۶۱۵ھ/ ۱۲۱۹ء میں قباچہ کے زیر ہونے کے بعد اور چنگیز خاں کے حملہ خوارزم کے وقت یہ تقرر عمل میں آیا تھا۔ اسی حملہ چنگیزی سے گھبرا کر خراسان و بغداد سے کثیر علماء و مشائخ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اور منجملہ ان کے نجم الدین صغریٰ بھی اسی موقع پر آئے ہوں گے۔

جب اواخر ۶۱۶ھ میں حضرت والا دہلی سے اجمیر جا چکے تو حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لائے۔ یہ امر بحث طلب ہے کہ وہ بغداد سے آئے تھے یا بنگال سے؟ بہرحال ان کے آنے پر التمش نے ان کا استقبال کیا اور شیخ الاسلام نے فوراً ہی ان سے اختلاف شروع کر دیا۔ یہ فوری اور ناگہانی اختلاف بجائے خود ایک معمہ ہے جس کو عقل سلیم قبول کرنے کے لئے محضر طلب کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ معزول اور حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ ان کی جگہ مامور ہوگئے۔ چونکہ یہ سب واقعات یکے بعد دیگرے واقع ہوئے اس لئے ان کا تعین وسط ۶۱۷ھ میں بجا طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اسی سال محضر کے دوسرے دن حضرت جلال تبریزی بنگال کے سفر پر روانہ ہوئے اور اثنائے راہ کچھ عرصہ بدایوں کے ابتدائی حصہ قیام میں بمقام دریائے سوتھ نجم الدین صغریٰ کے جنازے کی غائبانہ نماز پڑھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وصال ۶۱۷ھ میں ہوا۔ اور محضر کے کچھ دن بعد ہی ہوا۔

اب اگر ان کا قیام بدایوں میں دو اڑھائی سال رہا تو بنگال میں وہ ۶۱۹ھ کے قرب و بیں پہنچے پھر وہاں سے دہلی آکر حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لیتے ہوئے حضرت بہاء زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے مراسم کی تجدید کرنے اور ان کی قدردانی کا شکریہ ادا کرنے

۶۲۱ھ میں ملتان پہنچے ہوں تو کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں۔ محاصرۂ ملتان کے متعلق دعا کر کے یہ دونوں صاحبان اپنے اپنے مستقر پر واپس تشریف لائے۔ حضرت جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال بمقام سلہٹ ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۶ء میں ہوا۔ ان کل واقعات کی روشنی میں طائرانہ نگاہ اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ حضرت تبریزی کے کارنامے جنکی اب تک بنگال میں یادگاریں موجود ہیں۔ وہ غالباً ۶۱۷ھ میں دہلی آنے سے پہلے کے ہیں۔ ورنہ اتنے زبردست و مستقل کام کو وہ اس قلیل عرصہ میں کر نہیں سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بنگال و بدایوں کے کارناموں کی شہرت سن کر سلطان التمش نے ان کا دہلی میں استقبال کیا تھا اور پھر بنگال پہنچ کر بھی ۶۱۹ھ میں خود ان سے ملاقات کی تھی۔ کہا جا سکتا تھا۔ ۶۱۹ھ میں بنگال کی ملاقات کے بعد ۶۲۱ھ میں سلطان نے دہلی میں ان کا استقبال کیا ہو اور پھر دہلی سے خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں شیخ جلال تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ۶۲۱ھ ہی میں ملتان پہنچے ہوں۔ لیکن روایت مانع ہے اور صاف کہہ رہی ہے کہ محضر کے بعد وہ براہ بدایوں بنگال کو روانہ ہوئے تھے۔ اگر حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو انار عطا کرنے کی روایت دقیع مانی جا سکتی ہے تو حضرت جلال تبریزی کا ہندوستان آنا اس وقت ہوا تھا جب کہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر شریف بیس سال سے زائد نہ تھی اور اس کا تعین ۵۸۹ھ میں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت وہیں گھوم پھر کر وہ بغداد چلے گئے ہوں اور پھر حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نیشاپور تک ساتھ آئے ہوں اور وہاں سے چکر کاٹتے ہوئے دوبارہ بغداد پہنچ کر اور حضرت شیخ الشیوخ سے معافی حاصل کرنے کے بعد ۶۱۶ھ سے بہت پہلے ہندوستان آئے ہوں اور بنگال میں اپنی خانقاہ بنا کر تبلیغ کا سلسلہ مستقل طور پر شروع کر دیا ہو۔ ایسی صورت میں یہ استقبال اور محضر کی داستان صاف بتا رہی ہے کہ وہ تبلیغ کا استحکام کر کے دہلی آئے تھے۔ ۶۱۶ھ سے پہلے اگر حضرت شیخ جلال تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان آئے تو ان کا دہلی آنا یا تو یاد سے محو ہو گیا ہے یا حالات زمانہ کو دیکھ کر وہ دہلی سے بالا بالا خاموشی کے ساتھ گزر کر بنگال پہنچے اور وہاں اپنا مستقر بنا کر مہتم بالشان

خانقاہ بنائی۔

قصہ مختصر حضرت والا کے سفر دہلی بار اول اور بار دوم کی تاریخیں اس طرح طے ہوگئیں۔ سفر اول ۶۱۲ھ کے وسط میں ہوا نہ کہ ۶۱۱ھ میں۔ اور اس وقت یہاں ہندوستان میں مغلوں کی فوج کے بجائے مغلوں کی درندگی کی افواہیں آئی ہوں گی۔

سفر دوم اوائل ۶۱۷ھ میں ہوا۔ لہٰذا دہلی کے اس دوسرے سفر کو ۶۲۱ھ میں ممکن سمجھنا بر بنائے غلط در غلط قطعی غلط ہے کیونکہ ۶۲۱ھ میں چنگیز خاں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ وہ لاہور میں موجود تھا۔ پھر تولی خاں نے ملتان کا محاصرہ کیا تھا۔ اور التمش نے جلال الدین منکبرتی کو مدد دینے سے انکار کرنے کے بعد مغلوں کی مدافعت کے لئے لاہور پر خود یورش کی تھی۔ اور سلطان شمس الدین اندرین حالات اس زمانے میں متردد و متوحش تھا۔ اور پھر یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محضر کے بعد جلال تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی سے بنگال کا رخ کیا تھا نہ کہ ملتان کا۔

حضرت خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان میں

حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے دہلی کے دونوں سفروں میں ان کے قیام دہلی کو نہ طویل سمجھا جاتا ہے اور نہ ان دونوں قیاموں میں حضرت خواجہ ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی کا نشان ملتا ہے۔ حضرت والا کا جب سفر خراسان ممکن نہیں تو خواجہ ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کا قیاس ۶۰۸ھ سے ۶۱۷ھ تک بہ آسانی ممکن ہے۔ حضرت خواجہ ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال مکہ معظمہ میں ۶۱۷ھ میں ہوا تھا۔

عہد شمسی کی ابتداء میں غزنی و ملتان کی بغاوتوں کی وجہ سے لاہور اور ملتان کے دونوں راستے قابل سفر نہ تھے۔ لاہو کا راستہ ۶۱۱ھ/ ۱۲۱۵ء میں یلدوز کی گرفتاری کے بعد کھلا ہوگا۔ اور ملتان کا راستہ ۶۱۵ھ میں قباچہ کے زیر ہونے کے بعد صاف ہوا ہوگا۔ ان کی تشریف آوری کا امکان ۶۱۵ھ سے ۶۱۶ھ تک ہوسکتا ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلعت و خلافت عطا ہونے کے وقت تک حضرت خواجہ عثمان ہرونی ہندوستان تشریف نہیں لائے تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی موجودگی ۶۱۵ھ کے بعد والے واقعات میں بھی نہیں پائی جاتی۔ اب بھی اگر اصرار کیا جائے تو ان کے تشریف لانے کا امکان ۶۱۲ھ۔ ۶۱۴ھ کے درمیان میں براہ لاہور ہوسکتا ہے۔ مگر التمش اس دوران کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے علاوہ اس عرصہ میں اتنی مدت تک حضرت والا کا قیام دہلی میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور یہ بھی کسی طرح ممکن و ثابت نہیں کہ خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے تین برس دہلی میں قیام فرمایا اور سلطان کو تعلیم و تربیت دی۔ آخر خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تین برس کے قیام دہلی میں کیا کیا۔ کوئی روایتی یا فرضی کارنامہ بھی ان کے متعلق منقول نہیں۔

حضرت خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کے متعلق اختلاف ہے۔

تاریخ فرشتہ، تاریخ صولت افغانی اور رسالہ گنج اسرار سے ہندوستان میں ان کا تشریف لانا ظاہر ہوتا ہے۔ صاحب معین العارفین نے ان کے آنے کے امکان کو ۶۱۱ھ میں ترجیح دی ہے۔ اور تین برس کے قیام کو جائز سمجھا ہے۔ معین العارفین کے مطابق گنج اسرار میں بعض بیانات ایسے ہیں جن کی اشاعت سمرقند، بخارا اور بغداد میں ہو چکی تھی۔ مگر وہ مضامین ہندوستان میں اس وقت تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا ان مضامین کے حوالوں کا گنج اسرار میں مطالعہ کر کے صاحب معین العارفین نے حضرت والا کے مفروضہ سفر سوم و چہارم کا مدعا یہ بتایا ہے کہ ان مقامات میں جا کر وہ نئے مضامین حاصل کئے تھے(1)۔ اس منطق و استدلال کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یک نہ شد دو شد اور یہ کہ غلط گویم بر روے تو۔ گنج اسرار میں مذکور ہے کہ اس رسالہ کی ترتیب کے لئے حضرت والا نے بہت پہلے سے ستر سے زیادہ کتابیں فراہم کی تھیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گنج اسرار لکھنے کا تصور خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے بہت پیشتر پیدا ہوا تھا۔ لیکن حضرت والا کی علمیت اور باطنی فضیلت یقیناً فراہمی کتب سے مستغنی تھی۔ بہر حال جب صاحب معین العارفین نے تشریف آوری کو ۶۱۱ھ میں فرض کیا تو یہی صورت بہترین تھی کہ یہ تحقیق خود جدت کے ساتھ حضرت والا کے سفر دہلی بار اول سے اس واقعہ کو پیوست کر دیا جائے۔ مگر یہ اتصال اس لئے ٹھیک نہیں مانا جا سکتا کہ دونوں سفروں کے دہلی والے واقعات میں خواجہ ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی کسی طرح بھی موجودگی اور شرکت نہیں پائی جاتی اور سب سے زیادہ یہ کہ دونوں صاحبان کا مسلسل و مستقل تین برس کا قیام دہلی میں کسی نوعیت سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ حسب روایت فرشتہ دہلی کے سفر اول کے قیام کے متعلق حضرت والا نے خواجہ قطب صاحب کو لکھا تھا کہ

"زیادہ بر دو سہ روز نخواہم ماند۔ چنانچہ در ہماں چند روز غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ روانہ شد"

اب اگر بجائے سفر اول کے سفر دہلی بار دوم کے ساتھ خواجہ ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کا تصور کیا جائے تو ۶۱۴ھ کے بعد تین برس کا قیام ممکن نظر نہیں آتا۔ فرشتہ کی روایت

1۔ معین العارفین۔ ص ۱۲۵۔

حاجی محمد قندھاری کی تاریخ سے ماخوذ ہے اور وہ محض اس قدر ہے کہ "خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ شمس الدین کے عہد میں ہندوستان آئے۔ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اس وقت اجمیر میں متوطن تھے۔ اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان سے ملاقات ہوئی یا نہیں"۔ لہٰذا فرشتہ کے اس بیان سے سفر دہلی بار اول کے بعد خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کا اجمیر سے دہلی آنا اور رسالہ کی تصنیف کے سلسلہ میں تین برس دہلی رہنا یک قلم مسترد ہو گیا۔ اس روایت میں شان نزول نہیں بتائی گئی ہے لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے نہیں آئے تھے۔ ورنہ ملاقات ہونے کے متعلق حاجی محمد قندھاری گومگو میں مبتلا نہ ہوتے اور صریح طور پر واقعہ لکھتے۔ بالفرض کسی وجہ سے بھی سہی۔ جب وہ ہندوستان آئے تھے تو حضرت غریب نوار رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے یا آنے کی اطلاع دینے کا کچھ تو پتہ چلتا۔ اس کے علاوہ ہم دنیاداروں کے معیار محبت سے ان بزرگوں کا معیار محبت جدا ہوتا ہے۔ اس معیار کے مطابق آنے جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی جب تک کہ کوئی ظاہری سبب نہ ہو۔ اب تشریف آوری کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف دور کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ لیکن وہ اختلاف دور نہ ہو سکا۔ یا بقول شخصے حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے دور کر دیا۔ اگر یہی سبب مان لیا جائے تو بھی ۶۱۶ھ میں خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کا امکان معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ روایت بھی کہ سلطان نے ان کا شاندار استقبال کیا تھا، محتاج ثبوت ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ والے استقبال کو خوش عقیدت حضرات نے خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کے استقبال سے منسوب کر دیا ہو۔

یہ حقیقت بھی مخفی نہیں کہ خواجگان چشت میں سے کسی ایک نے بھی کسی رئیس کے لئے کوئی کتاب لکھی ہو۔ ان حضرات کے یہاں قلب ونگاہ سے تعلیم فرمانے کا دستور ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کو شمس الدین التمش سے کیا خصوصیت تھی جو اس کے لئے رسالہ لکھوانے کی غرض سے ہندوستان آتے۔ شمس الدین خواجہ قطب

صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت رکھتا تھا اور حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مستفیض تھا(۱) اور بس۔ قطع نظر ان سب امور کے رسالہ گنج اسرار کی حقیقت وحیثیت بھی اپنی جگہ مشکوک ہے۔ اقتباس الانوار مصنفہ شیخ محمد اکرم اور سیر الاقطاب مصنفہ اللہ دیہ نے جو عہد شاہ جہانی کی تصنیف ہے۔ گنج اسرار کے نقائص ظاہر کئے ہیں اور حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ صاحب اقتباس الانوار نے لکھا ہے کہ ''ایں روایت بغایت ضعیف است چرا کہ کتاب گنج اسرار بعضے مجاوران جمع کردہ اند دبران اعتماد نیست''۔ اس صاف وصریح عبارت کی اندھی خوش عقیدگی نے خیر المجالس وسیر العارفین میں یہ تاویل کی ہے کہ ''اس کتاب میں جو اضافہ ہوا ہے وہ مجاوروں کی حرکت ہے اور یہ اضافہ خواجگان چشت کے علم وارشادات کے مطابق نہیں ہے۔ اس اضافہ کا مفہوم خدا جانے کس حرف ولفظ وعبارت سے سمجھا گیا ہے۔ ایسا سمجھنا تدین کے بالکل خلاف ہے۔ اب رہا حضرت والا کا خط جو خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہے۔ جس سے خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ سے ہندوستان میں ملنا ثابت کیا گیا ہے۔ تو یہ خط اس دعویٰ کی تردید ہے۔ اس خط میں شیخ سعدی کے اسم مبارک کے بعد ''میگوئی'' جیسا مشکوک لفظ پایا جاتا ہے۔ جس کی صاحب معین العارفین نے باوجود اپنے کمال کے محض سادگی کی وجہ سے دورازکار تاویلیں کی ہیں۔ لیکن سیاق وسباق سے قطعی معمولی علم والا بھی کہہ سکتا ہے کہ شیخ سعدی لنگوئی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی وہم خرقہ تھے۔ ان دونوں صاحبان یعنی پیر اور خلیفہ کے ہندوستان میں ملنا ایک علیحدہ چیستان ہے۔ اسی لغو بنیاد پر شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال واشعار کا اس رسالہ میں درج ہونا ملاقات کا ثبوت جانا گیا ہے۔ لیکن غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے اس کو بھی کوئی نسبت نہیں۔ اس کتاب میں مولانا روم کے حوالے بھی موجود ہیں۔ جن کی تاریخی حیثیت نہیں مانی جاسکتی۔ اس لئے

1۔ دہلی کے علاوہ التمش اجمیر پہنچ کر ۶۲۴ھ میں حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

کہ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا عہد عروج و کمال بعد میں ہے(1)۔ صاحب معین العارفین نے خود بھی مولانا روم کے حوالہ جات کو مجاوروں کی گستاخانہ دراندازی کہہ کر مسترد کر دیا ہے۔ لیکن شیخ سعدی کے حوالوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اپنی ساری تاریخ دانی کا زور لگا دیا ہے۔ اغلمش ترکستان کا سلطان تھا۔ اس کو پڑھنا منجملۂ کمالات ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ التمش کے بجائے اغلمش کے عہد میں اس کے یہاں اور ہندوستان آئے ہوں گے۔ قیل وقال برطرف شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات خواجہ سلطان الہند سے مان بھی لی جائے تو یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ حضرت والا حضرت شیخ الشیوخ سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے عمر میں کچھ بڑے تھے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ الشیوخ کی ملازمت و بیعت شیخ الشیوخ کی شہرت کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی قابلیت و بزرگی تسلیم کرتے ہوئے بھی حضرت والا پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا گنج اسرار میں شیخ سعدی کا مذکور اس شان سے کرنا جس طرح متقدین صوفیہ کا کیا جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ تحریر حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی نہیں ہے۔ اس کتاب کی چوبیسویں معرفت میں کئی مرتبہ لکھا گیا ہے کہ خواجہ حسن بصری(2) رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ معروف کرخی(3) رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ شفیق بلخی(4)، اور خواجہ ابراہیم ادہم(5) ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے تھے اور ہر ایک نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا۔ یہ اجتماع عالم روحانی میں ہو سکتا ہے اور اس اجتماع کا تصور مادی عالم میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ رسالہ حضرت غریب نواز کی تعلیم، اخلاق، صفائی اور سادگی کا حامل بھی نہیں ہے۔ الغرض یہ رسالہ کسی نے التمش کی خوشنودی کے لئے لکھا ہے تو یہ قطعی ناکام ہے۔ کیونکہ سلطان اس سے مستفیض نہیں ہوا۔ اور اب اگر بربنائے نسبت و عقیدت رسالہ گنج اسرار کے متعلق کچھ لکھا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اس

1۔ مولانا روم کی ولایت ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں ہوئی اور ان کا وصال ۶۶۹ھ/۱۲۶۷ء میں ہوا۔ ان کی عمر حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے وقت ۲۹ سال کی ٹھہرتی ہے اور ان کے کارنامے ان کے بعد کے ہیں۔

2۔ خواجہ حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ

3۔ معروف کرخی متوفی ۲۰۲ھ

4۔ شفیق بلخی متوفی ۱۹۵ھ

5۔ حضرت ابراہیم ادہم متوفی ۱۶۶ھ پیدائش ۶۴ھ

رسالہ کا مادی وجود نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔ بلکہ جو فیض حضرت والا سے التمش کو ہوا اس کا روحانی نام گنج اسرار ہوا اور کتابی شکل جس کسی نے بھی اس کو دی وہ اس شخص کی لیاقت کے مطابق ہے۔ مگر حضرت والا سے اس کو کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی۔

خواجہ عثمان ہرونی کی تشریف آوری ہند کے متعلق جتنے ثبوت ہوسکتے تھے وہ سب ضعیف و بے بنیاد نکلے۔ منکرین تشریف آوری کا انکار بذات خود ایک ناقابل تردید دلیل ہے۔ مرأۃ الکونین کے صفحہ ۲۸۳ پر سلطان شمس الدین کے عہد کو خیر العصر ثابت کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ یورش چنگیزی کے بعد علماء و مشائخ کا یہاں قرآن السعدین ہوا تھا۔ مگر ان بزرگوں کی فہرست میں خواجہ عثمان ہرونی اور شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی شامل نہیں ہیں۔ حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا اگر ذکر نہیں ہے تو وہ یقیناً ان ہنگاموں سے پیشتر آئے تھے اور بدایوں و بنگال میں ان کے کارنامے ان کی موجودگی کے خود گواہ ہیں۔ مگر اس فہرست میں خواجہ ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نہ ہونا سہو خیال نہیں کیا جاسکتا اور ان کا کوئی شمہ برابر بھی کارنامہ یہاں نہیں پایا جاتا۔ تین برس کی مدت قیام بتائی جائے اور کوئی قابل ذکر بات ان کے متعلق نہ لکھی جائے یہ سخت حیرت کی بات ہے۔ القصہ حضرت ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کا ہندوستان آنا گمان کی حد سے باہر نہیں نکلتا اور تشریف نہ لانا یقین کی حدوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اب دریا کوزے میں یوں بند کیا جاسکتا ہے:

۱۔ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک ساتھ آئے اور پھر ہندوستان سے باہر کبھی نہیں گئے۔

۲۔ محاصرۂ ملتان ۶۱۱ھ میں مغل کر ہی نہیں سکتے تھے۔ چنگیز جب لاہور سے واپس گیا تو اس کے لڑکے تولی خاں نے ۶۲۱ھ میں چالیس روز محاصرۂ ملتان کیا تھا۔

۳۔ حضرت والا کے پہلے سفر کی تاریخ وسط ۶۱۲ھ ہوسکتی ہے نہ کہ ۶۱۱ھ۔

۴۔ حضرت والا کا عقد ثانی اوائل ۶۱۶ھ میں ہوا۔ ۶۳۰ھ کی تاریخ غلط ہے۔

۵۔ حضرت والا نے دہلی کا دوسرا سفر اوائل ۶۱۷ھ میں کیا نہ کہ ۶۲۱ھ میں۔

۶۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کا ہندوستان میں آنا قابل تسلیم نہیں۔ بلکہ خلاف واقعہ ہے۔

۷۔ رسالہ گنج اسرار حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے شایان شان نہیں اور نہ ان کی تصنیف ہے۔

۸۔ شیخ الاسلام نورالدین مبارک غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا شیخ الاسلامی پر تقرر ہوا نہ کہ حضرت بسطامی کے بعد۔ کیونکہ حضرت بسطامی بعد میں سلطان ناصر الدین محمود کے عہد کے شیخ الاسلام تھے۔

۹۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کا تقرر ۶۱۵ھ کے قرب وجوار میں ہوا۔ اور ۶۱۶ھ کے وسط میں ان کا حضرت خواجہ قطب صاحب سے اختلاف ہوا پھر اوائل ۶۱۷ھ میں اختلاف دور کرنے کے لئے حضرت والا نے دہلی کا دوسرا سفر کیا۔

۱۰۔ ۶۱۷ھ میں دوسری مرتبہ حضرت والا کے دہلی سے چلے جانے کے بعد شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ بنگال سے تنہا دہلی تشریف لائے اور ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اور انہوں نے دوسرے دن خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جاکر ملاقات کی۔

اس کے بعد ۱۸۔۶۱۷ھ کے واقعات حسب ذیل ہیں:

۱۱۔ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف، تصفیہ کے لئے محضر کی طلبی، نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کی معزولی اور حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی شیخ الاسلامی پر تعیناتی، شیخ جلال تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا بدایوں پہنچنا اور نجم الدین صغریٰ کا دہلی میں انتقال ہونا۔

۱۲۔ ۶۲۱ھ میں محاصرہ ملتان کے وقت حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اور وہاں سے واپسی پر ۶۲۲ھ میں بمقام سلہٹ حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا۔

۱۴۔ شیخ الاسلامی کے فرائض نجم الدین صغریٰ نے دیانت، شرافت، خلوص، بے نفسی اور عاجزی کے ساتھ انجام دیے۔ ان کا علم و اخلاق وسیع تھا۔ راویوں نے ان کی تنگدلی و تنگ نظری کی باتیں لکھ کر اپنی نادانی و جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اختیار کی عینک لگ جانے کے بعد بعض اوقات معاملات کی صورت کچھ چھوٹی بڑی نظر آنے لگتی ہے۔ نگاہ کے اس فرق کا نام ''خطائے اجتہادی'' رکھا گیا ہے۔ نجم الدین صغریٰ کی جرأت اظہار ان کے خلوص و صداقت کی علامت ہے۔ علم حاضر اور علم ماسواء کے تناسب کے بجائے اختیارات کی ادائیگی عجیب قسم کے مغالطے پیدا کر دیا کرتی ہے۔ اس طرح شریعت و طریقت میں کشمکش واقع ہو جاتی ہے۔ ان ہی وجوہات کی وجہ سے ان میں اور خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں اختلاف ہوا۔ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھایا کہ عقل پر فراست کو ترجیح دینا چاہیے مگر اختیارات کی ادائیگی نے انہیں سمجھنے سے معذور رکھا۔ اس کے بعد ضد، مشیت یا نفس کی خاطر نہیں بلکہ اپنے نقطہ نظر کو صحیح سمجھنے کی وجہ نے حضرت جلال تبریزی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نزاع ہو گیا ہے۔ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اختلاف کی معاملہ فہمی کو قدرت کاملہ نے ان کے ذاتی حسن شعور کے سپرد کیا۔ لیکن حضرت تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کے نزاع کے معاملہ میں جب اس بات کی تکرار ہوئی تو حجت پوری ہو گئی اور گرفت کر لی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محضر کے بعد ان کے اختیارات چھین لئے گئے۔ پھر معاملات کی اصلیت و حقیقت ان پر واضح ہو گئی۔ اختیارات کا نقص محسوس کرتے ہی ان کا کام پورا ہو گیا۔ لہٰذا پاک آمد و پاک رفت۔ حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے بجائے اگر فیصلہ کسی ظاہر عالم سے کرایا جاتا تو ممکن ہے کہ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ آخر وقت تک قیل و قال میں مبتلا رہتے۔ ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے متعلق جو بے سر و پا روایات مشہور ہیں وہ قابل قبول نہیں۔ اس لئے کہ ان روایات سے ان حضرات کے علم و مدارج کی توہین ہوتی ہے۔ ان نامعقول روایات کو درایت یک قلم مسترد کرتی ہے۔ نقل اگرچہ مسلسل و متواتر ہی کیوں نہ ہو بغیر عقل کے لغو و مہمل ہے۔ اس قسم کے لغو بیان سے پتہ چلتا ہے کہ

معتقدین کی فہم وفراست، اصل وحقیقت سے کس قدر بعد رکھتی تھی۔

غرض حضرت والا نے اپنے پہلے سفر دہلی کے موقع پر ۶۱۲ھ میں حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو "بختیار" کا خطاب عطا فرمایا(1)۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو خود خلعت دیا۔ اور اپنے خلیفہ سے خلافت دلوائی۔ پھر ۶۱۷ھ میں دوسرے سفر دہلی کے بعد نہایت حسن وخوبی سے اپنے پیر بھائی اور ہم خرقہ شیخ الاسلام کی مشکل آسان کروائی۔

اتنی سی بات تھی اُسے افسانہ کر دیا

1۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ فرغانہ والے اوش کے بختیاری قبیلہ یا خاندان سے خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی تعلق نہ تھا۔

باب ۱۵

دہلی کے دوسرے سفر کے
سترہ برس بعد
۶ رجب ۶۳۳ھ

روئے سحر سیاہ کنید　　　　　یار بایں بہانہ رفت

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ) کی تفسیر بیان کرنا اور سمجھنا نہ آسان ہے اور نہ ہر کہ ومہ کا کام ہے۔ غم ومسرت کا اجتماع عقل کو صامت بنا دیتا ہے۔ ایک دنیا سے دوسری دنیا کے سفر کی کیفیات میں امتیاز کرنے کے لئے بڑے علم، بڑے تجربے، بڑے دل، اور بڑے گردے کی ضرورت ہے۔ حضرت والا صاحبزادوں کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ بی بی جمال صاحبہ کی شادی کی مسرت حاصل کر چکے تھے۔ اپنے خلفاء کے خلفاء تک کو رموز خاص سے آشنا بنا چکے تھے۔ تبلیغ دین کی بنیادیں مستحکم کی جا چکی تھیں۔ اور کار دین حسب مراد چل رہا تھا۔ طلب وشوق نے اس منزل پر پہنچ کر آخری جست کی ٹھہرائی۔ حضرت والا کے پاس سفر آخرت کے لئے بے حد وحساب سامان اور زاد راہ تھا۔ رخت سفر کا اندازہ لگانے کے لئے منور دماغ، مصفیٰ قلب اور چشم بینا کی ضرورت ہے۔ خلوت گاہ میں سیدھے شانہ کے اوپر کی طرف بہت سے صندوق معلق تھے۔ ان سب پر چٹیں چسپاں تھیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس قسم کی تھی۔ عشق مولیٰ، خشیت الٰہی، تلاوت قرآن، الفت رسول، اتباع سنت، مخالفت نفس، دعوت خیر، خدمت خلق، عفو، رحمت، ہمدردی، سوز دل، ایثار وغیرہ وغیرہ۔ الٹے شانے کی طرف محض ایک صندوقچی نما البم سی آویزاں تھی اور اس کے ورق ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کھل کھل جاتے تھے۔ ہر ورق کف دست کی طرح صاف وسادہ تھا۔ ان مین تحریر نام کی ایک لکیر یا ایک بندی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

اس سفر آخرت کے کچھ حالات خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے کسی نے دلیل العارفین کی آخری مجلس میں لکھے ہیں۔ مشہور ہے خاصان خدا اپنے آپ کو لوگوں کے گمانوں میں چھپا لیتے ہیں۔ مگر ان کی بات کا صحیح مفہوم اسی پر مترشح ہوتا ہے جو مخاطب صحیح ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت والا نے اپنی رحلت کی خبر صفائی اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح سنائی کہ اہل صفا میں سے سوائے خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے کوئی اور مفہوم کو نہ پا سکا۔

واقعہ یہ ہے کہ لاہور سے اجمیر آنے کے بعد ایک ایک گھڑی بھاری تھی۔ ''رخ میری طرف نظر کہیں اور'' کے نظارہ سے قیام اجمیر بھرا ہوا ہے۔ اس خاص وقت کے لئے بے تاب و بیقرار تھے۔ مگر بایں ہمہ دل بہ یار دست بکار کے اصول پر اس مدت میں خوبی ولطف کے ساتھ اپنا کام کر کے دکھایا۔ یہ مدت گزاری اور کمال کے ساتھ گزاری۔ جیے اور بھلائی کے ساتھ جیے۔ جیے مگر اپنے لئے نہیں بلکہ غیر کے لئے خدمت خلق قربت الٰہی کی نشانی ہے۔ اس طرح حقیقی معنوں میں جی کر دکھا دیا۔ دنیا کو رونق بخشی اپنے آپ کو فنا کیا۔ اصلی وطن پہنچنے کے لئے بیتاب تھے اور اپنے کام سے فارغ ہو کر پہلی فرصت میں سدھار گئے۔ جناب باری تعالیٰ نے ان وحیات جاوداں مرحمت فرمائی وہ وہاں قربت حق میں زندہ ہیں اور یہاں قلوب خلق میں جلوہ افروز ہیں۔ خود جیے اور دوسروں کو جلایا اور اس شان کے ساتھ کہ ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے''۔ ان کے درد کو دیکھ کر مسیحا بھی انگشت بدنداں تھے کہ بجائے موت کے حیات کے آثار اس میں دکھائی دیتے تھے۔ امام غزالی، امام رازی کی طرح نہ کوئی تصنیف کی اور نہ کوئی تالیف۔ مگر کامیابی و سرخروئی قربان ہو کر رہ گئی۔ تسخیر قلوب محض نگاہ کا کام تھا۔ مقصد پورا کر لینے کے بعد مسافرت میں مسافر کو قیام کی حاجت نہیں رہا کرتی۔ جدائی کی گھڑی آ گئی۔ جس سے کسی کو مفر نہیں۔ فراق ختم ہوا۔ وصل کی بے تابی بڑھی۔ سفر کے لئے آئے تھے سفر درپیش تھا۔ لہٰذا سفر آخرت پر کمر باندھ لی۔

دہلی سے خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بلائے گئے کہ ان کو اپنا جانشین مقرر کر کے خوشی رچائیں۔ سب خوش تھے کہ رسم جانشینی ادا ہو گئی۔ اس روز کی مجلس میں کسی نے ملک

الموت کے متعلق کچھ استفسار کیا۔ جواب میں ایسے کہے کہ سب کچھ بے پردہ کہہ گئے۔ ارشاد ہوا کہ "اس جہان فانی سے اس جہان باقی کا درمیانی فاصلہ طے کرنے کے لئے ایک پل کی ضرورت ہے۔ اسی پل کا نام موت اور ملک الموت ہے۔ ملک الموت دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ اس لئے طلب وشوق کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ ہر آن اور ہر گھڑی ملک الموت کی تلاش کی جائے۔ اس پل سے ہم سب کو گزرنا ہے۔ ہم اجمیر میں اسی لئے آئے تھے کہ ہمارا مدفن یہیں بنے۔ یہی بات آتے وقت ہم نے لاہور میں بھی کہی تھی"۔ استفسار کا جواب ختم ہوگیا۔ مفہوم واضح کر دیا گیا۔ مگر سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "دوست کو خلوص قلب سے یاد کرنا چاہئے۔ خلوص ہی دوست کو متوجہ کیا کرتا ہے"۔ پھر کچھ ٹھہر کر کہا۔ "عارف کا جلوہ مثل آفتاب کے ہوتا ہے۔ اس کی روشنی ہر شے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ کل جہاں کو چمکا دیتا ہے"۔ اس کے بعد حضرت علی سنجری رحمۃ اللہ علیہ کو حکم دیا کہ "مثال لکھیں۔ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دے دیں۔ اور حکم فرمایا کہ حضرت بختیار فوراً دہلی کو روانہ ہو جائیں"۔

خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ مثال مرحمت فرما کر دستار وکلاہ میرے سر پر رکھی۔ زرہ پہنائی، قرآن شریف مصلےٰ اور خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کا عصا عنایت کیا۔ یہ کہہ کر کہ "یہ سب امانتیں تمہیں دی جاتی ہیں۔ ان کا حق ادا کرنا کہ قیامت میں شرمندگی نہ ہو۔ پھر اسی طرح آگے بڑھا دینا۔ اور اپنے جانشین کو دے دینا۔ بس، خدا حافظ، حوالت با خدا کردیم درفتیم"۔ کچھ توقف کے بعد یوں ارشاد کیا کہ "چار چیزیں نفیس گوہر ہیں۔ ان کا برابر لحاظ رکھنا۔ ۱۔ درویشی میں اظہار دولت مندی، ۲۔ گرسنگی میں اظہار سیری، ۳۔ غم میں اظہار مسرت، ۴۔ دشمن سے اظہار دوستی۔

مراسم جانشینی ادا ہونے پر سب لوگ خوش تھے۔ ہر طرف خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ فضا رنگین تھی۔ مگر خواجہ قطب رحمۃ اللہ علیہ کچھ متفکر، کچھ منتشر اور گھبرائے ہوئے سے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ارشاد ختم ہوں اور فوراً یہاں سے چل دیں۔ ضمیر پر مطلع ہو کر حکم ہوا کہ قریب آؤ۔ قریب پہنچنے پر بے تابانہ سر قدموں پہ رکھ دیا اور بے اختیار دل بھر آیا۔ جب حضرت والا

سورہ فاتحہ کی تلاوت فرما چکے تو کہا: ''غم نہ کرو، مردہ نہ بنو''۔ اور یہ کہہ کر رخصت کر دیا اور اسی وقت وہ دہلی کو روانہ ہو گئے۔

ذرا سوچنے کی ضرورت ہے۔ ہر ہر بات کھول کھول کر بتا دی اور علانیہ اشارہ کر دیا کہ ہم دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ ہمیں خلوص سے یاد کرنا، تسکین ہو جایا کرے گی۔ ہماری مثال جلوہ آفتاب کی سی ہے۔ جانشین کو امانت دے کر خود سبکدوش ہو گئے۔ چار باتوں میں دستور العمل واضح کر دیا۔ لیکن سامعین و حاضرین سمجھے کہ روزانہ کی مانند نصیحت و ارشاد ہے۔ معنی اگر کوئی سمجھا تو خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سمجھے۔ جس طرح خطبہ حجۃ الوداع کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمجھا تھا۔ یہ سمجھنے کے بعد حضرت بختیار کاکی اوشی رحمۃ اللہ علیہ کا قلب جب رقیق ہوا تو تنبیہ فرما دی کہ ''دم فرن'' ہمت سے کام لینا چاہئے۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد پانچویں اور چھٹی رجب کی درمیانی شب میں جب محفل برخاست ہوئی تو حضرت والا نے حجرے کو بند کر کے حسب معمول آرام فرمایا۔ آرام کے معنی نیند بھی ہیں اور یاد محبوب بھی۔ تمام شب حسب دستور حجرے سے ذکر کی صدا آتی رہی۔ لیکن خلاف معمول آخر شب میں آواز بند ہو گئی۔ فجر کے وقت جب برآمد نہیں ہوئے تو دروازہ توڑ کر جو دیکھا تو حضرت والا آرام میں تھے۔ چین کی نیند سو رہے تھے۔ اور اہل نظر نے جبین مبارک پر یہ خط انور صاف لکھا دیکھا: هذا حبيب الله مات في حب الله۔ سمجھ لیا گیا کہ دوست کا دوست سے وصال ہو گیا اور ملک الموت نے اپنا فرض منصبی ادا کر دیا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (بقرہ)

یہ ہوش ربا اور اندوہناک خبر خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے دہلی پہنچنے کے بیسویں دن پہنچی تو حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد کی کیفیت طاری ہو گئی اور اسی حالت میں مصلے پر نیند آ گئی دیکھا کہ حضرت والا زیر عرش جلوہ فرما ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے بخش دیا۔ زاد راہ کچھ کام نہ آیا۔ اب فضل ایزدی سے ساکنان عرش کے قریب مقام مرحمت ہوا ہے''۔ بعد انتقال عالم بالا سے حضرت کی یہ اطلاع کہ ساکنان عرش کے قریب مقام مرحمت ہوا ہے۔ حضرت والا کے درجے اور مرتبے کا اظہار کرتی ہے

جو انہیں آخرت میں عطا ہوا۔ عام طور پر اس اطلاع پر نہ غور کیا گیا اور نہ اس کے معنی سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو ملائکہ مقربین کے متعلق لکھا ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ:

بارگاہ اقدس کے فرشتے ہر وقت ان لوگوں کے لئے رحمت طلب کرتے ہیں جنہوں نے اپنے نفس کی اصلاح کی۔ اپنی تہذیب کی اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے سعی کی۔ ان مقربین بارگاہ فرشتوں کی مجلس کو ملاء اعلیٰ اور رفیق اعلیٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

قضاو قدر کے احکام کا بھی اسی ملاء اعلیٰ میں فیصلہ ہوتا ہے۔ اور وہیں سے تمام احکامات کا نزول ہوتا ہے۔ نوع انسانی کے وہ افراد جو دنیوی زندگی میں اپنی اعلیٰ وارفع استعداد اور نیک اعمال سے ملاء اعلیٰ کی مشابہت حاصل کر لیتے ہیں، بعد وفات ملاء اعلیٰ میں شامل کر لئے جاتے ہیں۔ مثلاً انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء عظام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے بعض کامل افراد۔ کتب حدیث سے واضح ہے کہ وفات کے وقت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر آخری کلمہ یہی تھا کہ ''اللھم الرفیق الاعلیٰ''

لہٰذا یہی وہ شرف ہے کہ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کو دربار خداوندی میں حاصل ہوا۔ الحمد اللہ علیٰ احسانہ۔ آنکھ والے ترے جوبن کا تماشا دیکھیں۔

معلوم نہیں کہ اجمیر والوں پر کیسی اداسی چھائی کہ سانس تک نہ لی اور واقعۂ ہائلہ کی تفصیل تک بیان نہیں کی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نزدیکان رابیش بود حیرانی۔ لیکن خدا جانے انہوں نے سینہ کوبی کر کے اپنے سروں پر خاک اپچی کپڑے پھاڑے دل مضطر کو مسوس کر رہ گئے۔ یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح مشاہدہ کرتے ہوئے والہانہ چیخ اٹھے کہ ''وہ سامنے جلوہ گر ہیں۔ انہیں کہتا ہے مردہ کون ہے۔ وہ زندوں کے زندہ ہیں۔

یہاں کے قیام میں حضرت والا کی مادیت کاردنیا سنبھال کر روحانیت کی تکمیل کر چکی تھی۔ اب وہاں کے قیام میں ان کی روحانیت کی بارش یہاں کے مزرعۂ آخرت کی باریاری کیا کرتی ہے۔ وہ اب بھی زندہ ہیں۔

الٰہی ہر کجا باشی بہار آبرو باشی

باب ۱۶

تبلیغ و اشاعت

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اجمیر میں حضرت والا کے قیام کی مدت چالیس سال ہے۔ بشرطیکہ عمر شریف ستانوے سال کی تسلیم کر لی جائے۔ زیادہ عمر ماننے والے اسی نسبت سے اس عرصہ قیام کو دراز کر دیتے ہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق یہ مدت قیام پینتالیس چھیالیس برس کی ٹھہرتی ہے۔ اس عرصہ میں مجاہدات و مشاغل ذاتی کے علاوہ حضرت والا نے اپنی تعلیم کی اشاعت و تبلیغ کر کے ہندوستان میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دکھایا۔ لیکن ان کا طرز تبلیغ لوگوں کے گمانوں میں چھپا ہوا ہے اور واضح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ تبلیغ کے کونسے اشکال و ذرائع اختیار فرمائے۔ تمام تذکرے اس کے متعلق خاموش ہیں اور کسی نکتہ فہم نے بھی اس مسئلہ پر توجہ نہیں دی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت والا نے وہ اصول نہیں برتے جو مولوی یا سیاسی رہنما اختیار کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے وعظ و تذکیر سے کام لیا نہ کہ جلسہ و جلوس کو ذریعہ بنایا اور نہ تحریر و تقریر کے ذریعہ منظر عام پر اشتہار دیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ بیٹھے رہے اور وہ کر دکھایا کہ ایسا کرنے کو منہ چاہئے۔ بعض صاحبان کی رائے ہے کہ فقط قرآن و اشاعتِ قرآن تبلیغ کی صورتیں تھیں۔ لیکن یہ تو حضرت والا کی تعلیم کے جزو اعظم تھے نہ کہ تبلیغ کے ذرائع۔ بعض اہل الرائے کا فیصلہ ہے کہ سماع کی محفلیں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے منعقد کی جاتی تھیں۔ اور یہ بھی نکتہ بتایا جاتا ہے ہندوستان میں چشتیوں کو متعین ہی اسی لئے کیا گیا تھا کہ چشتی اور ہندوستانی دونوں موسیقی کے شائق ہیں۔ صاحب معین العارفین نے بھی صفحہ ۸۲ پر کچھ اسی طرح کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ محض فریب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ صرف چشتی ہی سماع کے قائل ہیں اور محض ہندوستان ہی موسیقی کا رسیا ہے۔ یہ تصور کہ

ہندو صرف گانے پر شیفتہ ہونے کی وجہ سے اپنے آبائی دین و دھرم کو چھوڑ بیٹھے۔ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ پھر یہ سوال یقیناً لاجواب رہے گا کہ سماع کے ذریعہ چشتی بزرگوں نے کب اور کس کو داخل اسلام کیا۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی اپنی جگہ حیرت انگیز ہے کسی تذکرہ نویس نے بھولے سے بھی سماع سنا ہو۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ حضرت والا کے قوالوں کی اولاد اب تک موجود ہے۔ اب اگر انہوں نے سماع سنا تو اس طرح سنا کہ نہ کسی کو خبر ہوئی اور نہ اس محفل کی کیفیت و حالات کا کسی کو پتہ چلا۔ شہادت نہ ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ نزاعی بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سماع کی نوعیت و حقیقت بھی بذات خود قابل لحاظ ہے۔ چشتیوں میں سماع کو مجاہدہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے آتش عشق تیز کی جاتی ہے۔ محفل سماع کے آداب پر بھی غور کرنا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ اغیار ہر طرف سلسلہ کے مبتدی مریدوں کو بھی اس میں شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا سماع و غنا کو ذریعہ تبلیغ سمجھنا قطعی غلط ہے۔ جب سماع ذریعہ تبلیغ نہیں ٹھہرا تو درماندہ عقل نے کرامت کو ذریعہ تبلیغ قرار دے دیا۔ اس سے بدرجہا بہتر ہوتا۔ اگر کہا جاتا کہ ۶۱۷ھ یا ۶۱۸ھ سے اپنے پیر و مرشد کا عرس کیا۔ (جو اب تک جاری ہے جو ہر سال چھٹی عید الفطر کو ہوتا ہے) وہ تبلیغ اور اجتماع کی ایک صورت تھا۔ لیکن اس اجتماع کے شروع کرنے سے پہلے ان کی تبلیغ اپنی کامیابیوں کا کلمہ پڑھوا چکی تھی۔

کون نہیں جانتا کہ اہل ہند اپنی علمیت اور اپنے مخصوص فلسفہ کی بناء پر وعظ و تذکیر اور قصہ خوانی کو اپنا مایہ ناز سرمایہ حیات سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں۔ ان کی چرب زبانی ضرب المثل ہو کر رہ گئی ہے۔ برہمن کی زبان نے ہمیشہ تلوار کا کام کیا ہے۔ لیکن اس سے قلب کو تسکین ہوئی نہ ہوتی ہے۔ عقل ضرور متاثر ہوتی ہے مگر قلب پھر بھی کسی چیز کا منتظر رہتا ہے۔ لہٰذا اندریں حالات یہ یقینی ہے کہ حضرت والا نے ہندوستان کے طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو بھی اختیار نہیں فرمایا۔ ان کا طریقہ جو کچھ بھی ہو وہ ایسا تھا جس سے قلب کو اطمینان حاصل ہو جاتا تھا۔ لہٰذا ایک ہی صورت تھی کہ جس کو انہوں نے اپنا ذریعہ تبلیغ بنایا اور اس کی جدت و لذت نے قبولیت و کامیابی کو سامنے لا کھڑا کیا۔ یعنی اپنے آپ کو شمع بنایا اور شمع خود را میگداز د

درمیان انجمن۔ ہندوستان کے مجدد مسیحا نے اپنے علم وفطرت کی وسیع نگاہ سے تشخیص مرض کی۔ ازالہ مرض کیا اور مقویات بہم پہنچائیں۔ حضرت والا بہ نفس نفیس ہر اپنے اور پرائے کے دکھ درد اور غمی اور شادی میں بے تکلف شرکت فرمایا کرتے تھے۔ کسی مصیبت میں ہمدردی کرنے سے ان کی اپنی ظاہری و باطنی مجبوریاں کبھی مانع نہ ہوسکیں۔ اپنی ہمدردیوں سے ہر ایک کی برابر خیریت لیتے رہتے تھے۔ ہر آئند و روند کی مدارات ان کی خصوصیات میں تھی۔ اخلاق کریمانہ نے دعوت دی اور اثر صحبت نے ہر ایک کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں جواباً بعضوں نے ظاہرداری برتی ہو۔ مگر وہ ظاہرداری عادت بن کر اثر انداز ہوئی اور آخر کار خلوص میں متبدل ہوگئی۔ اسی طرح پوری کی پوری فضا پر حقانیت اور روحانیت غالب آگئی۔ ہر دوست دشمن اور منافق کو ان کی شفقت ورحمت پر اطمینان تھا۔ وہ خود نمونہ بنے اور اپنی صلاح وتقویٰ کی زندگی سے بغیر کچھ کہے سنے مثال پیش کی اور نہایت ہی مختصر اشاروں اور ارشادات سے معتقدین کو عمل پر آمادہ کرلیا۔ اور مشککین کے تذبذب کو فنا کردیا۔ پھر اس نے مجاہدات کروائے۔ اس طرح کہ شاق نہ ہوں اور مشاہدات کی قابلیت پیدا کردی جس کی وقعت نے ہندوستانی منطق، فلسفہ اور توہمات کے کھوکھلے پن کو واضح کر دیا۔ انہوں نے اپنے طرز خاص سے ایسی تسکین عطا فرمائی جس کے لئے قلوب بیتاب تھے اور جو کسی اور جگہ کسی طرح نہیں ملتی تھی۔ شکاری شکار کو نہیں نکلا بلکہ محیر العقول ہے کہ شکار خود سر تسلیم خم کرنے کے لئے حاضر ہوگیا۔ چشمہ شیریں کے گرد مور وملخ ومرغ خود بخود جمع ہونے لگے۔ اسے تسخیر باطن کہا جاتا ہے اور یہ وہی کرسکتا ہے جس کو اس پر عبور ہو۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند۔ باطن کی اصلاح باطن سے کی گئی۔ نتیجہ اس خاموش و دل آویز تبلیغ کا یہ ہوا کہ کسی کو بھی اعتراض کا موقع نہ ملا نہ کسی کو مخالفت کی سوجھی اور نہ کسی کو حسد ہوسکا۔ اور رنگ چوکھا آیا۔ مشککین ومعاندین کو یہ سوال اٹھانے کا موقع نہ ملا کہ مذہبیت قومیت اور وطنیت میں کون سی خوبی قابل ترجیح ہے۔ یہ قلبی تبلیغ ہر قسم کے تعصب سے بے نیاز تھی اور قومیت و وطنیت خود اس پر نثار تھی۔ تاریخ ایک قصہ بھی نہیں بتاتی کہ کسی نے اس تبلیغ پر انگلی اٹھائی ہو یا

حسد سے ہاتھ ملے ہوں اور بغض نکالا ہو۔ نتائج دیکھ کر اگر کسی کو ملال و صدمہ ہوا ہو تو علیحدہ بات ہے۔ مگر کسی نوعیت سے علانیہ مقابلہ کی ہمت اور مخالفت کہیں ظاہر نہیں ہوئی۔ اس طرز تبلیغ کی سند اس تبلیغ نبوی سے ملتی ہے۔ جو ہجرت کے بعد اور حکم جہاد نازل ہونے سے پہلے مدینہ منورہ میں کی گئی تھی۔ اس دوران منافقوں کے ساتھ بھی بذل و احسان سے کام لیا گیا تھا۔ حضرت والا نے صحبت و ہمنشینی کو لازمہ تبلیغ قرار دیا۔ چرب زبانی کے بجائے مشاہدات کو بروئے کار لائے اور اپنی روحانیت سے حصہ وافر عطا فرمایا۔ اس طرح جو مستفیض ہو کر صلاح و تقویٰ میں کامل اترے ان کو اطراف ہند میں بھیج کر اس طرح کی خاموش تبلیغ کا حکم دیا اور اس کی نگرانی اپنے ذمہ رکھی۔ جہاں کہیں کوئی نئی مشکل یا نئی ضرورت پیش آتی تو یا تو متعین مبلغ کو بلا کر ہدایت فرما دی جاتی یا خود اس جگہ پہنچ کر ان مشکلوں کا علاج کر دیا جاتا۔ جیسا کہ دہلی کے سفروں سے ثابت ہے۔ اس خاص تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغیر کسی فتنہ و فساد کے یہاں کا ہر چھوٹا بڑا ذوق قرآنی کا حامل بن گیا۔ ایک طرف حفظ قرآن کو اس قدر مقبول بنا دیا گیا کہ اسلامی ممالک میں مجموعی طور پر اتنے حافظ نہیں مل سکتے جتنے کہ کل ہندوستان میں ہوئے اور بایں صفت برصغیر میں آج بھی ہیں۔ دوسری طرف قرآن کے معانی و مطالب کو عملی طور پر اس طرح ذہن نشین کیا کہ قیل و قال نہ ہونے پائی اور قول و فعل میں یگانگت پیدا ہو گئی۔ نفسانیت و طمع فنا ہو گئی اور ہر طرف سے یہی آواز آنے لگی۔ اپنی وہی ہے خواہش جو خدا کی ہے خواہش۔ خود غرضی، مصلحت اور نام و نمود کو قلوب سے خانہ بدر کر کے اپنے معتقدین کو خدائی مشین کا صحیح اور توانا پرزہ بنا دیا اور یہی وہ خصوصیت ہے جو حضرات شیخین رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے عہد میں عام تھی اور یہی ان کے بار نبوت کے حامل ہونے کا ثبوت تھی۔ اس تبلیغ کو زندہ کر کے حضرت والا نے جو سماں پیدا کیا۔ اس سے نہ صرف مختلف اقوام و مذاہب کے عوام متاثر ہوئے بلکہ خواص و سلاطین بھی اس رنگ میں نظر آنے لگے۔ جب طریقت، شریعت اور حکومت میں اتصال ہو جاتا ہے تو نظام دین و دنیا سنبھل جاتا ہے اور یہی کمال و معراج ہے۔

شریعت کا کمال یہ ہے کہ عنان حکومت بھی اس کے ہاتھ میں ہو اور وہی حکومت قابل فخر و کامیاب ہے۔ جس نے اپنے نظام و احکام میں شریعت و طریقت کی وحدت کا ثبوت پیش کیا ہو۔ جو حکومتیں ہر چند کہ کمال رکھتی ہوں۔ مگر اس وحدت سے بے پرواہوں وہ جلد ختم ہو جاتی ہیں۔ "لا مذہب حکومت" کا تخیل اس بات کا ثبوت ہے کہ یا تو مذاہب میں تحریف ہو گئی ہے یا ان پر صحیح عمل نہیں کیا جاتا۔ لوگوں کی نگاہوں میں کجی آ گئی ہے۔ العظمۃ للہ غلہ کی کمی کی وجہ سے یہ تجویز منظر عام پر کارفرما ہے کہ سلسلۂ توالد و تناسل منقطع کر دیا جائے (1)۔ یہ کج بینی ولا دینی کی بہترین مثال ہے۔ ظاہر ہے کہ مذہب سے بہتر کوئی تہذیب نہیں ہے۔ اور سکون و اطمینان کی بہترین صورت مذہب ہی میں مل سکتی ہے۔

ابتدا میں مسلمان کشور کشا جب ہند میں آئے تو تبلیغ کر کے چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا منشاء حکومت نہ تھا۔ ان کے حملوں کو لوٹ مار سے منسوب کرنا یقیناً کج بینی ہے۔ لیکن بعد کے فاتحین اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہاں کی ذہنیت کچھ عجیب ہے یہاں قول، عمل سے جدا ہے۔ لہٰذا تبلیغ کے استحکام کے لئے قبضہ و تسلط ضروری ہے۔ اس لئے انہوں نے یہاں سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ جب تک حکومت نے شریعت و طریقت کے اتحاد کو ملحوظ رکھا، کامیابی نصیب ہوئی اور جس روز اس اتحاد کو نظر انداز کر کے شریعت کو پابند حکومت بنا دیا گیا اور شریعت کی آڑ میں نفسانیت کا کھیل کھیلا گیا نام مٹ گیا۔ اس بقا و فنا میں طریقت کے معنی روز روشن کی طرح کھل جاتے ہیں کہ وہ نفسانیت کو ابھرنے نہیں دیتی۔ شہاب الدین محمد غوری پہلا فاتح ہند ہے جس نے اشاعت دین کے سلسلہ میں قبضہ و تسلط کو ضروری سمجھا۔ اس کی شہادت ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں ہوئی۔ اس کے بھتیجے محمد غوری کے علاوہ اس کے جانشین چار ترکی غلام تھے۔ یلدوز غزنی میں، قباچہ ملتان میں، قطب الدین ایبک دہلی میں اور بختیار خلجی لکھنوتی (بنگال) میں۔ قطب الدین ایبک نے اپنے حسن تدبیر سے ان سب سے

1۔ حدیث مخبر صادق ﷺ یہ ہے کہ اگر کسی کو مفلسی کی شکایت ہو تو اس کو چاہئے کہ شادی کرے تاکہ اس کی قسمت سے رزق میں فراوانی میسر آ سکے۔

اپنا لوہا منوالیا اور اتحاد و وحدت کو چمکایا۔ اسی وجہ سے سلطان محمد غوری نے ایبک کو سلطان کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ایبک کے خسر یلدوز نے ۶۰۴ھ/ ۱۲۰۸ء میں ملتان پر حملہ کیا۔ ایبک نے اس کا مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کر کے غزنی پر قبضہ جمالیا۔ بعد کو ایبک سے ناراض ہو کر معزول شدہ یلدوز کو اہل غزنی نے پھر دعوت دی تو بغاوت کا حال سنتے ہی ایبک بے نیل و مرام غزنی چھوڑ کر دہلی چلا آیا اور اسی سال ۶۰۶ھ/ ۱۲۱۰ء میں بماہ نومبر چوگان بازی میں گھوڑے سے گر کر راہی ملک بقا ہوا۔ قطب الدین ایبک نے محمد غوری کی سلطنت کی ہندوستان میں جڑیں مضبوط کیں۔ دہلی کی جامع مسجد بنوائی۔ قطب مینار کی تعمیر شروع کی جس کی تکمیل بعد میں التمش کے ہاتھوں ہوئی۔ جملہ مؤرخین متفق ہیں کہ ایبک عادل و منصف مزاج تھا۔ اس کے چار سالہ عہد میں امن سکون رہا۔ راہزنوں اور ڈاکوؤں کی اس نے خاص طور پر بیخ کنی کی۔ رعایا خوش حال رہی اور ہندو قطعی مطمئن تھے۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے اسے ''لاکھ بخش'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا آرام شاہ برائے چندے تخت نشین ہوا۔ پھر ۶۰۸ھ/ ۱۲۱۲ء میں ایبک کا منہ بولا بیٹا اور داماد جو بدایوں کا گورنر تھا، جس کو شمس الدین التمش کہتے تھے، بادشاہ بنایا گیا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی جملہ صوبوں کے گورنر کھل کھیلے لیکن سب کو نیچا دیکھنا پڑا۔ التمش نے سلطنت کو پائیدار بنایا۔ شریعت کے احکام نافذ کیے۔ قوم و مذہب کی تفریق میں مساوات پیدا کی۔ اونچ نیچ کو مٹایا، خلافت عباسی سے خلعت حاصل کیا۔ چنگیز خاں کے خلاف جلال الدین خوارزمی کو اپنے ملک کے امن کی خاطر مدد دینے سے انکار کیا۔ التمش کے عہد میں ہر لحاظ سے ہندوستان جنت مثال بن گیا تھا۔ اس کا انتقال ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء میں ہوا(1)۔ یہ مسئلہ

1۔ مولانا شرر لکھنوی کی تحقیق ہے کہ خواجہ غریب نواز اور سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ۶۳۳ھ میں ہوا۔ لیکن یہ عام روایت کہ التمش نے وصیت کے مطابق خواجہ قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ اس تحقیق کی تردید کر رہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال کب ہوا۔ ان کے وصال کی تاریخیں ۶۳۳ھ، ۶۳۴ھ اور ۶۴۱ھ لکھی ہوئی ہیں۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۷۰ پر درج ہے کہ جب نظام الملک مہذب الدین وزیر نے سلطان معز الدین بہرام شاہ کے خلاف امراء کو بھڑکایا تو (بقیہ آگے)

خارج از بحث ہے کہ اس کی اولاد شریعت وطریقت کی وحدت کو پوری طرح نہ نباہ سکی۔ لیکن پھر بھی یہ غوری حکومت ۱۲۹۰ء تک رہی۔

بہر حال شہاب الدین محمد غوری، قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش تینوں خواجہ بزرگ کے معتقدین میں سے تھے۔ التمش کو خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصیت کے ساتھ فیض پہنچا تھا بلکہ وہ ان کا مرید اور خلیفہ بھی تھا۔ شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اور بروایت غلط خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مشائخ اور علماء کی مہمان نوازی کی سعادت کا فخر اس حاصل تھا۔ تاریخ اعلان کر رہی ہے کہ اس عہد میں ہندوستان کی مسلمان حکومتیں پابند شریعت تھیں اور ہندوستان میں حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے دم قدم سے اولین عہد صحابہ کی طرح طریقت وشریعت اور حکومت کا اتصال وجود میں آیا تھا۔ اس عہد میں ایک طرف سلاطین ظاہر نے شریعت کی اشاعت کی اور دوسری طرف شہنشاہان طریقت نے شریعت کی تبلیغ فرمائی۔ اور ہندوستان کو

(بقیہ گزشتہ) ۶۴۱ھ/ ۱۲۴۴ء میں شیخ الاسلام خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی برائے تسلی امراء فرستاد۔ اس بیان کی سند پر ان کا سال وصال ۶۴۱ھ لکھا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد صفحہ ۷۴۳ پر فرشتہ ناقل ہے کہ جب ۶۵۵ھ میں قتلغ خان اور کشلی خان نے متحد ہو کر سلطان ناصر الدین محمود سے مقابلہ کیا تو حضرت خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی شمس الدین بہرائچی نے قتلغ خان اور خان کو خفیہ خطوط لکھے کہ دہلی والے تمہاری مدد کو تیار ہیں۔ اس بیان میں قطب الدین اور شمس الدین دو شخصیتیں موجود ہیں۔ لہٰذا نماز جنازہ کی روایت ان ہی دونوں کے متعلق ہوگی۔ فرشتہ کے ان دونوں بیانات کی وضاحت طبقات ناصری سے ہو جاتی ہے کہ بہرام شاہ کے عہد میں سید قطب الدین شیخ الاسلام تھے۔ جو ۶۴۱ھ میں امراء کے پاس مفاہمت کے لئے بھیجے گئے تھے۔ ۶۵۳ھ میں جب سلطان ناصر الدین محمود نے ان سید قطب الدین کو معزول کر کے شیخ جمال الدین بسطامی کو عہدہ شیخ الاسلامی پر مقرر کر دیا تو معزول شدہ قطب الدین نے قاضی شمس الدین بہرائچی سے ساز کر کے سلطان کے خلاف سازش کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان قطب الدین کو خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سمجھنا محض مغالطہ ہے۔ لیکن بایں ہمہ فرشتہ نے خواجہ قطب صاحب کا وصال ۶۳۴ھ میں بھی لکھا ہے۔ اور یہی صحیح بھی ہے۔ چشمہ کوثر کے صفحہ ۲۱۸ پر بھی یہی سال وصال تحریر ہے۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال خواجہ غریب نواز اور سلطان شمس الدین التمش کے وصال کے دو ڈیڑھ برس بعد ہوا۔ لہٰذا یہ بالکل غلط کہ التمش نے حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کی نماز پڑھائی اور مولانا ناشر لکھنوی کی تحقیق اپنی جگہ صحیح ہے۔

سکینت و طمانیت حاصل ہوئی۔ ایسی جیسی کہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جملہ سلاسل طریقت اس حقیقت واقعی کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے معترف ہیں۔ اسی لئے تعلیم چشتیہ کی جدت و رفعت کا قیاس کیا جاسکتا ہے اور یہی وہ مشاغل و معمولات تھے جن کے رائج کرنے کے لئے قیام اجمیر کے زمانے میں حضرت والا نے توجہ فرمائی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب کہ خوارزمی اور دیگر اسلامی سلطنتوں پر وسط ایشیاء میں چنگیز خاں نے قہر الٰہی کا تازیانہ بن کر قیامت خیز اور ہوش ربا حملے کئے تھے اور وسط ایشیاء کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ علماء و مشائخ وہاں سے بھاگ کر دار الامان ہندوستان آئے اور ان کو حکومت و طریقت نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور سر آنکھوں پر بٹھایا۔ یہ علماء و مشائخ جتنے حضرت والا اور ان کے دیکھنے والوں کے سامنے ادب زانوئے ادب تہہ کرتے ہوئے آئے اور کسی نے ان کی تعلیم پر کسی نوعیت سے انگلی تک نہیں اٹھائی۔ ہندوستان اپنی سعادت پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ لیکن اگر قوم پرست اور وطن پرست اس سعادت و فخر کو ہندوستان کی اپنی میزبانی کا ذاتی وصف سمجھیں تو وہ یہ بھی نگاہ میں رکھیں کہ تاریخ ان کی سمجھ کی تائید نہیں کرتی۔ بے شک ہندوستان نے متعدد مرتبہ باہر سے آنے والوں کی تواضع کی ہے۔ لیکن غور طلب یہ ہے کہ وہ جملہ مہمان کیسے تھے اور تواضع کا نتیجہ کس شکل میں سامنے آیا۔ اس مرتبہ کے آنے والوں نے تباہ کرنے کے بجائے وسیع نقطہ نظر سے اخلاق کے ساتھ ہندوستان کی مہربانی کا حق ادا کیا اور خدمت کر کے اس میں چار چاند لگائے۔ اس وجہ سے اس عہد کو خیر العصر کہا جاتا ہے۔ اس جامع انسانیت مہمانوں کی تواضع جس فراخدلی سے کی گئی وہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ یہ حضرت والا کی تعلیم کا ہی صدقہ تھا کہ نگاہ کو وسیع بنا دیا۔ بیجا نہ ہوگا اگر یہ بھی ظاہر کر دیا جائے کہ یہ مہمان گندے ماحول سے اس وقت آئے تھے جب کہ قہر الٰہی اس گندگی کو سوخت و فنا کر رہا تھا۔ یہاں پناہ گزین ہو کر موقع پاتے ہی بعد میں اکثر صاحبان اپنے گندے اثرات کو ظاہر کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں بھی اسی قسم کا انحطاط رونما ہو گیا۔ جس سے نکل کر وہ آئے تھے۔ بہر حال حضرت والا کے سلوک و اخلاق کی داستانیں یہیں پر ختم نہیں

ہوتیں بلکہ خلوص وصداقت کی بہترین مثال یہ ہے کہ سنجری اجمیری بن گیا۔ ہندوستانی وطنیت قبول کر کے اور یہاں کی تنگ نظریوں اور چرب زبانیوں کا دفعیہ کر کے جو فیض ہندوستان کو پہنچایا وہ آج بھی جاری ہے۔ اور نمایاں طور پر پنج شیلا وغیرہ سے افضل ہے۔ کیا یہ زندہ کرامت اور وطنیت کی اصلی علامت نہیں کہ آج بھی ان کے دربار میں حاضر ہوتے ہی تنگ نظری رخصت ہوجاتی ہے۔ اور تمام قومیں ایک ہی رسی میں بندھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لارڈ کرزن کا مشاہدہ کس قدر بصیرت افروز اور حقیقت سے لبریز ہے کہ "ہندوستان میں ایک قبر حکومت کر رہی ہے"۔ اور یہ مشاہدہ واقعی بیدار مغز ویسرائے ہندوستان ہی کر سکتا تھا۔ آج بھی اگر حضرت ہندالولی کی تبلیغ کا اتباع ہوجائے تو جتنی "از میں" ہیں وہ سب ایک بن سکتی ہیں۔ ہم لاکھ مردہ سہی مگر ہماری تعلیم زندہ ہے۔ لہٰذا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

باب ۱۷

سماع(1)

مارا بہ مستی افسانہ کردند پیرانِ جاہل شیخان گمراہ

محض امتثال امر کے لئے اختصار کے ساتھ مسئلہ سماع کے متعلق کچھ عرض کر دینا ضروری ہے۔ سماع سے مدعا صرف اس قدر ہے کہ عشق الٰہی کی آگ تیز ہو۔ خدا کی یاد بڑھے اور دل نرم پڑیں۔ بزرگان دین نے اس مسئلہ میں جو فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے:

امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گانا سنا خود بھی گایا اور گانے والے کو اچھی طرح بتایا بھی۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ علماء عرب میں ایسا کون ہے جو راگ کو مکروہ سمجھے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ غنا نہ گناہ کبیرہ ہے نہ صغیرہ بلکہ جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے کوئی ظاہری روایت راگ کے حرام ہونے میں نہیں ہے بلکہ دونوں صاحبان کا راگ سننا ثابت ہے۔

امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اپنے پڑوسی کا گانا سنتے تھے اور جب وہ کسی معاملہ میں گرفتار کرلیا گیا تو اسے چھڑا کر لائے۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی صالحہ کے یہاں گانا سنا اور فرمایا: ''جب لوگ برائی کی آمیزش سے سنیں تو حرام ہے''۔ حضرت امام غزالی نے لکھا ہے کہ سماع کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ اور نہ قیاس۔ امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ، امام نووی ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن طاہر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ممانعت سماع کی حدیثیں ثابت الاصل نہیں، بلکہ موضوع ہیں۔ حرمت سماع لہو کے ساتھ مقید ہے۔ حدیث کے مقابلہ میں فقہ پر عمل نہیں کیا جاتا۔ حرمت کو اس وقت ترجیح دی جاتی ہے جب کہ

1۔ رسالہ سماع وغنا سے جو مصنفہ مولانا سید امیر پنجابی مہاجر اجمیر ہے جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے ہیں۔ یہ باب ماخوذ کر کے لکھا گیا ہے اور اسی کا خلاصہ ہے۔

حرمت اور اباحت کا ثبوت برابر ہو۔ لیکن اباحت احادیث صحیحہ سے ثابت ہو اور حرمت دلائل فقہیہ سے ثابت کی جائے تو اباحت پر اعتقاد واجب ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا قطعی فیصلہ ہے کہ اگر اباحت ایک واقعہ سے ثابت ہو جائے تو حرمت کے متعدد واقعات کو دوسرے اسباب پر محمول سمجھا جائے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو قرآن پڑھ کر سناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کو پڑھ کر سناؤں۔ حالانکہ وہ خود آپ پر نازل ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ ''میں یہی چاہتا ہوں کہ دوسرے کی زبان سے سنوں''۔ میں نے آپ کو پڑھ کر سنایا اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ اس وقت آپ کے چشم مبارک سے آنسو بہنے لگے۔ روایت کیا اس کو بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ امر طبعی یہ ہے کہ کسی چیز کے پڑھنے سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو دوسرے سے سننے پر حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی نکتہ ہے کہ تقویت حال یا تجدید شوق اور تحصیل جمعیت کے لئے دوسرے شخص کو سماع کے لئے تجویز کیا جاتا ہے۔ البتہ سماع کی بعض صورتوں کا ناجائز ہونا دوسری بات ہے۔

اب متعدد اور واضح حدیثوں کو لکھنے کے بجائے ایک ایسی حدیث پیش کی جاتی ہے جس کو فریقین اپنے دعویٰ کی دلیل بنا سکتے ہیں۔ لیکن سمجھنا یہ ہے کہ حق، اباحت کی طرف ہے یا حرمت کی جانب۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی غزوہ سے واپس آئے تو ایک سیاہ رنگ کی کنیز آئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم میں نے نذر مانی تھی کہ اگر خدا آپ کو صحیح و سالم واپس لائے گا تو میں آپ کے سامنے دف بجا کر گانا سناؤں گی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو نے نذر مانی تھی تو گا ورنہ نہیں''۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے وہ گاتی رہی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تشریف لائے وہ گاتی رہی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لائے وہ گاتی رہی۔ مگر

جب آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو دف کو اس نے سرین کے نیچے رکھ دیا اور اس پر بیٹھ گئی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے عمر! تم سے شیطان ڈرتا ہے۔ میں بیٹھا رہا وہ گاتی رہی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تب بھی بجاتی رہی۔ پھر علی کرم اللہ وجہہ آئے وہ بجاتی رہی۔ عثمان رضی اللہ عنہ آئے وہ بجاتی رہی۔ اے عمر! رضی اللہ عنک جب تم آئے تو اس نے دف کو رکھ دیا"۔ یہ حدیث ترمذی اور ابوداؤد سے روایت کی گئی ہے۔ اس سے آنحضرت ﷺ اور خلفاء راشدین کا دف کے ساتھ گانا سننا ثابت ہے۔

حدیث شریف ہے کہ گناہ کی اس چیز کی جو اپنے قبضہ میں نہیں ہے۔ نذر پوری کرنا نہیں چاہئے۔ اس مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ کنیز کی نذر صحیح تھی۔ دف کے ساتھ گانا جائز ہے اور عورتوں سے راگ سننا درست ہے۔ (بشرطیکہ فتنہ کا خوف نہ ہو)۔ لیکن اسی حدیث سے منکرین کا کہنا یہ ہے کہ راگ فعل شیطانی ہے کہ اسی وجہ سے اس کنیز کو شیطان کہا گیا۔ اگر یہ مفہوم صحیح ہے تو خدارا بتائیے کہ اس کے مرتکب کون ہوئے۔ اگر ان سننے والوں کو مرتکب سمجھا جاتا ہے تو ایسا سمجھنا علانیہ کفر ہے۔ لہٰذا عقل سلیم یہ سمجھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اس ارشاد سے بس یہ مطلب تھا کہ اے عمر! عورت کیا چیز ہے تم سے شیطان بھی ڈرتا ہے۔ لیکن اگر گانے کی وجہ سے اس کنیز کو شیطان کہا گیا تو پھر ان حضرت والا تبار نے اس کا گانا کیوں سنا۔ عقل سلیم اس حدیث سے اباحت کا ہی پہلو نکالے گی نہ کہ حرمت کا۔

اے پیغمبر! ہمارے ان بندوں کو خوشخبری سنا دو جو کلام کو سنتے ہیں اور اس کی اچھی باتوں پر چلتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے نیک ہدایت دی ہے اور یہی عقل سلیم بھی رکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

اس آیت پاک میں لفظ "قول" عام ہے اور اس جگہ اس کا کوئی تخصص نہیں ہے جس کی وجہ سے اچھی آواز، گانا یا دف کا سننا ممنوع ہو سکے۔ یہ تینوں کام حضرت ﷺ کے سامنے ہوئے۔ انہوں نے جائز رکھے۔ جیسا کہ بخاری، مسلم اور احمد وغیرہ کی روایات سے بھی ظاہر ہے۔

بہر حال سماع مباح ہے اس کی شرطیں بھی سمجھ لینا چاہئیں۔ جس کی پابندی چشتیوں نے خاص طور پر کی ہے۔

۱۔ مسمع (سنانے والا) کی قید یہ ہے کہ کودک نہ ہو اور عورت نہ ہو۔

۲۔ مستمع (سننے والے) یاد حق سے خالی نہ ہوں۔ نفس سے مالوف نہ ہوں۔ ہم مذاق ہوں۔ اشعار کے معنی کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر ان کا ذہن ان کے معانی کو حق کی طرف منتقل کر سکے۔

۳۔ مسموع (جو سنایا جائے) فحش اور مسخرہ پن نہ ہو۔

۴۔ آلہ سماع۔ مزامیر مثل چنگ ورباب کی ممانعت ہو۔

۵۔ محفل سماع محفوظ و پاک ہو، اغیار سے خالی ہو، اور مبتدی مرید بھی شریک نہ ہوں۔

ان احتیاطوں کے ساتھ سہروردی اور چشتی سماع کے قائل ہیں۔ قادری اگرچہ شائق نہیں لیکن اگر شامل سماع ہو گئے ہوں تو محفل سے اٹھ آنے کو خلاف ادب سمجھتے ہیں۔ خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا سماع کے متعلق ارشاد ہے: ''نہ انکاری کنم نہ ایں کاری کنم'' مرزا مظہر جان جاناں شاعر ہونے کے علاوہ سلسلہ نقشبندیہ کی زبردست کڑی ہیں فرماتے ہیں: ''سماع سے رقت پیدا ہوتی ہے اور رقت رحمت کو کھینچتی ہے''۔ حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ در فوائد الفواد تلاوت وسماع در یک عبارت اظہار نمایند فرمایند کہ ''در حالت تلاوت وسماع سعادتے کہ حاصل می شود آں بر سہ قسم است، انوار است، احوال است و آثار است۔ وآں از سہ عالم نازل می شود از ملک، ملکوت و جبروت و بر سہ جا فرد دمی آید، بر ارواح، قلوب و جوارح''۔

ایسا سماع نہ تفریحی ہے اور نہ ذریعہ تبلیغ بلکہ ایک قسم کا مجاہدہ ہے۔ اب اگر چشتیوں کے اس مجاہدہ کو دیگر سلاسل یا اندھی تقلید کرنے والوں نے ذریعہ تبلیغ اور مجمع کو جمع کرنے کا وسیلہ بنا لیا ہو تو چشتی اس حرکت و بدعت سے بری الذمہ ہیں۔

حضرات نقشبندیہ عام طور پر سماع کے قائل نہیں معلوم ہوتے اور منکر سماع ظاہری ہیں۔

کیونکہ وہ اپنی ریاضت اور فضل الٰہی سے سماع باطنی سنتے ہیں۔ ان کے کانوں میں منظوم و متفقہ تن تن کی آواز آتی ہے۔ اور تمام رگ و پٹے میں سرایت کر کے ان کو وجد میں لے آتی ہے۔

اب فرق صرف اتنا رہ گیا کہ چشتی اس روحانی موسیقی کو ظاہری سماع سے بھی تقویت پہنچاتے ہیں اور نہ قابل گرفت ہے اور نہ قابل اعتراض ہے۔

یہ سن کر کہ سماع پر اعتراض کیا گیا ہے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا وہ اپنی نوعیت سے وزنی، قوی، مسکن اور عین فطرت ہے۔

سبحان اللہ یکے سوخت وخاکستر شد

و

دیگر ہنوز در اختلاف است

باب ۱۸

تصنیف وتالیف

جو پڑھا لکھا تھا نظام نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

العلم حجاب اکبر

حضرت والا کے تبحر علمی میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ نیشاپور، سمرقند اور بخارا میں اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ اور فضلیت کی سندیں حاصل کی تھیں۔ تبحر علمی کو مدنظر رکھ کر تصنیف وتالیف کا تخیل جمانا قرین عقل ہوسکتا ہے۔ مگر خواجگان چشت کو مخالفت اور پردہ پوشی نے اسم ورسم سے بیگانہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا ان کا طریقہ برملا اعلان کر رہا ہے۔ ما انچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم، الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم، حدیث یار حاصل علم ٹھہری اور رجوع الی الاصل اس سے مراد لی گئی ہے۔ اس لحاظ سے وہ گفتنی نہیں رہی بلکہ عمل بن کر معمولات میں شامل ہوگئی اور جزوروح بن گئی۔ بات جب ایسی ہو تو ان کا عمل اور طریق کار ہی ان کی تصنیف ہے۔ محبت حق میں یہ صاحبان اس قدر محو ہوئے کہ اخلاق اور اس کے زوائل وفضائل مہلکات ومنجیات اور از یں قبیل تصوف کے دوسرے مسائل پر انہوں نے کوئی کتاب لکھی ہی نہیں (1)۔ قیل وقال کی تصنیف کے متعلق اگرچہ بڑی گنجائش ہے مگر اس کا حاصل ووصول کچھ نہیں۔ حضرت محبوب الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا صاف وصریح ارشاد گرامی اپنی جگہ اٹل ہے کہ من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام زیرکہ شیخ الاسلام فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ وشیخ الاسلام قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ واز خواجگان چشت ہیچ شخصے تصنیف نہ کردہ است (2)۔ یہ بزرگ اپنے دستور کے

1۔ منقول از نظام تعلیم وتربیت حصہ دوم صفحہ ۱۵۲ مصنفہ مولانا سید مناظر الحسن گیلانی۔

2۔ حمید شاعر قلندر نے خیر المجالس میں تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ ملفوظات بھی بعد میں کسی اور نے لکھے ہیں اور ان حضرات سے منسوب کر دیے ہیں۔

مطابق اپنی تعلیم کو اس درجہ عملی اور آسان بناتے تھے کہ تحریر سے بے نیاز ہو جاتی تھی اور وہ خود اس تعلیم کے محافظ و نگران ہوا کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ حضرات حکایات کے ذریعہ افہام و تفہیم کرتے تھے اور اس طرز میں اتنی جامعیت ہوتی تھی کہ اور کسی طرح ممکن نہ تھی۔ اس طرح مفہوم ادا کرنے سے ذاتی نمائش اور ناصح بننے سے بھی گریز کی صورت نکلتی تھی اور مخاطب کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ خود مطلب نکالے اور اندھی تقلید سے محفوظ رہے۔ ان حکایات سے ان اصحاب کے تدبر و تفکر کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی جامعیت کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ مگر یہی حکایات جب نقل کی گئیں تو کیفیت جاتی رہی۔ ناقل موقع و محل کی تشریح کرنے اور غوامض سے بہرہ یاب ہونے سے قاصر ہے اور پھر ان میں کسی نہ کسی طرح تصرف بھی ہو گیا۔ اس اظہار حقیقت کے بعد ملفوظات کی جو ان حضرات سے منسوب ہیں، کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ ان ملفوظات کے مطالعہ سے ان صاحبان کے طرز کی خصوصیات کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ ان کی روایات میں اختلاف بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیم بھی ان سے واضح نہیں ہوتی اور نہ کوئی ایسی بات ملتی ہے جس سے ان کی زندگی کے حالات و واقعات معلوم کرنے میں مدد مل سکے۔ منتشر اور بے ربط حکایات بغیر کسی مقصد کے ان ملفوظات میں جمع کر دی گئی ہیں۔ نقل در نقل کرنے والوں نے کسی خاص اصول و تربیت کا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ ان ملفوظات کو چونکہ ان حضرات سے منسوب کیا گیا ہے اس لئے اس نسبت اور جملہ تذکرہ نگاروں کی بنیاد تذکرہ ہونے کی وجہ سے ان کو وقعت دی جا سکتی ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔

انیس الارواح اور گنج الاسرار دونوں حضرت والا سے منسوب ہیں۔ مگر ان دونوں میں اختلاف موجود ہے۔ یہی اختلاف صاحب نسبت کی تصنیف ہونے کے مانع ہیں اور پھر ان میں بعض مسائل و امور غلط بھی ہیں جن کو صحیح نہیں مانا جا سکتا۔

دیوان

جس کو حضرت والا سے نسبت دی جاتی ہے وہ باتحقیق ملا معین کاشفی ہروی کے جذبات

کا آئینہ ہے اور حضرت والا کے واردات، جذبات، خیالات، تعلیم اور طرز سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔ ملا معین نویں صدی ہجری کے مشہور واعظ تھے۔ ان کی شہرت و عزت معارج النبوۃ کی تصنیف کی وجہ سے ہوئی۔ اب اگر اس دیوان کو حضرت والا سے کوئی تعلق ہے تو اس کی سند ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے حالات سے پیش کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ نویں صدی ہجری سے پہلے کسی نے بھولے سے بھی حضرت والا کے کسی دیوان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور نہ کوئی دیوان ان سے منسوب کیا گیا ہے۔

خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے حضرت والا کے چند خطوط ہیں۔ ان مکتوبات میں کچھ روح معلوم ہوتی ہے اور سنا ہے کہ ہر بعد والا پہلے خط سے القاب کی خصوصیت کی وجہ سے ان کے مدارج کا بھی اظہار کرتا ہے۔ بہر حال تصنیف کرنے اور نہ کرنے کی بحث کو ترک کر کے یہ بہتر ہے کہ حضرت والا کے ارشادات اور کارناموں پر تدبر کیا جائے اور اوصاف حمیدہ کا لحاظ رکھتے ہوئے خبر سے مبتدا کا سراغ لگایا جائے۔ لیکن پھر بھی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد نتیجہ یہی نکلے گا کہ مشکل حکائیت کہ تقریری کلیم اور کہنا پڑے گا۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چین بہار تو زدامان گلہ دارد

باب ۱۹

ارشادات

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

این شربت عاشقیت خسرو　　　　بے خون و جگر چشید نتواں

حضرات صوفیہ کے کلمات قدسی ہزاروں وعظ و تذکیر سے افضل ہوا کرتے ہیں۔ دل سے نکلتے ہیں دل پر اثر کرتے ہیں۔ مفہوم کا عطر ہوتے ہیں۔ ظاہر و باطن پر محیط ہوتے ہیں۔ عمومیت کے ساتھ خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ ہر قول قرآن و حدیث کا ترجمان ہوتا ہے۔ فکر ہر کس و ناکس بقدر ہمت اوست، کے مطابق ہر دماغ اپنے نقطہ نظر سے مطلب سمجھ کر تشفی حاصل کیا کرتا ہے۔ یہ جامعیت کی دلیل ہے۔ لاتعداد پوست اتارنے کے بعد مغز تک رسائی ہوتی ہے اور ہر پوست اتارنے کے بعد مرید و معتقد کی واقفیت و علمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت والا کے ارشادات گرامی کا اگر پس منظر بھی پیش کیا جاسکے تو تاثیر کی خوبی بجلی کی طرح آنکھوں کے سامنے کوند جائے۔ ان ارشادات سے حضرت والا کے فکر و تدبر اور اصول و مذاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انہیں کا اتباع معتقدین کے فرائض میں داخل تھا اور ذوق صحیح آج بھی ان سے اکتساب کرسکتا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کچھ ارشادات یہ ہیں:

فرمایا کہ راستہ چلنے والوں کے لئے اول راہ شریعت ہے۔ جب طالبان راہ شریعت میں رہیں اور ذرہ برابر تجاوز و تفاوت نہ کریں تو طریقت تک پہنچتے ہیں۔ پھر جب اس مرتبہ پر قائم ہوجاتے ہیں اور فرمان طریقت سنت سابقین پوری طرح سے بجالاتے ہیں تو مرتبہ معرفت تک پہنچتے ہیں اور جب اس مقام کی روشنی اور شناخت پیدا ہوجاتی ہے اور ثابت قدم ہوجاتے ہیں تو مرتبۂ چہارم یعنی حقیقت میں گذر ہوتا ہے۔ اس مقام کو طے کرنے کے بعد

مراد حاصل ہوتی ہے۔(دلیل العارفین)

بعض ارشادات متعلق شریعت

ا۔جو باوضو ہوتا ہے اس کی روح زیر عرش تک پہنچتی ہے۔

۲۔ بارگاہ خداوندی میں نماز سے قرب حاصل ہوتا ہے۔نماز عبد و معبود کے درمیان راز ہے اور معراج المومنین ہے۔

۳۔نماز میں جس قدر اطمینان، حضوری اور مشغولی ہو، اس قدر قرب الٰہی حاصل ہو۔

۴۔قرآن مجید کا دیکھنا ثواب، پڑھنا اور سمجھنا ثواب ہے۔حرف پر نگاہ پڑے دس بدیاں دور ہوں اور دس نیکیاں درج ہوں، آنکھ کی روشنی بڑھے اور آنکھ کی بیماریوں سے نجات ملے۔

۵۔جس نے کعبہ کی زیارت کی اس کو حج کے ثواب کے علاوہ ایک ہزار برس تک کی عبادت کا ثواب بھی ملے گا۔

۶۔جس نے نعمت پائی سخاوت سے پائی۔

۷۔حاجت روائی کے لئے الحمد شریف بکثرت پڑھنا چاہئے۔

۸۔بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھلانا، غرباء کی فریاد سننا اور حاجت روائی کرنا، درماندوں کی دستگیری کرنا عذاب دوزخ سے بچنے کی بہترین تدابیر ہیں۔

۹۔جو ورد یا وظیفہ مقرر کیا جائے وہ اگر دن میں نہ ہو سکے تو رات میں پڑھنا چاہئے۔ ورد کا تارک لعنتی ہوتا ہے۔

۱۰۔نیکوں کی صحبت نیک کام سے بہتر ہے اور بدوں کی صحبت بدکام سے بدتر ہے۔

۱۱۔حدیث رسول ہے کہ وہ ضعیف ترین ہے جو اپنی بات پر قائم نہ رہے۔

۱۲۔گناہ اتنا نقصان نہیں پہنچاتا جتنا مسلمان بھائی کو ذلیل و خوار کرنا۔

۱۳۔قبرستان میں کھانا پینا اور ہنسنا نہیں چاہئے۔ کیونکہ یہ مقام عبرت کا ہے اور جو ایسا

کرتے ہیں وہ سنگدل اور منافق ہوتے ہیں۔

۱۴۔ بدبختی کی علامت یہ ہے کہ گناہ کرکے امیدوار قبولیت رہے اور گناہ کو ہیچ سمجھے۔

۱۵۔ اگر کافر سو برس تک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (صافات: ۳۵) کہے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ مگر صدق دل سے ایک مرتبہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (فتح: ۲۹) کہنے سے کفر مٹ جاتا ہے۔

چند ارشادات متعلق طریقت

۱۔ خود پرستی ونفس پرستی ہی دراصل بت پرستی ہے۔ اس کو ترک کرنے کے بعد خدا پرستی کی منزل شروع ہوتی ہے۔

۲۔ عادت پرست حق پرست نہیں ہوتا۔

۳۔ خود پسندی گناہ کبیرہ ہے۔

۴۔ بغیر تربیت مرشد منزل پہ رسائی مشکل ہے۔

۵۔ سب وقتوں میں عمدہ وقت وہ ہے جو وسوسوں اور خطرات سے پاک ہو۔

۶۔ دنیا میں دو چیزیں خوشتر ہیں۔ صحبت فقراء اور حرمت اولیاء۔

۷۔ خدا کا دوست وہ ہے جس میں تین وصف ہوں: سخاوت دریا جیسی، شفقت آفتاب کی طرح اور تواضع زمین کی مانند۔

۸۔ دوستی اس کا نام ہے کہ ذکر دل سے کرے۔ دل یاد اور ذکر کے لئے ہی بنایا گیا ہے۔

۹۔ بندۂ مومن تین چیزوں کو دوست سمجھتا ہے اول فقر وفاقہ، دوم بیماری اور سوم موت۔

۱۰۔ جس کو خدا دوست رکھتا ہے اس پہ بلا نازل ہوتی ہے۔

۱۱۔ عارف کے لئے تین ارکان ضروری ہیں: ہیبت، تعظیم اور حیا۔ گناہوں سے شرمندہ ہونا ہیبت ہے۔ اطاعت کرنا تعظیم ہے اور خدا کے سوا کسی پر نظر نہ ڈالنا حیا ہے۔

کچھ ارشادات متعلق معرفت

۱۔ سب سے پہلی چیز جو انسان پر فرض ہوئی وہ معرفت ہے۔ جیسا کہ اِلَّا

لِيَعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾ (ذاریات) سے ظاہر ہے۔

۲۔توبہ کے چند مقام ہیں: جاہلوں سے دور رہنا، باطل کو ترک کرنا، منکروں سے روگردانی کرنا، محبوب سے محبت رکھنا، خیرات کرنا، توبہ کو درست کرنا اور مظالم کو رد کرنا۔

۳۔جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ دشمنی رکھتا ہے ان سے دشمنی رکھنا ضروری ہے۔یعنی دنیا ونفس سے بغیر اس کے اللہ کی دوستی حاصل نہیں ہوتی۔

۴۔اہل معرفت کی عبادت پاس انفاس ہے۔

۵۔خواجگان چشت میں بعض نے پندرہ درجے سلوک کے مقرر کئے ہیں ان میں سے پانچواں کشف وکرامات کا ہے۔لیکن جب تک کل پندرہ درجے کامل طے نہ ہوں۔اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنا چاہیے۔

۶۔جب تک عارف کو سر خالص نصیب نہیں ہوتا، اس کا کوئی فعل خالص نہیں ہوتا۔

۷۔عارف کا کمتر درجہ یہ ہے کہ صفات حق اس میں پائی جائیں۔

۸۔اہل سلوک میں محبت ایک ایسا علم ہے کہ لاکھوں علماء اس کو سمجھنا چاہتے ہیں۔مگر ذرہ برابر بھی ان کو خبر نہیں ہوتی۔

۹۔عارف کے لئے یہ ایک ادنیٰ بات ہے کہ ملک ومال سے بیزار ہو جائے۔

۱۰۔اہل عرفان یاد خدا کے سوا اور کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے۔

۱۱۔عارفوں کی خصلت محبت میں اخلاص ہے۔

۱۲۔متوکل وہ ہے جو خلقت سے آزار ورنج پہنچ جانے پر شکایت وحکایت نہ کرے۔

۱۳۔یقین وہ نور ہے جس سے بندہ منور ہو جاتا ہے۔

۱۴۔عاشق کا دل آتش کدۂ محبت ہے اس میں جو آئے اسے جلا کر خاک کر دیتا ہے۔ کیونکہ عشق کی آگ سب آگوں سے تیز ہے۔

مختلف ارشادات متعلق حقیقت

۱۔دوست کے اسرار حسین ہوتے ہیں۔اس لئے عاشق کے دل میں قیام کرتے ہیں۔

۲۔حق کی دوستی کی خاطر دونوں جہان لٹا دینا آسان ہے۔

۳۔دل وہ ہے جو اپنے حال سے خالی ہو اور مشاہدۂ حق میں باقی ہو۔

۴۔عارف وہ ہے جس کو رات کی بات یاد نہ ہو۔

۵۔عارف اس وقت تک روتا ہے جب تک کہ راہ میں ہوتا ہے۔ جب حقائق کے قریب پہنچتا ہے اور وصال ہو جاتا ہے تو گریہ نہیں کرتا۔

۶۔عشق و محبت میں گفتگو، حرکت اور مشغلہ اس وقت تک ہوتا ہے جب تک کہ باہر رہیں۔ جب اندر داخلہ ہوتا ہے تو خاموشی سکوت اور آرام میسر ہو جاتا ہے اور فریاد و شور نہیں رہتا۔

۷۔جس کو اللہ تعالیٰ اپنی رضا مرحمت فرمادے وہ بہشت کو کیا سمجھے۔

۸۔علم دریائے محیط ہے اور معرفت دریا کی لہر ہے۔علم خدا کو ہے اور معرفت بندے کو۔لہٰذا بندہ خدا نہیں بن سکتا۔

باب ۲۰

خلفاء

نام نیکو رفتگان ضائع مکن

ابقائے فیض و اجراء سلسلہ کے لئے اتباع و مریدین سے جن میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ حضرات مشائخ اپنا خلیفہ مقرر کیا کرتے ہیں۔ کبھی اپنی حیات میں اور کبھی بقید اپنی وفات کے۔ حضرت والا نے بہت لوگوں کو اپنی حیات میں خلافت عطا فرمائی ہے اور ان کے فرائض کی ادائیگی کی خود نگرانی کی ہے۔ ان کے خلفاء کی تعداد صحیح طور پر نہیں معلوم۔ بے شمار خلفاء میں تیرہ چودہ کو خصوصیت حاصل ہے۔

خواجہ قطب الدین، بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ سر آمد خلفاء ہیں۔ ان جملہ حضرات سے مختلف سمت و نواح میں بھیج کر تبلیغ و اشاعت کا کام لیا گیا۔ ان صاحبان کا طریقہ تبلیغ تحریر و تقریر پر منحصر نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے صحبت و تربیت کے ذریعہ روشنی پھیلائی اور ہندوستان کو عجیب خاموشی سے مسخر و منور کیا۔ مندرجہ ذیل فہرست میں سے انیس خلفاء پر نشان لگا دیے گئے ہیں جن کے متعلق قیاس ہے کہ حضرت والا کے چہل تن میں سے تھے:

۱۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ
۲۔ حضرت صوفی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ ناگور
۳۔ حضرت امام الدین دمشقی (دہلی)
۴۔ حضرت نیاز اللہ خراسانی (اجمیر)
۵۔ حضرت احمد شہاب کوفی (اجمیر)
۶۔ حضرت خواجہ محی الدین (اجمیر)

۷۔ حضرت ودودالدین شیخ سلیم ساکن طائف (اجمیر)
۸۔ حضرت شیخ نعیم احمد عرف احمد کابلی (بنارس)
۹۔ حضرت ہادی ترک ۵۸۸ (اجمیر)
۱۰۔ حضرت سلطان شاہ (اجمیر)
۱۱۔ حضرت احمد خاں درانی (اجمیر)
۱۲۔ حضرت قادر سعید (بنارس)
۱۳۔ حضرت قربان احمد ۵۸۴ (دہلی)
۱۴۔ حضرت احمد فہر (دہلی)
۱۵۔ حضرت اظہر خاں ترک (دہلی)
۱۶۔ حضرت سبحان علی خاں چغتی (اجمیر)
۱۷۔ حضرت فقیر محمد جرودی ۶۱۰ (قنوج)
۱۸۔ حضرت امیر برہان جی سدا سہاگ (اجمیر)
۱۹۔ حضرت احمد خاں غلزئی ۵۸۰ (قنوج)
۲۰۔ حضرت ہادی محمد غیرت (اجمیر)
۲۱۔ حضرت کیوان اصغر قندھاری (دہلی)
۲۲۔ حضرت نظام الدین خان ترک (دہلی)
۲۳۔ حضرت سونی بہادر شاہ (اجمیر)
۲۴۔ حضرت مرد غار خان ترک (اجمیر)
۲۵۔ حضرت مراد بیگ مغل (اجمیر)
۲۶۔ حضرت محمد اکبر بہاری (دہلی)
۲۷۔ حضرت شعبان خاں ترک (اجمیر یا دہلی)
۲۸۔ حضرت نعمت احمد صفا (اجمیر)

۲۹۔ حضرت زاہد اکبر شاہ (اجمیر)

۳۰۔ حضرت غریب اصغر (اجمیر)

۳۱۔ حضرت شہاب ولی (اجمیر)

۳۲۔ حضرت سرور احمد (اجمیر)

۳۳۔ حضرت ظہیر الدین (اجمیر)

۳۴۔ حضرت سفیان احمد (دہلی)

۳۵۔ حضرت معروف شاہ قریشی (اجمیر)

۳۶۔ حضرت عبداللہ اصغر (دہلی)

۳۷۔ حضرت عبدالغفار ۶۹۴ (اجمیر)

۳۸۔ حضرت عزیز احمد شاہ (دہلی)

۳۹۔ حضرت موشیوخ عراقی (دہلی)

۴۰۔ حضرت کریم شعیب بن محمود شاہ ایرانی (دہلی)

۴۱۔ حضرت یعقوب خاں (ملتان یا دہلی)

۴۲۔ حضرت حسن دوؤدجی (اجمیر)

۴۳۔ حضرت کریم احمد شاہ (دہلی)

۴۴۔ حضرت ابوالفرح قریشی ۶۱۷ (دہلی)

۴۵۔ حضرت خواجہ احمد شاہ (دہلی)

۴۶۔ حضرت شیخ وجیہ الدین (ملتان)

۴۷۔ حضرت خواجہ برہان الدین بدو (اجمیر)

۴۸۔ حضرت شیخ احمد (اجمیر)

۴۹۔ حضرت محمد حسن (×)

۵۰۔ حضرت خواجہ سلیمان کرشکی (×)

۵۱۔ حضرت شیخ صدر الدین کرمانی (x)

۵۲۔ حضرت شمس الدین نو قانی (احمد آباد گجرات)

۵۳۔ حضرت خواجہ حسن خیاط ۲۰۳ (x)

۵۴۔ حضرت عبداللہ بیابانی جوگی ہے پال (اجمیر)

۵۵۔ حضرت خواجہ شیخ محمد زاہد ترک (دہلی)

۵۶۔ حضرت خواجہ محمد علی سنجری (x)

۵۷۔ حضرت خواجہ محمد یادگار خرم (غزنی)

۵۸۔ حضرت خواجہ سبز یادگاری (قندہار)

۵۹۔ حضرت شاہ عبداللہ کرمانی (x)

۶۰۔ حضرت فتح محمد ختار (اجمیر)

۶۱۔ حضرت شیخ وجیہ الدین خراسانی (ہرات)

۶۲۔ حضرت ابو مسعود غازی (x)

۶۳۔ حضرت خواجہ فخر الدین (پسر اکبر)

۶۴۔ حضرت بی بی حافظہ جمال (دختر)

۶۵۔ سید معین الدین۔ بیانہ (بھرتپور)

باب ۲۱

اجمیر اور عمارت درگاہ

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است

اجمیر ایک تاریخی شہر ہے۔سمت ۲۰۲ بکرمی میں راجہ جے پال نے اس کی بنا ڈالی تھی اور موجودہ آبادی کے گوشہ جنوب و مغرب میں پہاڑوں کے درمیان آباد کیا تھا۔ ہندی زبان میں پہاڑ کو "میر" کہتے ہیں۔لہٰذا بانی کے نام پر اس کا نام "اجمیر" ہوا۔راجہ بیسل دیو کے عہد میں راجپوتوں کی سلطنت دہلی کا الحاق اجمیر سے ہوا تھا۔اس راجہ کا بنایا ہوا تالاب "بیسلہ" ابھی تک موجود ہے۔فتح ملتان کے بعد ۱۰۲۴ء میں محمود غزنوی نے اجمیر فتح کیا۔ اور راجہ بیسل کو گرفتار کیا۔روایت ہے کہ جب راجہ بیسل دیو مسلمان ہو گیا تو حکومت اس کو واپس دے دی گئی۔ راجہ کے تارک الدنیا ہونے کے بعد محمود غزنوی نے یہاں کا عامل سالار ساہو کو مقرر کیا تھا عرصہ کے بعد راجپوتوں نے سالار ساہو کو شہید کر کے سارنگ دیو کو تخت نشین کیا۔اس کے بعد عنان حکومت راجہ بیسل دیو کے چھوٹے بھائی انا دیو کو دے دی گئی اور اس کی یادگار "اناساگر" ہے۔انا دیو کے بعد پرتھوی راج کو حکومت ملی۔اور اس نے قلعہ تاراگڑھ کی تعمیر تکمیل کو پہنچائی۔ پرتھوی راج کو قید اور قتل کرنے کے بعد ۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء میں شہاب الدین غوری نے اجمیر فتح کیا اور اپنے صوبیدار سید حسن خنگ سوار کو وہاں مقرر کیا۔اس کے بعد چوہان راجپوتوں نے بغاوت کی۔مگر پھر غوریوں کا قبضہ ہو گیا۔

شمس الدین التمش کے عہد میں جب کہ ۱۲۲۸ء میں اجمیر فتح کیا گیا۔احمد اور علاء الدین خلجی کے عہد میں شاہین بیگ یہاں کے قلعدار تھے۔تقریبان دوسو پچاس تک اجمیر دہلی کا صوبہ رہا۔پھر ۷۱۰ھ کے بعد میواڑ کے سیسودیا خاندان کا قبضہ ہو گیا۔میواڑ والوں کی حکومت ۵۵ سال رہی۔ پھر سلطان مانڈو محمود خلجی نے ۱۲۵۵ء میں اجمیر کی تسخیر کی۔خواجہ

نعمت اللہ خان المقلب بہ سیف خاں قلعدار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد صوبہ اجمیر ولی عہد کی جاگیر میں دے دیا گیا اور ولی عہد کی طرف سے ملوکی خان حاکم اجمیر ہوئے۔ اسی زمانہ میں تاراگڑھ سے کل آبادی منتقل ہو کر اس جگہ آ گئی جہاں اب ہے۔ خلجیوں کے بعد راجگان میواڑ نے پھر تسلط جمالیا اور اٹھائیس برس حکومت کی۔ شہنشاہ اکبر نے میواڑ والوں سے ۱۵۵۶ء میں فتح کیا اور اجمیر کو اپنا صوبہ بنایا۔ پھر فصیل اور بازار بنوا کر از سر نو اس کی تشکیل کی۔ اس وقت شہر کے چار دروازے تھے۔ دہلی دروازہ، مدار دروازہ، ڈگی دروازہ اور ترپولیہ دروازہ۔ اکبر نے اوسری دروازہ کا مزید اضافہ کیا۔ شہر پناہ کے وسط میں مختصر سا قلعہ بنایا جو میگزین کے نام سے مشہور ہے۔ درگاہ میں اکبری مسجد بنوائی۔ شہنشاہ جہانگیر کو اجمیر سے عشق تھا۔ اور یہاں کی سکونت کو پسند کرتا تھا۔ تاراگڑھ کے دامن میں دلفریب آبشار ہیں۔ ان کو چشمۂ جہانگیری کہتے ہیں۔ اس جگہ جہانگیر نے سیرگاہ اور محل بنوائے تھے۔ شاہ جہان نے اناساگر پر سنگ مرمر کا عالی شان محل تیار کروایا۔ درگاہ میں مرمر کی مسجد بنوائی۔ غرض تاجدار دہلی محمد شاہ کے بعد جودھپور کے راٹھور راجہ نے ۱۷۴۳ء میں اجمیر کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ پھر اس سے مہاراجہ سند نے چھین لیا۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک راٹھور اور مرہٹہ دونوں کی دوعملی رہی۔ راٹھور کو شکست دینے کے بعد مہاراجہ سندھیا نے ۱۷۸۷ء تک اپنے قبضہ میں رکھا۔ راٹھور نے پھر قبضہ کر لیا۔ اور چار سال کے بعد ۱۸۹۱ء میں مرہٹوں نے پھر تسلط حاصل کر لیا۔ انگریز کے ہاتھ ۱۸۱۸ء میں اجمیر کی حکومت آئی اور اب ۱۹۴۷ء سے کانگریس سرکار کے تحت ہے۔

شہر کے جنوب و مغرب میں جھالرہ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ ہے۔ اس کے مشرق میں لنگر خانہ والی گلی ہے۔ جانب غرب محلہ اندر کوٹ ہے اور وہ سڑک ہے جو ترپولیہ دروازے سے تاراگڑھ جاتی ہے۔ شمال میں درگاہ بازار ہے اور جنوب میں جھالرہ واقع ہے۔ درگاہ شریف کے اکیس دروازے ہیں جو شہر کی جانب کھلتے ہیں۔ خانقاہ، سولہ کھمبا، چار یار اور لنگر خانہ کے علاوہ درگاہ تین حصوں پر منقسم ہے۔

احاطۂ اول

ا۔ نظام گیٹ: یعنی صدر دروازہ جو درگاہ بازار کی طرف ہے۔ ۱۵۔ ۱۹۱۲ء میں ہز ہانس میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد نے بنوایا تھا۔ اس دروازے پر نقار خانہ عثمانی ہے۔ یہاں سے داخل ہونے پر سیدھے ہاتھ کی طرف شفاخانہ ہے۔ صحن دروازہ شاہ جہانی دروازے تک ہے اور اس صحن کے ہر سمت میں حجرے ہیں۔ الٹی جانب ایڈمنسٹریٹر صاحب کا دفتر ہے۔

۲۔ کلمہ دروازہ یا شاہجہانی دروازہ: ۱۰۴۷ء میں شاہ جہان بادشاہ نے بنوایا تھا۔ بہ خط جلی سنہرے حروف میں محراب پر کلمہ شریف تحریر ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام کلمہ دروازہ بھی ہے۔ بعد فتح بنگال ۹۸۳ھ میں اکبر نے دو نقارے نذر کئے تھے وہ اس کی چھت پر رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بڑا والا اکبر نے فتح چتوڑ کے بعد رکھوایا۔

۳۔ اکبری مسجد: اس کی تعمیر اکبر نے جہانگیر کی پیدائش کے چھ ماہ بعد کروائی تھی۔ ۹۶۸ھ میں صحن کا حوض بند کر دیا گیا تھا۔ نواب غفور علی خاں صاحب رئیس دانپور ضلع علی گڑھ نے ۱۹۰۱ء میں مسجد کی مرمت کروائی تھی۔ اس کی سیڑھیوں کے قریب یونانی شفاخانہ ہے۔

احاطۂ دوم

ا۔ چتوڑ کے بعد اکبر نے پیادہ پا سفر کر کے سوا سو من چاول کی بڑی دیگ نذر کی تھی۔ اس کا محیط ایک انچ سوا بارہ گز کا ہے۔ چھوٹی دیگ جہانگیر نے آگرہ میں بنوا کر ۱۰۲۲ھ میں نذر کی تھی۔ اس میں اسی من کھانا پکتا اور محیط ساڑھے سات گز کا ہے۔ ملا مداری مدار المہام ریاست گوالیار نے ۱۲۶۶ھ میں دونوں دیگوں کی مرمت کروائی تھی۔ پھر وزیر حیدر آباد نے ۱۳۰۷ھ میں بڑی دیگ کی مرمت کروائی اور نواب دلدوز نواز جنگ نے ۱۸۹۶ء میں چھوٹی دیگ کو از سر نو بنوایا۔

۲۔ صحن چراغ: اس میں ہشت پہل چراغدانوں کی چھتری بنی ہوئی ہے اور چراغ اکبر

نے نذر کئے تھے۔ اس صحن میں تہ خانہ ہے جس سے زمین دوز راستہ حضرت والا کے مزار تک جاتا ہے۔

۳۔ محفل خانہ: پہلے یہاں دل بادل شامیانہ ایستادہ کیا جاتا تھا اور ایام عرس میں ان کے اندر مجلس سماع ہوتی تھی۔ ۱۸۹۱ء میں سر آسمان جاہ نے مجلس خانہ تعمیر کروادیا۔ اس میں دار العلوم عثمانیہ تھا۔ مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد یہ مدرسہ ختم ہو گیا اور اب یہاں ابتدائی تعلیم حکومت کے نصاب کے مطابق دی جاتی ہے۔

۴۔ حوض دھمال خانہ بادشاہی: مجلس خانے کے سامنے جنوب کی طرف جو حوض ہے اس کو دھمال خانہ کہتے تھے۔ اس لئے کہ پہلے مداریہ درویش اس جگہ وجد و رقص کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں انگلینڈ کی ملکہ میری نے کچھ چندہ دے کر اس کی چھتری بنوائی تھی۔ اس کے قریب ایک سبیل بھی ہے۔ یہاں سے دو دروازے احاطہ سوم کی طرف ہیں۔

۵۔ لنگر خانہ: مجلس خانہ کے سامنے صحن کے بعد مشرق میں لنگر خانہ ہے۔ دالان میں لوہے کا کڑھاؤ ہے جس کو اکبر بادشاہ نے بنوایا تھا۔ یہاں جو دلیہ روزانہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ صحن لنگر خانہ میں چھتری بنی ہوئی تھی۔ اکبر بادشاہ نے اس مقام پر کھڑے ہو کر ایک فقیر کی حیثیت سے لنگر مانگا تھا اور اس کا پیالہ ٹوٹ گیا تھا۔ اب اس چھتری کی جگہ حجرہ بنوادیا گیا ہے۔

۶۔ بجلی گھر: لنگر خانہ کے صحن میں شرق رویہ دالان ہے۔ جہاں محرم میں تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ اس دالان کے شمال میں بجلی گھر بنا دیا گیا ہے۔ جس سے درگاہ میں روشنی کی جاتی ہے۔

احاطۂ سوم

احاطہ دوم سے احاطہ سوم میں داخل ہونے کے لئے دو دروازے ہیں۔ جو حوض دھمال خانہ کے مغرب و مشرق میں ہیں۔ ان دونوں دورازوں کے وسط میں صندلی مسجد شروع ہوتی ہے۔ جس کی جنوبی حد روضہ مبارک کی شمالی دیوار ہے۔ اس صندلی مسجد کی وجہ سے احاطہ سوم دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ حوض دھمال خانہ کے مغربی دروازے سے داخل ہونے کے بعد سیدھی جانب سولہ کھمبے کا راستہ ہے اور الٹی جانب ایک مختصر سا خشتی احاطہ ہے جس پر

چنبیلی پھیلی ہوئی ہے۔ اس احاطہ چنبیلی میں چند مزار ہیں۔ یہ مزار حضرت والا کی ازواج کے بتائے جاتے ہیں۔ مگر بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت رفیع الدین خوردان کی والدہ صاحبہ اور ان کی اہلیہ یہاں مدفون ہیں۔ واللہ اعلم۔ زائرین اس چنبیلی میں بہشتیوں سے پانی ڈلوایا کرتے ہیں۔

۲۔ شاہجہانی مسجد: ۱۰۴۷ھ میں اپنی تخت نشینی کے موقع پر شاہجہان نے یہ مسجد بنوائی تھی۔ اس مسجد میں نماز جمعہ ہوتی ہے تو چار توپیں داغی جاتی ہیں۔ مسجد کے صحن میں وسیع حوض ہے۔ سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اب بنیادیں اس کی کمزور ہوگئی ہیں۔

۳۔ چلہء بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ: صندلی مسجد کی پشت پر اس چلہ کا زینہ ہے اس سے حضرت والا کے خام مزار کو راستہ جاتا ہے۔ اندر مزار کا دروازہ تیغہ کر دیا گیا ہے اور اسی دروازے پر حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے چلہ کیا تھا۔ زینہ کا دروازہ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے دن ۵ محرم کی شام کو ہر سال کھولا جاتا ہے۔

۴۔ جھالرہ: درگاہ کے جنوب میں نیچے کی جانب ایک جھیل سی ہے جس میں نیچے کو جانے کے لئے زینہ بنا ہوا ہے۔ اس کا پانی شیریں ہے۔ جس کو تبرک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی چار دیواری شاہجہان نے بنوائی تھی۔

۵۔ شاہی گھاٹ: کرناٹکی دالان کے مغرب میں ایک چبوترہ ہے اور چبوترے کے جنوب میں جھالرہ ہے۔ اس چبوترے کو شاہی گھاٹ کہتے ہیں۔ یہاں دو چھتریاں بنی ہیں۔ ایک میں خواجہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ حضرت والا کے پسر خورد آسودہ ہیں۔

۶۔ کرناٹکی دالان: ۱۷۹۳ء میں روضہ کے جنوب میں نواب والا جاہ نے سنگ مرمر کا سہ درہ بنوایا تھا۔ اس میں قوالی بھی ہوتی ہے۔

۷۔ دالان حاجی وزیر علی: کرناٹکی دالان اور سبیل کے قریب یہ دالان ۵۶۔۱۲۵۵ھ میں حاجی وزیر علی صاحب خادم درگاہ نے بنوایا تھا۔

۸۔ مقبرہ شاہ قلی خاں: جھالرہ کے مشرق میں ایک سہ درہ ہے۔ اس میں تعزیہ رکھا جاتا

ہے۔ عہد اکبری میں شاہ قلی خاں اجمیر کے صوبیدار تھے۔ انہوں نے اپنے لئے مقبرہ بنوایا تھا مگر انہیں خود دفن ہونا نصیب نہیں ہوا۔

۹۔ سبیل خواجہ: حاجی وزیر علی صاحب نے ۱۹۴۱ء میں بنوائی تھی۔ سبیل کے قریب مہاراجہ سندھیا کے چند حکام اجمیر کے مزار ہیں۔

۱۰۔ چھتری دروازہ: یہ دروازہ سبیل کے جنوب میں واقع ہے۔

۱۱۔ کھڑکی دروازہ: جانب مشرق ہے۔ ہر دو جانب حجرے ہیں۔

۱۲۔ بیگمی دالان: گنبد شریف کے مشرقی دروازے کے سامنے یہ خوبصورت دالان شاہزادی جہاں آرا بنت شاہجہان نے ۱۶۴۳ء میں بنوایا تھا۔ اس کے آگے شامیانہ بھی لگایا جاتا ہے۔

۱۳۔ توشہ خانہ: گنبد شریف کے مشرقی دروازے کی دونوں دیواروں کی طرف دو حجرے ہیں اور ان میں روضہ شریف کا جملہ سامان رکھا جاتا ہے۔ شاہجہانی فرمان اسی جگہ محفوظ ہے۔ کنجیاں خدام کے پاس رہتی ہیں جو ہر وقت گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔ ان حجروں میں خواجہ فخر الدین گردیزی اور ان کی اہلیہ کے مزار ہیں۔ اس مشرقی دروازے میں اکبر نے چتوڑ سے لا کر جوڑی چڑھائی تھی۔ دروازے کی شمالی دیوار میں زرد رنگ کا عقیق یمنی جڑا ہوا ہے۔

۱۴۔ روضہ مبارک: پہلے مزار اقدس خام تھا۔ خواجہ حسین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں سلطان مانڈو غیاث الدین نے گنبد اور عمارت کی تعمیر کی۔ اس مرمریں سفید گنبد پر محمد عالم نامی بنجارے نے سوا من سونے کا کلس چڑھایا تھا۔ سونے کا موجودہ تاج نواب حیدر علی خان رامپوری رئیس بلسی ضلع بدایوں نے نذر کیا تھا۔ روضہ کی اندرونی دیواروں پر سنہرا اور لاجوردی کام نواب مشتاق علی خان والئی رامپور نے بنوایا تھا۔ چھت میں زردوزی کا کاشانی مخمل کا شامیانہ لگا ہوا ہے۔ جس کو نواب کلب علی خاں والئی رامپور نے پیش کیا تھا۔ میانے میں سونے چاندی کے گولے آویزاں ہیں۔ مزار کے تعویذ پر صندل کی مسہری تھی۔

کلکتہ کے تاجر سیٹھ حاجی محمد نے اسپر نقرئی پتر چڑھوائی ہے۔اس مسہری یا چھپر کھٹ کی جگہ کے نیچے بیچ میں سنہرا کٹہرا جہانگیر نے پہلے بنوایا تھا وہ اب موجود نہیں ہے۔اس کے بجائے اب نقرئی مجر لگا ہوا ہے۔اس کی مرمت راجہ جے سنگھ والئی جے پور نے کروائی تھی۔دونوں مجر شاہزادی جہاں آرا کے پیش کردہ ہیں۔روضہ مبارک اور بیگمی دالان کے درمیان والا مشرقی دروازہ گلشن دروازہ کہلاتا ہے۔یہ صندل کا بنا ہوا ہے جس کو فتح چتوڑ کے بعد اکبر نے نذر کیا تھا۔اس کے موجودہ کواڑ نواب فیض اللہ خاں بنگش رئیس فرخ آباد نے بنوائے تھے۔ مزار شریف کی غربی دیوار میں محراب کے اندر نقرئی صندوق میں قرآن پاک رکھا ہوا ہے۔

۱۵۔احاطہ نو: روضہ کے جنوب و مغرب میں خوشنما جالیوں کا مرمریں احاطہ ہے۔اسے احاطہ نور کہتے ہیں۔یہاں رحمت برستی ہے۔یہیں سے حضرت والا کی تعلیم و تبلیغ کا راز اہل نظر پر کھلتا ہے۔اس احاطہ کے جنوبی دروازہ کو پائینتی دروازہ کہتے ہیں۔مغرب میں جو دروازہ جامع مسجد شاہجہانی کے سامنے کی طرف چاندی کے پتر سے منڈھا ہوا ہے۔وہ جنتی دروازہ کہلاتا ہے۔اسے مکی دروازہ بھی کہتے ہیں۔حضرت والا اور خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ کے عرسوں کے موقع پر اور دیگر مواقع پر یہ جنتی دروازہ کھولا جاتا ہے۔ورنہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔روضہ مبارک کی مغربی دیوار میں اور اس جنتی دروازے کے درمیان نیم مسقف صحن سا ہے۔اس میں قرآن پاک اور سیپارے رکھے ہوئے ہیں۔جن کی صبح و شام اور شب و روز تلاوت ہوتی ہے، مستقل ہوتی ہے اور بے مثال ہوتی ہے۔

۱۶۔مجر بی بی حافظہ جمال، روضہ کی جنوبی دیوار کے ملحق حجرے میں حضرت والا کی صاحبزادی کا مزار ہے۔حجرے کے قریب دو چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں۔وہ بی بی صاحبہ کے صغیر سن صاحبزادوں کی ہیں۔

۱۷۔مجر حور النساء: روضہ کے مغرب کی طرف والا مجر شاہزادی حور النساء بنت شاہجہان کا ہے۔اس کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔

۱۸۔مستورات کے عبادت خانے: روضہ کے بائیں دروازے کے دونوں طرف دو

چھوٹے چھوٹے احاطے ہیں اور یہ دونوں پردہ نشین مستورات کی عبادت وتلاوت کے لئے مخصوص ہیں۔

۱۹۔ مسجد صندل خانہ: سلطان محمود خلجی والئی مانڈو نے روضہ کے شمال کی طرف یہ مسجد تعمیر کروائی تھی۔ جہانگیر نے اضافہ کر کے موجودہ شکل دے دی۔ اور اورنگزیب نے اس کی مرمت کروائی تھی۔ اس میں صندل گھسا جاتا ہے۔ اس لئے صندلی کہلاتی ہے۔

۲۰۔ چار یاری۔ شہاہ جہانی مسجد کی جنوبی دیوار کی طرف جو حوض کے قریب ہے ایک راستہ احاطہ چار یاری کو جاتا ہے۔ یہ ایک وسیع قبرستان ہے۔ جس میں مختلف بزرگوں کے مزار ہیں۔ اس کا نام چار یاری اس لئے ہوا کہ یہاں ان چار اصحاب کے مزار ہیں جو چہل تن میں حضرت والا کے ہمراہ آئے تھے۔ کاش ان چار اصحاب کے نام معلوم ہو جاتے۔

۲۱۔ خانقاہ: یہ عمارت محفل خانہ کے مغرب میں ہے۔ اس جگہ بعد رحلت حضرت والا کو غسل دیا گیا تھا اور یہاں حضرت والا کے اہل خانہ کی بود و باش تھی۔ اکبری مسجد کے ساتھ اکبر نے اس خانقاہ کی تعمیر کروائی تھی۔ رجب کی پانچ تاریخ کو سہ پہر کے وقت بموجودگی دیوان صاحب یہاں بھی سالانہ محفل سماع ہوتی ہے۔ غالباً اس وقت بعد غسل حضرت والا کی تدفین ہوئی تھی۔

۲۲۔ سولہ کھمبہ: شاہجہانی مسجد سے شمالی دیوار کی طرف حضرت احمد بختیار کے مزار سے گزرنے کے بعد ایک بڑا قبرستان ہے۔ یہی سولہ کھمبہ کہلاتا ہے۔ یہاں ہمیشہ فقراء قیام کرتے ہیں۔

۲۳۔ اولیاء مسجد: صندلی مسجد کے سامنے احاطہ دوم سے آنے والے راستہ کے مشرق میں مختصر سی ایک مسجد کی حد بندی سنگ مرمر سے بنی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں جانب حجرے ہیں۔ حضرت والا سب سے پہلے جب یہاں آئے تھے تو یہیں نماز ادا کیا کرتے تھے یہی اولیاء مسجد ہے۔

درگاہ کے باہر کی عمارت

ا۔اڑھائی دن کا جھونپڑا: یہ پہلے راجہ اندر سین کا بت خانہ تھا۔شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر فتح کرنے کے بعد ڈھائی دن میں اس کو مسجد میں منتقل کروادیا اور محراب قائم کر کے جمعہ کی پہلی نماز یہاں ادا کی۔التمش نے ازسرنو اس کی تعمیر کروائی۔یہ فن سنگتراشی کا بہترین نمونہ ہے۔

۲۔چلہ پیران پیر: درگاہ شریف کے جنوب میں پہاڑ پر سعید سونڈا صاحب کا مزار ہے۔ ان کی لائی ہوئی حضور غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی ایک اینٹ ان کے ساتھ دفن کی گئی ہے۔اس اینٹ کی رعایت سے اس کا نام پیران پیر کا چلہ پڑ گیا۔ورنہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ یہاں کبھی نہیں آئے تھے۔صحیح پتہ نہ چل سکا کہ سونڈا صاحب کون تھے اور کب اجمیر شریف آئے تھے۔اس جگہ مسجد دالان او ادلی بنے ہوئے ہیں۔اور یہ سب بعد کی تعمیرات ہیں۔

۳۔تاراگڑھ: پہلے یہاں کوئی عمارت نہیں تھی۔اکبر کے عہد میں خواجہ سرا امتیاز خان نے حضرت سید حسن خنگ سوار کے مزار کے ساتھ سنگ مرمر کی عمارت بنوائی۔۱۲۱۹ھ میں مہاراجہ سندھیا نے سنگ مرمر کا سات درہ دالان تعمیر کرادیا۔۱۲۲۳ھ میں شمال رویہ دالان راؤ امنگلہ نے بنوایا۔مشرقی دروازے کے نیچے حضرت خنگ سوار کے گھوڑے کی قبر ہے۔ مغربی حصہ میں قدیمی مسجد ہے اور جنوب میں گنج شہیداں ہے۔اس پہاڑی سے کچھ نیچے چشمہ نور پر بی بی حافظہ جمال کا چلہ ہے اور اس کے جنوب میں پہاڑی پر طاقاطوقا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ ہے۔

۴۔چلہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ: اناساگر کے مشرق میں سدابہار پہاڑ پر یہ چلہ ہے۔ پہاڑ کے اندر ایک گنبد ہے اور اس کے اندر ایک تخت ہے جس پر بیٹھ کر حضرت والا عبادت کیا کرتے تھے۔

۵۔چلہ حضرت سالار غازی: سدابہار پہاڑی کی چوٹی پر زسنگ سرخ کے گنبد کے اندر

ایک مزار ہے اور اس کے سرہانے سنگ مرمر کی ایک چوکی ہے۔

۶۔ چلہ شادی دیو: اسی سدا بہار پہاڑی کی چوٹی پر گنبد کے اندر کنگن کی شکل کا تراشا ہوا پتھر رکھا ہے۔ اس کے مغرب میں سنگین دالان ہے اور قریب میں ایک حوض ہے۔

۷۔ چلہ شاہ مدار: اجمیر کے مشرق میں بلند چوٹی پر حضرت شاہ مدار مکن پوری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کے زمانہ میں یہاں آ کر چلہ کیا تھا۔ گنبد و چھتری قابل دید ہے۔

۸۔ چلہ خواجہ قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ: سدا بہار پہاڑی کے شمالی گوشہ میں واقع ہے۔ یہاں صحن میں ایک سہ دری بنی ہوئی ہے۔

۹۔ تکیۂ ناتوان شاہ: درگاہ کے جنوب و مشرق میں ہے۔

۱۰۔ چلہ عبداللہ بیابانی: اجمیر سے مغرب میں تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اور اس کے کھنڈرات موجود ہیں۔

۱۱۔ انا ساگر: اجمیر کے شمال میں واقع ہے۔ مشرق و جنوبی گھاٹ پر باغات ہیں اور شاہجہان کی بارہ دری ہے۔ یہ تالاب خوب وسیع ہے۔

باب ۲۲

مختلف بزرگوں کا زمانہ

یہ تاریخہائے پیدائش و وصال بعد تحقیق درج کی گئی ہیں۔ مگر پھر بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ درست ہیں۔ لیکن بایں ہمہ حالات اولیاء کے مطالعہ کے وقت مطابقت کرنے اور سلسلہ ملانے میں ان تاریخوں سے قریب قریب اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور اس فہرست کا یہی مدعا ہے۔

	پیدائش	وصال
۱۔ حضرت سید المرسلین محمد ﷺ	۵۷۰ء	۶۳۲ء
۲۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	۵۷۲ء	۶۳۴ء
۳۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ	۵۸۲ء	۶۴۵ء
۴۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ	۵۷۵ء	۶۵۵ء
۵۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ	۵۹۹ء	۶۶۰ء
۶۔ حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ		۶۵۷ء
۷۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ	۶۲۴ء	۶۶۹ء
۸۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ	۶۲۵ء	۶۸۰ء
۹۔ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (1)	۶۴۰ء	۷۳۰ء
۱۰۔ حضرت خواجہ عبدالواحد بن زید		۷۳۸ء

1۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نام رکھا تھا۔ حضرت ام سلمٰی کی آغوش میں تربیت پائی۔ ستر برس گوشہ نشین رہے۔ مفتی بصرہ تھے۔ اپنا مال ومتاع خیرات کیا۔ گریہ مسلسل تھا۔

۱۱۔حضرت حبیب عجمی		۷۳۷ء
۱۲۔حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ (1)	۶۹۹ء	۷۷۷ء
۱۳۔حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ	۷۱۳ء	۷۸۵ء
۱۴۔حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ	۷۶۷ء	۸۲۰ء
۱۵۔حضرت امام احمد حنبل رضی اللہ عنہ	۷۸۰ء	۸۵۵ء
۱۶۔حضرت داؤد طائی		۷۷۶ء
۱۷۔حضرت سفیان ثوری(2)		۷۷۷ء
۱۸۔حضرت ابراہیم ادہم(3)	۶۸۰ء	۷۸۲ء
۱۹۔حضرت رابعہ بصری		۸۰ء
۲۰۔حضرت بشر حافی	۷۶۷ء	۸۴۱ء
۲۱۔حضرت فضیل بن عیاض(4)		۸۰۲ء
۲۲۔خواجہ خدیفہ مرعشی		۶۷۶ء
۲۳۔خواجہ ہبیرہ بصری		۶۸۷ء
۲۴۔خواجہ علو دینوری چشتی(5)		۹۱۰ء

1۔یہ حضرات عہد عباسیہ میں تھے۔حکومت نے ان کو سخت سزائیں دیں۔اہل تشیع نے ان کی بہت مخالفت کی۔ ناصر خسرو اسماعیلی نے ان کے خلاف خوب زہر اگلا ہے۔ابوجعفر نے امام ابوحنیفہ کے کوڑے مارے قید کیا اور زہر دلوایا۔ابوجعفر نے امام مالک کے کوڑے مارے، مشکیں بندھوائیں اور بازو اکھیڑ دیا۔امام احمد حنبل کو معتزلہ نے بہت دق کیا۔بیڑیاں ڈالی گئیں، کوڑے مارے گئے، رخساروں پر طمانچے مارے گئے، منہ پر تھوکا گیا۔امام مالک و امام احمد حنبل، امام شافعی کے شاگرد تھے۔امام شافعی حامی تصوف تھے۔قاہرہ میں وفات ہوئی۔

2۔سفیان ثوری اور عیاض کو قید کیا گیا۔سفیان ثوری کے بچپن میں خلیفہ ہارون الرشید سے مراسم تھے۔خلیفہ کی انہوں نے مخالفت کی۔آٹھویں صدی کے مشہور صوفیہ فریدالدین عطار، شیخ سعدی، مولانا روم اور ابوسعید بن ابوخیر تھے۔

3۔نیشاپور میں خلوت گزیں ہوئے۔ابوحنیفہ اور جنید بغدادی کے ہمعصر تھے۔

4۔فضیل بن عیاض، ابراہیم ادہم، ذوالنون مصری، داؤد طائی اور صیا جس کے استاد امام ابوحنیفہ تھے۔ابوحنیفہ سے علم حاصل کیا اور ہارون کو نصیحت فرمائی۔ہمعصر امام ابوحنیفہ۔

5۔خواجہ ممشاد علو دینوری دوسرے بزرگ تھے۔

۲۵۔خواجہ ابواسحاق شامی چشتی		۹۴۰ء
۲۶۔خواجہ شفیق بلخی		۸۱۷ء
۲۷۔حضرت معروف کرخی		۸۱۲ء
۲۸۔حضرت ذوالنون مصری		۸۳۸ء
۲۹۔حضرت احمد خزرویہ بلخی		۸۵۴ء
۳۰۔خواجہ سری سقطی		۸۶۶ء
۳۱۔خواجہ بایزید بسطامی(1)	۷۴۴ء	۸۷۴ء
۳۲۔خواجہ ابوحفص حداد		۸۷۷ء
۳۳۔جنید بغدادی		۹۰۹ء
۳۴۔منصور حلاج		۹۱۶ء
۳۵۔حضرت شبلی	۸۳۵ء	۹۴۵ء
۳۶۔خواجہ ابواحمد ابدال چشتی	۸۷۳ء	۹۶۵ء
۳۷۔فقیہ ابواللیث		۹۹۳ء
۳۸۔شیخ اسماعیل لاہوری(2)		۴۰۸ء
۳۹۔خواجہ محمد چشتی(3)		۱۰۲۴ء
۴۰۔سید سالار مسعود غازی	۱۰۱۳ء	۱۰۳۲ء
۴۱۔شیخ ابوالحسن خرقانی نقشبندی(4)		۰۳۳ﷲ
۴۲۔خواجہ ابویوسف چشتی		۴۵۵ء
۴۳۔عبیداللہ انصاری(5)	۱۰۰۵ء	۱۰۸۸ء
۴۴۔امام غزالی	۱۰۵۸ء	۱۱۱۲ء

1۔شیخ شرف الدین ان کی اولاد سے تھے۔ان کی وجہ سے ان کا مقبرہ خدابندہ نے بنوایا تھا۔

2۔۱۰۰۵ء میں لاہور آئے۔

3۔محمود غزنوی کے ساتھ سومنات آئے۔

4۔ابویزید ہمدانی کے خلیفہ تھے۔

5۔حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔

نام	ولادت	وفات
۴۵۔ حکیم سنائی		۱۱۳۰ء
۴٦۔ شیخ علی ہجویری	۱۰۰۹ء	۱۰۷۲ء
۴۷۔ خواجہ یوسف ہمدانی نقشبندی	۴۱۴ھ	۵۳۴ھ
۴۸۔ خواجہ مودود چشتی(1)	۱۰۳۸ء	۱۱۳۲ء
۴۹۔ خواجہ احمد چشتی	۵۱۷ھ	۵۷۰ھ
۵۰۔ حضور غوث پاک	۱۰۷۷ء	۱۱٦٦ء
۵۱۔ ابوالنجیب سہروردی		۱۱٦۷ء
۵۲۔ نظام الدین گنجوری	۱۱۱۴ء	۱۱۹۵ء
۵۳۔ فخر الدین رازی	۱۱۲۹ء	۱۲۰۹ء
۵۴۔ جمال الدین ہستانی نقشبندی		۱۲۱۵ء
۵۵ ۔ مجد الدین بغدادی		۱۲۱۹ء
۵٦۔ سید حسن خنگ سوار		٦۰۱ھ
۵۷۔ خواجہ شریف زندنی(2)		٦۱۲ھ
۵۸۔ خواجہ عثمان ہرونی		۱۲۲۰ء/٦۱۷ھ
۵۹۔ نجم الدین کبریٰ		۱۲۲۱ء
٦۰۔ فرید الدین عطار(3)	۱۱۱۹ء	۱۲۲۸ء/٦۲٦ھ
٦۱۔ اوحد الدین کرمانی		۱۲۳٦ء/٦۳۴ھ
٦۲۔ حضرت شہاب الدین سہروردی	۱۱۴۴ء/۵۳۹ھ	۱۲۳۴ء/٦۳۲ھ
٦۳۔ خواجہ معین الدین چشتی	۱۱۴۰ء/۵۳۴ھ	۱۲۳۵ء/٦۳۳ھ
٦۴۔ سید احمد صاحب بدایونی(4)		

1۔ شیخ احمد جام سے مراسم دوستی تھے۔ 2۔ عمر ۱۲۰ سال، سلطان سنجر کو ارادت تھی۔

3۔ حضرت مجد الدین کے بھی خلیفہ تھے اور وہ حضرت نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے۔

4۔ خلفائے حضرت خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ۔

۶۵۔ شیخ حسن پیر مکہ بدایونی		
۶۶۔ خواجہ وحید چشتی پیر بودلہ بدایونی		
۶۷۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی		۱۲۳۶ء
۶۸۔ محی الدین ابن عربی	۱۱۶۴ء/۵۶۱ھ	۱۲۴۰/۶۳۸
۶۹۔ شیخ جلال الدین تبریزی		۱۲۲۴ء/۶۲۲
۷۰۔ شمس الدین تبریزی		۱۲۴۶ء/۶۴۴
۷۱۔ سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوری		۱۲۷۳ء/۶۷۲
۷۲۔ مولانا ضیاء الدین بخشی		
۷۳۔ سیف الدین باقرزئی فردوسیہ		۱۲۵۹ء/۶۵۸
۷۴۔ قطب جمال ہانسوی		۱۲۶۰ء
۷۵۔ بابا فرید الدین گنج شکر	۵۶۹ھ	۶۶۱ھ
۷۶۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی	۵۶۶ھ	۶۵۸ھ
۷۷۔ جلال الدین رومی	۱۲۰۷ء/۶۰۴ھ	۱۲۶۷ء/۶۶۹ھ
۷۸۔ محمد صابر چشتی		۱۲۸۸ء/۶۸۷ھ
۷۹۔ فخر الدین عراقی		۱۲۸۷ء/۶۸۶ھ
۸۰۔ سید حسن سلطان العارفین بدایونی(1)		۶۹۰ھ
۸۱۔ بدر الدین شاہ ولایت بدایونی(2)		۶۹۰ھ
۸۲۔ مخدوم علاء الدین علی احمد صابری کلیری	۵۹۲ھ	۱۲۹۱ء/۶۹۰ھ
۸۳۔ شیخ سعید شیرازی	۱۱۷۴/۵۷۰ھ	۱۲۹۱ء/۶۹۰ھ
۸۴۔ مولانا حسن ضوانی	۱۱۸۲/۵۷۷ھ	۱۲۵۲ء/۶۵۰ھ
۸۵۔ شرف الدین بوعلی قلندر	۶۳۰ھ	۷۲۴ھ
۸۶۔ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی	۱۲۳۸ء/۶۲۹ھ	۱۳۳۵ء/۷۲۶ھ

1۔ بدایوں ۶۰۷ھ میں آئے تھے۔

2۔ دونوں سے روحانی مراسم تھے۔

۸۷۔ امیر خسرو	۱۱۵۳ء/۶۵۱ھ	
۸۸۔ چراغ دہلوی	۶۲۱ھ	۷۵۷ھ
۸۹۔ شمس الدین ترک پانی پتی	۵۹۷ھ	۶۹۹ھ
۹۰۔ جلال الدین پانی پتی		۱۳۶۳ء/۷۶۵ھ
۹۱۔ بہاء الدین نقشبندی	۱۳۲۷ء	۱۳۸۸ء
۹۲۔ سید محمد گیسودراز	۱۳۲۰ء/۷۲۰ھ	۱۴۲۴ء/۸۲۸ھ
۹۳۔ شیخ عبدالحق رودلوی		۱۴۳۲ء/۸۳۶ھ
۹۴۔ بدیع الدین شاہ مدار	۱۳۱۶ء/۷۱۶ھ	۱۴۳۶ء/۸۴۰ھ
۹۵۔ خواجہ باقی باللہ		۱۶۰۳ء
۹۶۔ شیخ حسین ناگوری		۱۴۹۵ء/۹۰۱ھ
۹۷۔ محمد غوث گوالیاری		۱۵۶۲ء/۹۷۰ھ
۹۸۔ شیخ سلیم چشتی	۱۴۷۷ء/۸۸۳ھ	۱۵۷۱ء/۹۷۹ھ
۹۹۔ جلال الدین تھانیسری	۱۴۸۸ء/۸۹۴ھ	۱۵۸۱ء/۹۸۹ھ
۱۰۰۔ سید احمد سرہندی	۱۵۶۳ء/۹۷۱ھ	۱۶۲۴ء
۱۰۱۔ میران بھیک صابری	۱۶۳۶ء/۱۰۴۶ھ	۱۱۳۱ء
۱۰۲۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۱۵۵۱ء/۹۵۸ھ	۱۰۵۲ھ
۱۰۳۔ مرزا مظہر جان جاناں	۱۶۹۹ء/۱۱۱۰ھ	۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ
۱۰۴۔ مولانا فخر الدین چشتی نظامی	۱۷۱۴ء/۱۱۲۶ھ	۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ
۱۰۵۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	۱۷۴۶ء/۱۱۵۹ھ	۱۸۲۴ء/۱۲۳۹ھ
۱۰۶۔ قطب عالم شاہ نیاز احمد بریلوی	۱۱۵۵ھ	۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ
۱۰۷۔ شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی	۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ	۱۸۹۵ء
۱۰۸۔ شاہ غوث علی قلندر پانی پتی	۱۸۰۴ء	۱۸۸۰ء
۱۰۹۔ حاجی وارث علی شاہ	۱۲۳۸ھ	۱۳۲۳ھ

۱۱۰۔شاہ مینا لکھنوی

۱۱۱۔بابا فریدی

۱۱۲۔شاہ نظام الدین حسین بریلوی ۱۲۳۲ھ ۱۳۲۲ھ

۱۱۳۔شاہ محی الدین احمد ۱۲۸۰ھ ۱۳۴۳ھ

۱۱۴۔امام اہلسنت مجدد ملت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری بریلوی

۱۸۶۵ء/۱۲۷۲ھ ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ

کتابیات

آب کوثر   شیخ محمد اکرام مطبوعہ لاہور

اخبار الاخیار فی اسرار الابرار   شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی (دہلی ۱۹۱۴ء)

اسپرٹ آف اسلام   امیر علی

اصول السماع   فخر الدین زرادی (دہلی ۱۳۱۱ھ)

افضل الفوائد   امیر خسرو (دہلی ۱۳۰۵ھ)

اقتباس الانوار   شیخ محمد اکرام (لاہور ۱۸۹۵ء)

القول المستحسن فی شرح فخر الحسن   مولوی احسن الزمان (مطبوعہ حیدر آباد دکن)

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام   متعلقہ مقالے

انفاس العارفین   شاہ ولی اللہ دہلوی (دہلی ۱۹۱۷ء)

انوار الرحمٰن لتنویر الجنان   مولوی نور اللہ بچھرایونی (لکھنؤ ۱۸۷۱ء)

انیس العارفین   ملفوظات خواجہ عثمان ہرونی

برکات الاولیاء   امام الدین گلشن آبادی (دہلی ۱۹۰۴ء)

بزم صوفیہ   صباح الدین عبدالرحمٰن (اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء)

بہاء الدین زکریا   مولانا نور احمد خاں (جگو والا ۱۹۵۴ء)

پریچنگ آف اسلام   ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ

تاریخ الاولیاء   امام الدین (دہلی ۱۲۹۱ھ)

تاریخ فرشتہ   محمد قاسم ہندو شاہ (مطبوعہ لکھنؤ)

تاریخ فیروز شاہی   ضیاء الدین برنی (کلکتہ ۱۸۶۲ء)

تاریخ فیروز شاہی   شمس سراج عفیف (مطبوعہ کلکتہ)

تاریخ مشائخ چشت	خلیق احمد نظامی (دہلی ۱۹۵۳ء)
تذکرۃ العابدین امداد العارفین	نذیر احمد دیوبندی (دہلی ۱۳۲۳ھ)
تذکرۃ المعین فی ذکر الکاملین	زین العابدین (مطبوعہ ۱۸۹۰ء)
تذکرۃ الواصلین	رضی الدین بدایونی (بدایوں ۱۹۴۵ء)
ثمرات القدس من شجرات الانس	لال بیگ بخشی
جواہر فریدی	محمد علی اصغر چشتی (مطبوعہ لاہور)
حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ دہلی (مطبوعہ بریلی)
خزینۃ الاصفیاء	مفتی غلام سرور (لکھنؤ ۱۹۱۴ء)
خیر المجالس	حمید قلندر (مطبوعہ دہلی)
دلیل العارفین	خواجہ بختیار کاکی (دہلی ۱۸۹۳ء)
دیوان معین	معین واعظ کاشفی (مطبوعہ لکھنؤ)
راحت القلوب	خواجہ فرید الدین گنج شکر
سرور الصدور	ملفوظات شیخ حمید الدین ناگوری
سیر الاقطاب	شیخ اللہ دیا چشتی (مطبوعہ لکھنؤ)
سیر الاولیاء	محمد مبارک العلوی (دہلی ۱۸۸۴ء)
سیر العارفین	حامد بن فضل اللہ جمالی (دہلی ۱۸۹۳ء)
سفینۃ الاولیاء	شہزادہ دارا شکوہ (مطبوعہ لکھنؤ)
سکینۃ الاولیاء	شہزادہ دارا شکوہ (مطبوعہ لکھنؤ)
طبقات اکبری	خواجہ نظام الدین ہروی (کلکتہ ۱۹۳۱ء)
طبقات ناصری	منہاج سراج (مطبوعہ کلکتہ)
فتوح السلاطین عصامی	مطبوعہ مدارس
فخر الطالبین	نور الدین حسین (دہلی ۱۸۹۷ء)
فوائد السالکین	ملفوظات خواجہ قطب الدین بختیار کاکی

فوائد الفواد — خواجہ میر حسن سنجری (مطبوعہ لکھنؤ)

فیصلہ وحدت الوجود والشہود — شاہ ولی اللہ دہلوی (مطبوعہ لکھنؤ)

کشف المحجوب — شیخ علی ہجویری (مطبوعہ لاہور)

گلزار ابرار — محمد غوثی مانڈوی (مطبوعہ آگرہ)

گنج اسرار — از خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

ماثر الکرام — غلام علی آزاد بلگرامی (آگرہ ۱۹۱۰ء)

معارج الولایۃ — غلام معین الدین

معین العارفین — خادم حسین زبیری

مکتوبات امام ربانی — مجدد الف ثانی (مطبوعہ لکھنؤ)

مناقب المحبوبین — نجم الدین چشتی (لاہور ۱۸۹۴ء)

منتخب التواریخ — ملا عبد القادر بدایونی (مطبوعہ لکھنؤ)

مونس الارواح — جہاں آرا بیگم (مطبوعہ لکھنؤ)

نفحات الانس — ملا عبد الرحمٰن جامی (مطبوعہ لکھنؤ)

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی ٥ پاکستان